الیکساندر سیرافیموچ

طوفان اور ریت

100

ЄП

СЕРАФИМОВИЧ

ПЕСКИ
И ДРУГИЕ
РАССКАЗЫ

الیکساندر سیرافیموچ

طوفان اور ریت

(کہانیاں)

دارالاشاعت ترقی
ماسکو

ترجمہ : حبیب الرحمن

А. Серафимович
ПЕСКИ
Повести и рассказы
На языке урду

© جملہ حقوق بحق 'دارالاشاعت ترقی'
محفوظ ہیں - ۱۹۷۵ء

سوویت یونین میں شائع شدہ

C $\frac{70302\text{-}337}{014(01)\text{-}76}$ 737-75

فہرست

صفحہ

الیکساندر سیرافیمووچ (پیش لفظ)	۷
گالینا	۹
برفانی موت	۱۲۴
انعام	۱۴۰
طوفان	۱۵۶
عوام کی طاقت	۱۷۶
بغاوت	۱۸۴
بازگشت	۲۱۷
ریت	۲۴۴
پوائنٹ سین	۲۸۶
دو موتیں	۳۰۵

پیش لفظ

ا۔ س۔ سیرافیموویچ

الیکساندر سیرافیموویچ (پوپوف) بزرگ سوویت ادیبوں میں سے ھیں۔ وہ سوویت افسانوی ادب کے ایک بانی اور میکسم گورکی کے قریبی دوستوں میں سے تھے اور ان کی تصانیف کی ولادیمیر ایلیچ لینن نے بھی بڑی قدر کی۔ انھوں نے لکھا:

''... آپ کی تخلیقات نے میرے دل میں آپ کے لئے گہرا جذبۂ ھمدردی پیدا کر دیا ھے اور میں یہ بات زور دیکر کہنا چاھتا ھوں کہ آپ کی تصانیف کی مزدوروں اور ھم سب کے لئے ضرورت ھے...''

سیرافیموویچ ۱۸۶۳ء میں دریائے دون کے علاقے میں ایک کزاک افسر کے خاندان میں پیدا ھوئے۔ یہ لوگ دولت‌مند نہ تھے۔ الیکساندر سیرافیموویچ نے اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد پیٹرس بورگ یونیورسٹی کے طبیعیات وریاضی کے شعبے میں داخلہ لیا اور اس کے ساتھ ھی قانون اور طبیعی علوم کے شعبوں کے لکچروں میں بھی شرکت کرتے رھے اور سماجی اور معاشی سائنسوں کا بھی مطالعہ کرتے رھے۔ یونیورسٹی میں سیرافیموویچ اس خفیہ انقلابی حلقے کے سرگرم ممبر بن گئے جس کی قیادت ولادیمیر لینن کے بڑے بھائی الیکساندر اولیانوف کر رھے تھے۔

زار کی حکومت نے یونیورسٹی کے انقلابی مرکز کو سختی سے کچل دیا اور سیرافیموویچ کو جب وہ یونیورسٹی کے چوتھے کورس میں تھے بحرمنجمد شمالی کے گاؤں میزین جلاوطن کر دیا گیا۔

سیرافیموویچ نے اپنی پھلی کہانی ''برفانی موت'' (۱۸۸۹ء) جلاوطنی کے دوران لکھی۔ ''یہ انتہائی ویران اور جان‌لیوا جگہ ھے۔ یہاں سخت نمی، دھند اور تقریباً مستقل بےحد شیطانی جاڑا پڑتا ھے... سنسان شمال کی بےکیفی اور افسردگی، پرواز خیال کے لئے زبردست وسعت اور تلخ یادوں نے زمین تیار کی اور میں لکھنے لگا... میں غم اور آنسوؤں، غربت اور پستی کے بارے میں لکھنے لگا۔''

مصنف کی ابتدائی کہانیاں ''طوفان'' اور ''ریت'' پچھلی صدی کے

آخر میں روسی زندگی کے بےرحم اور غمگین حقائق کی لاجواب فنکارانہ تصویریں ھیں ۔ عظیم روسی ادیب لیف تالستائی نے اپنی عادت کے مطابق سیرافیموویچ کی کہانی ''ریت،، پڑھکر اس کے حاشیے پر پورے نمبر دئیے ۔

۱۹۲۵ء میں سیرافیموویچ کا ناول ''سیل آھن،، شائع ھوا جو خانہ‌جنگی کے ایک جرأت‌آمیز واقعہ کے بارے میں تھا ۔ اس ناول نے مصنف کو عالمی شہرت عطا کی ۔

چوتھی اور پانچویں دھائی میں سیرافیموویچ نے سارے ملک کا دورہ کرکے نئے شہروں اور نئے لوگوں، پرامن تعمیر کی نئی تحریکوں اور فتوحات کے بارے میں لکھا ۔

انھوں نے نوجوان مصنفوں کو بھی ان کی تخلیقات کے سلسلے میں کافی وقت دیا ۔ تجربےکار ادیب کی حیثیت سے ان کے مشوروں نے آستروفسکی کو اپنے مشہور ناول ''دارورسن کی آزمائش،، اور مصنف فورسانوف کو ''چاپائیف،، کی تخلیق میں بڑی مدد دی ۔

ان کی پہلی کہانی سے ھی اس وقت کے غیرمعروف مصنف کو، جو آگے چل کر ''خاموش دون،، اور ''جب دھرتی جاگی،، جیسے ناولوں کے مصنف بنے، سیرافیموویچ نے دریافت کرلیا ۔ میخائیل شولوخوف جو اب لینن اور نوبل انعامات حاصل کر چکے ھیں اپنے استاد کے بارے میں لکھتے ھیں : ''میں واقعی سیرافیموویچ کا ممنون ھوں کیونکہ انھوں نے ابتدائی ادبی سرگرمیوں سے ھی میری حمایت کی ۔ انھوں نے سب سے پہلے میری ھمت‌افزائی کی اور مجھے مانا،، ۔

حب‌وطنی کی عظیم جنگ کے دوران جو سوویت عوام ھٹلری فسطائیت کے خلاف لڑ رھے تھے اپنی ۸۰ سال کی عمر کے باوجود سیرافیموویچ محاذجنگ پر پہنچے اور انھوں نے جنگی نامہ‌نگار کی حیثیت سے کام کیا اور اس جنگ میں سوویت لوگوں کی بےمثال جرأت اور بہادری کے بارے میں نوٹ اور کہانیاں لکھیں ۔

سیرافیموویچ کی تصانیف میں قارئین کو گہرا خلوص اور سچائی ملتی ہے ۔ خود مصنف نے اپنی تخلیقات کے بارے میں لکھا : ''... وہ سب جو سچائی سے مطابقت نہیں رکھتا، ادب میں میرے لئے وہ ھمیشہ ناپسندیدہ رھا ھے،، ۔

الیکساندر سیرافیموویچ کا انتقال ۱۹۴۹ء میں ھوا ۔

گالینا

گھوڑا گاڑی کھانچوں اور سڑک پر پھیلی ہوئی بل دار جڑوں میں پھنس کر ہچکولے کھاتی اور ادھر ادھر جھولتی چل رہی تھی۔ سرنگ گھوڑی جس کے پٹھے رگڑ گئے تھے اور پیٹھ زخمی تھی اپنا سر ہلاتی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔

سڑک کے دونوں طرف جنگل کٹ چکا تھا۔ اس کے کاٹنے کا کام یا تو غلط طریقہ پر کیا گیا تھا یا مویشی نئے درختوں کی پھنگیاں چبا گئے تھے جن کی وجہ سے ان کی باڑھ مر گئی تھی — بہرحال حد نگاہ تک کالے، پھٹے اور کائی لگے ہوئے ٹھنٹھوں کے سوا اور کچھ نہیں دکھائی دیتا تھا جن کے چاروں طرف بہت سی چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔

بادلوں سے ڈھکے بھورے آسمان پر مرغابیاں چاؤں چاؤں کرتی تیزی سے اڑ رہی تھیں جس سے ایک چمک سی پیدا ہو جاتی تھی۔

گالینا کی انگلیاں پھٹے ہوئے دستانوں سے جھانک رہی تھیں۔ وہ جھکولے کھاتی ہوئی گاڑی کا کٹھرا مضبوطی سے پکڑے تھی۔ اس نے دانت بھینچ لئے تھے اور منہ بھی کس کر بند کر لیا تھا۔ گاڑی کے ہچکولے اسے جھٹکے دے رہے تھے اور وہ تکلیف سے کراہ رہی تھی۔

میخائلو کے بال سنہرے تھے۔ اس کے سر پر گرم پھٹی ہوئی ٹوپی تھی جس کے دونوں پلے کانوں تک لٹک رہے تھے۔ اس کے چھال کے جوتے گاڑی کے سامنے جھول رہے تھے جن کو گھوڑی اپنے لید بھرے پیروں سے برابر ٹھکراتی جا رہی تھی۔ وہ خود بھی ہچکولوں سے برابر جھول رہا

تھا اور اس کی ٹوپی نیلگوں جنگل کے چکردار راستے پر دور سے ھچکولے لیتی اور ناچتی دکھائی دیتی تھی لیکن وہ ان ھچکولوں سے بالکل بےخبر اپنے خیالات میں ڈوبا ھوا تھا یا شاید وہ کچھ نہیں سوچ رھا تھا بلکہ لاپروائی سے راس کی طرف دیکھ رھا تھا جو گھوڑی کی دم میں پھنس گئی تھی اور اس کو ایک طرف کھینچ رھی تھی - اسے یہ راس پھر ٹھیک سے لگانی تھی -

جن کھیتوں اور درختوں کے ٹھنٹھوں کے پاس سے وہ گذر رہے تھے، جو دیہاتی آدمی اس کو گاڑی میں اسٹیشن سے لئے جا رھا تھا ان سب کا ایک خاکہ گالینا کے ذھن میں پہلے سے تھا - اس نے کتابوں میں پڑھ کر ان کی جھلک دیکھی تھی - اس کو وہ گاؤں بھی یاد تھے جہاں وہ کبھی کبھی گرمیاں گذارنے جا چکی تھی - شاید کتابوں میں جو کچھ لکھا تھا وہ سب اس‌نے پڑھا نہیں تھا یا گرمیوں میں پڑھانے کے لئے جاتے وقت ٹرین کی کھڑکیوں سے راستے کی تمام چیزوں کو غور سے نہیں دیکھا تھا یا پھر ان جاگیروں میں فرق تھا جہاں اس نے پڑھایا تھا - بہرحال یہاں کی ھر چیز مختلف معلوم ھوتی تھی، خاموش، سنسان اور خیالات میں ڈوبی ھوئی -

وہ ایک کھیت سے گذر رہے تھے جس میں گوبر پھیلا ھوا تھا کہ ان کو سامنے ایک گاؤں سیاہ دھبے کی طرح نظر پڑا - گاؤں کے کنارے ھی ایک بڑی عمارت تھی جس کا رنگ زمانے کے ھاتھوں سیاہ ھو چکا تھا لیکن اس کی چھت نئی اور سبز رنگی ھوئی تھی اور سامنے کے چھوٹے سے باغ میں برچ کے کمسن درختوں کا ایک جھنڈ اس طرح کھڑا تھا جیسے دلھن سہیلیوں کے جھرمٹ میں ھو -

”مسافر کون ہے؟“ ایک قدآور بڈھے نے پوچھا جس کی سفید داڑھی سوتی قمیص پر لہرا رھی تھی - وہ بھرائی ھوئی، کھوکھلی آواز میں بول رھا تھا جیسے آوازوں کی نقل کرنےوالے بولتے ھیں - اس نے گاڑی کے کٹھرے پر ھاتھ رکھ دیا، زرد ھاتھ جس میں گٹھے پڑے تھے اور بڑھاپے کی وجہ سے رگیں ابھر آئی تھیں -

میخائلو برابر لگام کھینچتا اور مڑے بغیر باتیں کرتا جا رھا تھا:

”میں پادری کا سامان لے کر اسٹیشن گیا تھا - اس سال روٹی کے دام دس کوپک بڑھ گئے ھیں - چوراھے پر پہنچ کر گھوڑی نے ٹھوکر لے لی - اسی طرح کسی نہ کسی دن ختم ھو جائیگی - “

اس نے گھوڑی کے دم کے نیچے پھچ سے تھوکا -

''واپسی میں میں استانی کو لیتا آیا،، اس نے پھر کہا۔
''ہو نہ ہو،، بڈھا بڑبڑایا اور ایک سیاہ عمارت کی طرف سر ہلاتے ہوئے کہنے لگا:
''وہ رہا اسکول۔ خدا کابانوف کا بھلا کرے کہ اس نے اسکول کی چھت اچھی بنوادی... میخائلو، سنو، میں اپنے لڑکے سے ملنے گیا تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ مجھے اپنے پاس رکھےگا یا نہیں۔ اس نے مجھے الٹے پیروں واپس کر دیا۔،،
''اب یہ سب لونڈے اسی طرح کے ہوگئے ہیں۔سوچتے ہیں کہ بڈھے تو قبر میں پیر لٹکائے بیٹھے ہیں، ان کو کھلانے پلانے سے کیا فائدہ۔،،
میخائلو نے اپنے کوڑے کی ڈنڈی سے راس ٹھیک کی جو گھوڑی کی دم میں پھنس گئی تھی اور پھر اس کے سرے سے گھوڑی کے پیر میں لگی ہوئی سوکھی لید کھرچنا شروع کر دی۔
''میں اس ہفتے داروغہ کے پاس جاؤنگا۔ میں ''سوکری کوت،، لگان پر لینا چاہتا ہوں۔،،
''جو جنگل کے پاس ہے، ہے نا؟،،
''ہاں ہاں۔ ایک ایکڑ سے زیادہ نہ ہوگا، حد سے حد، لیکن اس کی قیمت کافی زیادہ مانگتے ہیں۔،،
''چور ہیں، یسوع مسیح کی قسم۔،،
''جونکیں ہیں۔،،
''یہ لوگ اس طرح باتیں بناتے ہیں جیسے میں کوئی بےجان چیز ہوں یا ایک سرے سے میرا وجود ہی نہیں ہے۔،،
گالینا خوش تھی کہ سخت جھکولے ختم ہوگئے ہیں پھر بھی وہ کٹھرے کو پکڑے بیٹھی تھی۔
گاؤں کی یہ ناہموار واحد سڑک بےحد سنسان تھی۔ ایک سیاہ بھیگے ہوئے قطعہ کے بیچوں بیچ گاؤں کا کنواں تھا اور اس کے چاروں طرف سفید بطخوں کا ایک جھنڈ بےحس‌وحرکت کھڑا تھا۔ جھونپڑیوں کے پیچھے سے گرجا کے گنبد جھانک رہے تھے۔
گالینا اسٹیشن سے یہاں تک کا پورا راستہ طے کرنے کے بعد یہاں کی انتہائی یاس‌انگیز فضا میں کھو سی گئی تھی۔ اس سے پہلے اس کو کبھی ایسا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ یہ فضا اس خاموشی، سناٹے اور کسی

ایسے لاینحل مسئلہ کا جز تھی جو چاروں طرف چھا سا گیا تھا۔ چنانچہ وہ خاموش بیٹھی رہی، اس‌نے گاڑی‌بان سے کچھ نہیں کہا۔

''ارے، دیکھنا،، سیخائلو نے گھوڑی کو ھلکے سے کوڑا لگاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ابھی اپنے لئے ایک نئی ٹوپی خریدی ھے۔،،

''اچھا، اچھا،، گاڑی کے کٹھرے سے اپنا ھاتھ ھٹاتے ہوئے بڈھے نے کہا۔ ''خدا حافظ، خوش رھو۔ وہ رھا اسکول، وھاں۔،،

گاڑی اسکول پہنچ گئی۔

سیخائلو گاڑی سے کود کر نیچے آیا۔

''اے، کانے، سنتا ھے۔ میں استانی کو لایا ھوں۔ ارے سنتا ھے کہ نہیں؟،،

اس نے اپنے کوڑے کی ڈنڈی سے کھڑکی کے تختے پر کھٹ کھٹایا۔

اسکول کی کھڑکیاں کھلی تھیں اور سناٹا تھا۔ گالینا کو سپاٹ دیواریں اور ڈسکیں دکھائی دے رھی تھیں جو کثرت استعمال سے چکنی ھو گئی تھیں۔

کہیں خلا کی گہرائیوں سے کھانسنے کی آواز آئی اور پھر بھاری لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کی چاپ معلوم ھوئی۔ کنوئیں کے چاروں طرف بطخیں کڑکڑانے لگیں۔

ایک بڈھا نکل کر برساتی میں آگیا۔ اس کے شانے جھولے ہوئے تھے اور وہ کبڑا معلوم ھوتا تھا۔ اس کی ایک آنکھ بھینگی اور ٹھڈی بھاری اور چوڑی تھی۔ اس نے اپنی واحد آنکھ سے نووارد کو دیکھا، بھاری قدم رکھتا ھوا چرچراتے زینوں سے نیچے آیا۔ ایک ٹوکری، گٹھری اور بیگ گاڑی سے باھر کھینچا اور خاموشی سے ان کو اسکول کے اندر لے گیا۔ اس کی کہنیاں باھر نکلی ھوئی تھیں اور اب پہلے سے زیادہ اس کے شانے جھولے معلوم ھوتے تھے۔

سیخائلو گھوڑی کا پٹا ٹھیک کر رھا تھا۔

گالینا گاڑی میں بیٹھی رھی۔ اس کے پیر ایسے سن ھو گئے تھے کہ اس کو کھڑے ھوتے ڈر لگتا تھا۔ اچانک اس کو محسوس ھوا کہ وہ بالکل تنہا ھے، سب اس کو چھوڑ چکے ھیں اور وہ عضو معطل بن کر رہ گئی ھے۔

''میرے خدا،، گالینا نے سوچا۔ ''یہ تو جنگل کی زندگی ھے!..،،

اس کو درخت کے ٹھنٹھوں کا وہ وسیع اور اداس میدان پھر یاد آگیا۔

''ارے، یہاں تو جنگل بھی نہیں ہے!''..

اس نے اچانک اپنی اداسی پر قابو پالیا، اچک کر نیچے آئی اور اسکول کے اندر چلی گئی۔

یہاں کی تمام چیزیں بدقطع تھیں: کلاس کا بڑا سا کمرہ جس کی چھت دھوئیں سے کالی ہو رہی تھی، بدھیئت ڈسکیں، تختۂ سیاہ میں ایک بڑی سی دراڑ اور اس کے پیچھے دنیا کا نقشہ جس کو مکھیوں نے کافی گندہ کر دیا تھا۔ اس پر امریکہ کا لمبا خاکہ بہت ھی بےتکا معلوم ہوتا تھا۔

گالینا اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کمرہ چھوٹا تھا اور اس کی چھت بہت اونچی تھی۔ کھڑکی سے وھی واحد سڑک، کنوئیں کے چاروں طرف سفید بطخیں اور سیاہ جھونپڑیوں کی قطار کے پیچھے گرجا دکھائی دے رہے تھے۔

وہ کمرے کے بیچوں بیچ اپنی رسی سے بندھی ہوئی ٹوکری پر بیٹھ گئی۔ اس کی کہنیاں گھٹنوں پر تھیں اور ٹھڈی ھاتھوں پر ٹکی تھی۔

اس کو شہر چھوڑنے، دوستوں اور نوجوان ساتھیوں سے جن کے ساتھ وہ اسکول کے زمانے میں پلی بڑھی تھی جدا ہونے، تھیٹروں، کتابوں اور ان سہیلیوں کو خیرباد کہنے کا بڑا رنج تھا جو کالج چلی گئی تھیں۔

اس کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ آئی تھی کہ ایک دن اس کو ان پھٹیچر بچوں کے دماغ میں ا، ب، ت ٹھونسنا پڑیگا۔ اس کے پاس نہ تو مہارت تھی، نہ تجربہ اور نہ ولولہ۔ بھلا وہ کیسے پڑھا سکیگی؟

ایک آواز جو بیک وقت اجنبی بھی تھی اور جانی پہچانی بھی اس خالی کمرے میں عجیب انداز سے گونج اٹھی:

''لیکن تمھیں زندہ رھنا ہے!''

یہ اس کی اپنی آواز تھی جو اندر ھی اندر گونج رہی تھی۔

وہ اچک کر کھڑی ھو گئی، اپنے چہرے سے ایک جالا چھڑایا اور رسی کی ایک گرہ کھولنے لگی جو بہت سخت تھی۔

اپنے بھاری بوٹ پٹکتا اور لڑکھڑاتا ہوا بے کوبڑوالا کبڑا ایک سفید چیڑ کی میز گھسیٹ کر کمرے میں لایا اور اسے کھڑکی کے پاس لگا دیا، پھر اس کو ادھر ادھر ہٹاتا رہا یہاں تک کہ میز کے پیر اچھی طرح فرش پر ٹک گئے۔ اب وہ ایک طرف ہٹا، اپنی کانی آنکھ سے گالینا کو دیکھا جو سخت گرہ کھولنے میں جٹی ہوئی تھی، اس کو الگ ہٹا دیا اور کچھ کہے بغیر سر ہلا کر دانتوں سے گرہ کھولنے لگا۔ اور بات بھی کس چیز کے متعلق کی جاتی۔ ہر چیز تو پرانی اور جانی پہچانی تھی۔ فضا پر ایک اداسی سی طاری تھی جو مہینوں یا شاید برسوں سے چلی آرہی تھی اور زندگی سنسان و بے کیف ہو کر رہ گئی تھی۔

گالینا نے بڑے جوش کے ساتھ اپنا کمرہ ٹھیک ٹھاک کرنا شروع کیا۔ اس نے تصویریں اور فوٹو دیواروں پر رکھکر پہلے دیکھ لئے کہ کہاں اچھے لگتے ہیں پھر ان کو لگایا، کتابیں میز پر چن دیں اور چھوٹے چھوٹے اسٹینڈوں پر وہ چھوٹی موٹی چیزیں سجا دیں جن کو وہ اپنی گذشتہ زندگی کی یادگار سمجھ کر عزیز رکھتی تھی۔

کبڑا پھر آیا۔ اس مرتبہ وہ ایک سبزی مائل زنگ لگا ہوا چھوٹا سا سماور لایا تھا جس میں بڑے زوروں سے پانی ابل رہا تھا۔ اس میں سے کھلبلانے کی آواز آ رہی تھی اور بھاپ کے بادل نکل رہے تھے۔ اس نے خاموشی سے سماور میز پر رکھ دیا۔ گالینا نے کھڑکی سے دیکھا کہ ادھر سے مویشی گذر رہے تھے۔ انھوں‌نے گردوغبار کا ایک بادل پیدا کر دیا تھا۔

گالینا حیرت‌زدہ تھی۔ اس نے سماور تو نہیں مانگا تھا۔

”کیا تم چوکیدار ہو؟“

”جی ہاں“ اس نے بددلی سے جواب دیا۔

”تمھارا نام کیا ہے؟“

”واسیلی۔“

کمرے میں اچانک ایک خوش کن اور دوستانہ فضا پیدا ہوگئی۔

پہلے چند دن جگہ سے واقفیت حاصل کرنے میں گذر گئے۔ اس کو کھانے پینے کا سامان خریدنا تھا۔

جس دن گالینا آئی تھی اسی دن شام کو وہ گاؤں کے پادری سے ملنے گئی۔

راستے میں جو عورتیں اس کو ملیں ان میں سے کچھ نے جھک کر سلام کیا۔ وہ جان گئی تھیں کہ یہ استانی ہے۔ دوسری عورتیں اس کے پاس سے گذر گئیں لیکن بعد میں مڑکر اسے دیکھنے لگیں۔ یہی صورت مردوں کی بھی ہوئی۔ کچھ نے تو اپنی ٹوپیاں اتار کر سلام کیا اور کچھ نے اس کی پروا نہیں کی۔ لڑکیاں اپنی نگاہیں جھکائے رہیں لیکن جب وہ گذر گئی تو رک کر اسے دیکھنے لگیں۔

نیا گرجا گھر ذرا بلندی پر تھا۔ اس کے گنبد جو نئے نئے رنگے گئے تھے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔

پادری کا گھر ایک احاطہ کے اندر جھونپڑیوں کی قطار کے پیچھے تھا۔ گھر کے پاس باغ، باڑہ اور اصطبل تھا۔ اصطبل کے قریب کھاد کا ڈھیر، جس کے اوپر ایک بال‌دار سر اور سیاہ داڑھی دکھائی دے رہے تھے۔

کھاد کے ڈھیر کے سامنے ایک اور سیاہ داڑھی والا آدمی کھڑا تھا جو خود پادری تھا۔ اس کا قد لمبا تھا اور وہ ایک لمبا عبا پہنے تھا۔ اس کے گندھے ہوئے بالوں کی چوٹی پیٹھ پر لٹک رہی تھی۔ اس کی بھاری بھرکم آواز سے کھاد میں چگتی ہوئی مرغیوں نے بھی چوکنا ہوکر چاؤں چاؤں شروع کر دی تھی۔

”آخر تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ کیا میں نے یہ کھاد تمہارے لئے تیار کرائی تھی؟ تمہیں دوسروں کی ملکیت پر قبضہ جمانے کا کیا حق ہے؟ اس طرح بیٹھے ہو جیسے تمہارے باپ کا گھر ہے یہ! ارے، یہ تو چوری سے بھی بری بات ہے — جیسے رات میں چور گھس آئے۔ چور سے برا کوئی نہیں ہوتا اور خدا چوروں پر عذاب نازل کرتا ہے۔ تم کو اس شرارت کے لئے عدالت پہنچایا جا سکتا ہے، اس کے علاوہ خدا کے سامنے بھی تم قصوروار ہو...“

”مقدس باپ“، اس سر نے اپنی سیاہ داڑھی پادری کی طرف گھماتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مقدس باپ، مجھ سے گناہ ہوا۔ میں نے بڑی خطا کی ہے، میری روح سیاہ ہو گئی ہے۔ میں آپکی بڑی عزت کرتا ہوں، مقدس باپ... تہہ دل سے... لیکن اتنا شدید درد تھا کہ میں اٹھ بیٹھ نہیں سکتا تھا... کھاد سے غسل، صرف یہی علاج تھا اور میرے واحد گھوڑے کی کھاد کافی نہ تھی۔ اس لئے میں نے سوچا کہ آپ کا کوئی نقصان نہ ہوگا اور میرا بھلا ہو جائیگا...“

"تم نے بلا پوچھے یہ جرأت کیسے کی!.."

سر میں حرکت ہوئی۔ گردن اوپر اٹھی، کھاد ادھر ادھر لڑھک گئی اور پھر کھرے سرخ شانے، بازو اور آخرکار ایک آدمی کا پورا ننگا جسم دکھائی دیا، ایسا سرخ جیسے فوراً بھاپ کے غسل سے نکلا ہو۔ وہ اپنے کھردرے ہاتھ جوڑ کر پادری کے سامنے جھکا اور بڑی عاجزی سے کہنے لگا:

"میں شرمندہ ہوں، مقدس باپ... میرے لئے دعا کیجئے۔"

گالینا دوڑکر گھر کے اندر چلی گئی۔

مکان میں ابھی ابھی فرش صاف کرنے اور بچوں کی باس آرہی تھی۔ اس میں بخورات کی بھی ہلکی سی مہک شامل تھی۔

چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں ململ کے پردے پڑے تھے اور کھڑکیوں پر گلدان رکھے تھے۔ دیواروں پر فوٹو اور تصویریں لگی تھیں اور صوفے کے اوپر ایک گیتار ٹنگا ہوا تھا۔ ایک گول میز پر کروشیا کے کام کا میزپوش پڑا تھا اور گراموفون رکھا تھا جس کا بھونپو ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ برابر کے کمرے سے لڑکوں کے کھیلنے، قہقہوں اور غل کی آواز آ رہی تھی۔

پادری کی بیوی نے، جو اپنے آٹھویں بچے کی پیدائش کے بعد کافی موٹی ہو گئی تھی، اس کا خیرمقدم بڑے خلوص‌وتپاک سے کیا۔ اس کا رنگ سفید اور آنکھیں سیاہ‌وخوبصورت تھیں۔

"آؤ، اندر آؤ۔ تمہارے آنے سے ہم لوگوں کو بڑی خوشی ہوئی۔ ہمیں ہمیشہ نئے لوگوں سے مل کر خوشی ہوتی ہے۔ پادری ایک منٹ میں آتے ہونگے۔ یہاں بڑا سناٹا رہتا ہے اور تم ٹھہریں اتنی کمسن، گالینا! اگر تمھیں میں اس طرح پکاروں تو برا تو نہیں مانوگی۔ ہے نا؟ بہر حال میں تمہارے مقابلہ میں بزرگ ہوں۔ تمھیں تو ابھی بہت دنیا دیکھنی ہے۔ لیدوچکا، جا کر ابا کو بلا لا۔ یہ میری سب سے بڑی لڑکی ہے۔ اس کو کشیدہ کاری بہت پسند ہے۔"

بڑی بڑی گہری نیلی اور متلاشی آنکھیں جن میں ذرا بھی بچپن کی جھلک نہ تھی گالینا کی طرف اٹھیں۔ ان میں بھی اس کے دبلے پتلے پیلے چہرہ کی طرح درد بھرا تھا۔ ماں نے پیار سے اس کا سر چوما اور لڑکی کمرے کے باھر چلی گئی۔ وہ ایک پیر سے لنگڑا رہی تھی اور

خوبصورت بالوں کی ایک چھوٹی سی چوٹی اس کی پیٹھ پر لہرا رہی تھی جس میں ماں نے محبت سے گلابی فیتہ باندھ دیا تھا۔

''اس کو ہڈیوں کی دق ہے... گھٹنے میں... ایسی قسمت خراب گئی۔ پادری دمیتری ایک منٹ میں آتے ہونگے۔ اس وقت تو وہ بہت تاؤ میں ہیں۔ وہ آدمی جو کھاد میں بیٹھا ہے — گالینا، دیکھو کسی سے کہنا نہیں۔ '' یہاں پہنچ کر اس نے اپنی آواز دھیمی کر دی۔ ''ہمیں اس پر اعتبار تھا، ہم اس کو ایسا خداترس آدمی سمجھتے تھے جو پادری کی عزت کرتا ہو... انیسکا، بے بی کو پالنے سے نکال لینا، تمھیں سنائی نہیں دیتا کہ وہ رو رہا ہے؟.. ہاں تو ہم اس پر اعتبار کرتے تھے... جب بھی وہ آتا ہم اس کو چائے پلاتے اور تہواروں کے موقع پر پادری دمیتری اس کو ایک گلاس... کیا اس بچے نے پیشاب کر دیا؟ اچھا اس کے کپڑے بدل دو... لیکن وہ... دیکھو گالینا، کسی سے کہنا نہیں، کسی سے بھی نہیں کیونکہ اس کا تعلق اعتراف گناہ کے اخفا سے ہے... تم تو جانتی ہو کہ عبا قبا پہن کر آدمی کو...''

انیسکا، تقریباً چودہ برس کی لڑکی تھی جس کے چہرے پر جھائیاں تھیں۔ وہ بے تکے انداز میں اپنے ہاتھ پر بچے کو لٹکائے دروازے کے پٹ سے جھانک رہی تھی۔

''ہمارے پاس بڑے اچھے تین گھوڑے تھے۔ اتفاق سے ہم کو مل گئے اور ہم نے خرید لئے۔ بڑے خوبصورت گھوڑے تھے اور پادری دمیتری کو گھوڑوں کا بڑا شوق ہے۔ ایک صبح جو ہم اٹھے تو دیکھا کہ اصطبل کا قفل ٹوٹا پڑا ہے، دروازے پٹوپٹ کھلے ہیں اور گھوڑوں کا کہیں پتہ نہیں۔ اب تم سمجھ لو، بس ہم لوگوں کی جان نکل گئی۔ پادری دمیتری تو رونے لگے۔ پھر میں بھی روئی۔ میں نے ان سے کہا کہ تم کو گھوڑے مجھ سے زیادہ پیارے ہیں۔ اس پر ان کو غصہ آگیا اور ہم میں آپس میں جھگڑا ہوا... ہم نے گھوڑوں کی ہر جگہ تلاش کی، پولیس کو انعام دینے کا وعدہ کیا اور حد ہے کہ میں نے یہ گناہ تک کیا کہ قسمت بتانے والی کے پاس گئی... گاشکا، تم نے روٹی تنور میں رکھی؟''

گھر کے اندر سے باورچی خانہ کی باس کے ساتھ دور سے آواز آئی:

''بس، رکھنے جا رہی ہوں!''

''ھاں، اگر خمیر اٹھ گیا ہو تو روٹی تنور میں رکھدو... ھاں تو وہ ھمارے ھاتھ سے جاتے رہے۔ یہ پچھلے سال کی بات ہے۔ اور تم جانتی ہو کہ اس سال کیا ہوا؟ مقدس ہفتے میں یہ بیکوف اعتراف گناہ کے لئے آیا اور کہنے لگا: 'مقدس باپ، مجھ سے گناہ سرزد ہوا ہے۔ میری روح کو گناہ سے پاک کر دو — میں تھا جس نے آپ کے تینوں گھوڑے چرائے تھے۔ میرا گناہ...'، پادری دمیتری ایسے چکرائے کہ کھڑا رہنا مشکل ہو گیا۔ انھوں نے جلدی سے صلیب کا نشان بنا کر اس کی بخشائش کی دعا کی — اس کے گناھوں کی معافی کی دعا مانگی... اور غصے سے آگ بگولا میرے پاس آئے اور مجھ سے بیان کیا۔ میں ھاتھ ملتی رہ گئی۔ میرے خدا، ذرا سوچو تو...''

''آپ نے پولیس کو اطلاع کر دی ہوتی۔''

''ہم یہ کیسے کر سکتے ہیں؟ اعتراف گناہ تو راز ہوتا ہے... بس سمجھ لو، اس میں وھی بات ہے جو دستوئیفسکی نے کہی ہے کہ ہمیں یہ راز اپنے ہی تک رکھنا چاھئے۔ اس سے ہمیں کوفت ہوتی ہے لیکن ہمیں اسے افشا نہ کرنا چاھئے۔ اگر ہم ایک لفظ بھی کہہ دیں تو گاؤں بھر میں یہ بات پھیل جائیگی کہ پادری دمیتری اعتراف گناہ کا راز فاش کر دیتے ہیں۔ اسی لئے ہم اس قصے کے متعلق خاموش رہے اور اب وہ ہماری کھاد میں گھس گیا... انیسکا، بے بی کو صحن میں لے جاؤ اور ابا کو بلا لاؤ۔ کہو، اماں بلاتی ہیں۔ ارے، وہ آگئے۔''

پادری بھاری قدم رکھتا، دروازے کے اندر سے گذرنے کے لئے ذرا جھک کر کمرے میں داخل ہوا اور گالینا سے اس طرح لپک کر ملا جیسے وہ اس سے بہت دنوں سے واقف ہو۔ اس نے گالینا کے چھوٹے ھاتھ اپنے بڑے مضبوط ھاتھوں میں لے کر زور سے دبائے۔

وہ بھاری بھر کم اور خوبصورت تھا، سیاہ داڑھی کے حلقے میں دھوپ سے تپے ہوئے گالوں پر ایسا صحت مند رنگ جھلک رہا تھا کہ اس کے اوپر لمبا سا عبا عجیب معلوم ہوتا تھا۔

''اچھا، ہمیں شہر کی خبریں بتاؤ۔ یہاں تو بالکل سناٹا ہے، ہماری زندگی بالکل اجاڑ ہے۔ مجھے یاد ہے جب میں طالب علم تھا... بیوی، چائے منگواؤ؟''

''آ رہی ہے۔ کاشکا، اب کتنی دیر اور لگے گی؟''

''ابھی ابھی!''

''مجھے یاد ہے کہ جب میں طالب علم تھا... بالکل طالب علم تو نہیں تھا بلکہ مذہبی مدرسے میں تھا... ہاں ٹھیک ہے...''

''دمیتری ایوانووچ'' اس کی بیوی نے اس کا پورا خاندانی نام استعمال کرتے ہوئے کہا۔ اس کو بھی وہ زمانہ یاد آ گیا۔ ''دمیتری ایوانووچ یونیورسٹی کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ ابتدائی برسوں میں یونیورسٹی میں داخلہ کے لئے ہر وقت پڑھتے رہتے تھے اور پادری کے عبا سے دستبردار ہونے کو تیار تھے... اور مجھ سے تو عبا دیکھا بھی نہیں جاتا تھا۔ جب ان سے میری شادی ہوئی تو میں اسکول ھی میں تھی۔ ہاں پھر ہم یہاں آ کر اس طرح رہنے لگے جیسے کوئی کیمپ لگا کر کہیں عارضی طور پر رہنے جاتا ہے... میں سوچتی تھی کہ معلوم نہیں کس وقت ہم یہاں سے چلے جائیں، ہم کوئی نہ کوئی انتظام کر ھی لیں گے اور یہ یونیورسٹی چلے جائیں گے۔ ایک نئی زندگی شروع ہو جائیگی لیکن اب تو ہمارے آٹھ بچے ہو گئے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں ان کی پرورش یہیں کرنی ہوگی... گاشکا، اس کو یہاں رکھ دو... بے تکی کہیں کی، پھر میزپوش میں الجھ گئی...''

گاشکا تندرست لڑکی تھی۔ اس کے موٹے گلابی گال ایسے سخت تھے کہ ان میں چٹکی لینا مشکل تھا۔ اس کے ابھرے ہوئے سینے پر ایک بے ڈھنگا سا شہری بلاؤز تھا۔ بڑی بڑی گھورتی آنکھیں اور چہرے پر یکساں مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے وہ میزپوش گھسیٹا جو اس کے بٹن میں پھنس کر میز سے بالکل اتر گیا تھا اور اس کو پھر میز پر بچھانے کے لئے چائے کی کشتی زمین پر رکھ دی۔

''کیا تمہاری عقل بالکل ھی ماری گئی ہے؟ کشتی اٹھاؤ۔''

گاشکا کی آنکھیں خوف سے نکلی پڑ رہی تھیں اور اس کی کھسیانی مسکراہٹ کانوں تک پھیل گئی تھی۔ اس نے کشتی اٹھائی اور اس کی مالکہ نے ناراضگی سے میزپوش پھر بچھا دیا۔

''تم بالائی ڈالوگی، گالینا؟ یہاں تو بس نوکروں کی مصیبت ہے — تم نے اس چڑیل کو دیکھا؟ یہاں نوکر ہر چیز توڑ پھوڑ ڈالتے ھیں، کچھ پکا نہیں سکتے... اور ایسے بداطوار...''

’’بس، بالکل مگر۔چھ،، پادری بیچ میں بول اٹھا ۔

’’... کل میں ایک خوبصورت کیک بنانے کے لئے سیب کوٹ رہی تھی کہ بچوں کی وجہ سے مجھے کہیں جانا پڑا ۔ میں واپس آئی تو گلشکا آدھے سیب کھا چکی تھی — سوچو تو ذرا، مٹھیاں بھر بھر کر لے رہی تھی اور منہ میں بھرتی جا رہی تھی...،،

’’یہ جھوٹ ہے !..،، دروازے کے پیچھے سے ایک زوردار دیہاتی آواز آئی، جس سے پورا کمرہ گونج اٹھا ۔ ’’میں نے اس کو بنچ پر رکھ دیا تھا اور کتا اندر آگیا...،، پل بھر کے لئے ایک موٹا پسینے سے شرابور چہرہ اور سہمی سی پھولی پھولی آنکھیں دروازے میں نمودار ہوئیں ۔

’’تم بالکل پاگل ہو !.. جاؤ، باورچی خانے میں جاؤ ۔ ،،

’’... اور اس کو کھا گیا ۔ ،،

سب چائے پینے لگے ۔ میز پر گلابی پنیر کیکوں کا ایک ڈھیر تھا جو منہ میں جاتے ہی گھل جاتے ھیں ۔ یہ مالکہ نے خود تیار کئے تھے ۔

یکے بعد دیگرے بچے اپنے قدوقامت کے حساب سے آتے گئے اور ماں باپ کے چاروں طرف پھیل گئے ۔ ان کی آنکھیں اس پلیٹ پر لگی تھیں جس میں شہر کے بنے ہوئے بسکٹ قاعدے سے چنے تھے ۔

پادری اور اس کی بیوی گالینا سے شہر کے متعلق بہت سی باتیں پوچھ رہے تھے لیکن اس کے جواب نہیں سن رہے تھے ۔ وہ اس کی بات کاٹ کر برابر اپنے اور اپنے حلقے کی بابت بتاتے رہے تھے کہ اگر پرانے عقیدے کے لوگ نہ ہوتے تو حالت اتنی خراب نہ ہوتی... اس کے علاوہ کچھ کٹر عقیدے کے عیسائی تھے جو پست خیال تھے اور ان کو مار باندھ کر بھی گرجا گھر نہیں لایا جا سکتا تھا — ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں سے آمدنی بالکل سمندر میں قطرے کی طرح تھی، بالکل واجبی... عام طور پر اس طرح چندہ جمع کرنا بہت مشکل اور ناخوشگوار تھا اور یہ کہیں بہتر ہوتا کہ پادریوں کو تنخواہ ملتی ۔

اور جہاں تک عام لوگوں کا تعلق ہے... وہ ھیں تو ٹھیک لیکن وہ بھی باڑ پر چڑھکر باغ میں آنے اور سیب چرانے سے نہیں چوکتے، یہ لوگ ان کی چراگاہ میں بھی ایک ایکڑ گھاس کاٹنے کے لئے اتنی ہی اجرت لیتے ھیں جتنی دوسروں سے ۔ بڑے زبردست لوگ ھیں ۔

ماں نے ہر بچے کو ایک بسکٹ دیا جس سے وہ خوش ہو گئے اور ایک قطار باندھ کر کمرے کے باہر نکل گئے۔ پتلون سے قمیص نکل آنے کی وجہ سے سب سے چھوٹے بچے کے پیچھے ایک سفید دم سی لٹک رہی تھی۔

گالینا بچوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کو سوکھتے ہوئے تولیوں کی بو محسوس ہو رہی تھی۔ اور وہ سوچ رہی تھی:

"تو یہ انجام ہے ان کا... یہ لوگ یہاں سے کبھی نہ جائیں گے۔"

ماں نے سب بچوں کو بستر پر لٹا دیا صرف لیدوچکا رہ گئی جو میز کے پاس بیٹھی اپنی بڑی بڑی پرخیال آنکھوں سے ہر چیز کو گھور رہی تھی۔

انھوں نے لیمپ نہیں جلایا اور شفق کی روشنی میں بیٹھے رہے۔ کھلی کھڑکی پر رکھے ہوئے پھولوں کے پودوں کے درمیان سڑک، مکانوں اور شام کی دھندلکی روشنی میں بےترتیبی سے پھیلی ہوئی سیاہ چھتوں کا ایک دھندلا منظر سامنے تھا۔ اس خاموشی اور سکوت میں کبھی کسی کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دے جاتی۔ دور کہیں لڑکیاں گا رہی تھیں اور فاصلے نے ان کی آواز اور بھی سہانی بنادی تھی۔

"نئی کتابوں میں کیا لکھا ہے؟" پادری دمیتری نے اپنی سرخی مائل تیز رنگ سیاہ چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے پوچھا۔ "مجھے یاد ہے کہ مذہبی مدرسے میں طلبا "روسکوئے بوگاتستوو" اخبار کی کاپیاں لاتے تھے — میں بورڈنگ میں رہتا تھا — اور جب ہم بستر پر چلے جاتے، پراکٹر کا راؤنڈ ختم ہو جاتا اور بالکل خاموشی چھا جاتی تو ہم کرسیوں سے ایک حلقہ بنا کر اوپر کمبل ڈال لیتے اور ایک موم‌بتی جلا کر اس طرح بیٹھتے جیسے موسی کو انصاف کےلئے تصویر میں بیٹھا دکھایا گیا ہے۔ ہم پڑھتے، اس کے بعد بحث مباحثہ شروع ہو جاتا۔ ہم خود فراموشی کے عالم میں ایسا ہنگامہ کرتے کہ مردے بھی جاگ اٹھیں۔ ظاہر ہے پکڑے جاتے اور پھر مصیبت آتی۔ اس زمانے میں ہم کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔"

"گالینا، تم کچھ نہیں کھا رہی ہو۔ ذرا کھویا کھاؤ۔ اٹھاؤ نا۔ لیدوچکا تم تھک گئی ہو۔ غالباً تم کو سوجانا چاہئے؟"

''نہیں، اماں، میں تمھارے ساتھ بیٹھونگی،، لڑکی نے کہا اور اس کی آنکھیں شفق کی روشنی میں پہلے سے بڑی معلوم ھونے لگیں - جیسے وہ ماں باپ کے نامعلوم ماضی کو خود دیکھنے کی کوشش کر رھی ھوں -

سماور تقریباً بجھ چکا تھا لیکن اچانک وہ باریک اور غمگین آواز میں پھر گنگنانے لگا جس سے ماں بےچین ھو گئی :

''ڈھکن کہاں ھے؟ ڈھکن کہاں ھے؟،،

جب اس نے ڈھکن ڈھک دیا اور سماور کی گنگناھٹ ختم ھوگئی تو اسنے کہا :

''یہ اچھا شگون نہیں ھے - ،،

''مردوں سے ڈرتی ھو یا کسی اور چیز سے ؟،، پادری دمیتری نے کہا -

''مردے ھوں یا زندے، تمھیں ان کا مذاق نہ اڑا نا چاھئے ... مجھے باتیں بنانےوالے آدمی پسند نہیں،، وہ اچانک تاؤ میں آ گئی - ''پادری، تم ھمیشہ حماقت کی باتیں کرتے ھو- لیمپ جلا دیا جائے - کافی اندھیرا ھے- ،،

''نہیں - مت جلاؤ ،، پادری دمیتری نے کہا - وہ اٹھا، دیوار سے گیتار اتارا اور صوفے پر بیٹھ کر اس کے تار ملانے لگا -

''کم از کم اپنی پیشانی پر صلیب کا نشان تو بنا لو ،، اس کی بیوی نے کہا اور چائے کا سامان میز پر سے اٹھانے لگی -

پادری کھنکھارا، گیتار چھیڑا اور گانے لگا :

خوش کن وادیوں کے درمیان،
پہاڑ کی بلندیوں پر ...

نیچی چھت‌والا کمرہ اس کی سریلی آواز سے گونج اٹھا جو پاٹ‌دار ھونے کے باوجود شیریں اور کچھ غمگین سی تھی -

پرانے، فراموش کردہ گیت میں ایک دلدوز معصومیت، کسی یاد یا پچھتاوے کا لطیف درد تھا — شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ پادری اپنی پاٹ‌دار آواز کا لحاظ کرتے ھوئے مدھم سروں میں گا رھا تھا تاکہ اس رال اور بخورات کی مہک سے بھر پور، چھوٹے، کمرے میں جہاں اس کی جوانی بیت گئی تھی اور امیدوں پر پانی پھر گیا تھا اس کی آواز سما سکے -

ایک چوکس نوجوان سپاہی کی طرح...

شام کے دھندلکے میں اس کی بیوی کا چہرہ نہیں دکھائی دے رہا تھا جو ٹھنڈے سماور کے پاس لیدوچکا کو لپٹائے بیٹھی تھی — اس کے بڑے اور بےڈھنگے خاکے سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ تھک گئی ہو یا بےحس‌وحرکت بیٹھی کچھ سوچ رہی ہو۔

''نہیں، میرے ساتھ ایسا کبھی نہ ہوگا،، گالینا نے سوچا حالانکہ وہ خود نہیں جانتی تھی کہ اس ''ایسا،، کا کیا مطلب ہے۔

پادری نے اپنا گیتار پھر ملایا اور ایک تار بجا کر وائی‌کنگ سرجنٹ کا وہ گیت جو ''سادکو،، اوپیرا میں ہے گانے لگا۔

اب وہ دیہات کا پادری نہ تھا بلکہ شفق کی روشنی میں مذہبی مدرسے کے ایسے طالب علم کا دھندلا سا خاکہ معلوم ہوتا تھا جو یونیور سٹی میں داخلے کی تیاری کر رہا ہو، مذہبی مدرسے کا طالب علم بھی نہیں بلکہ ایکٹر۔ اس وقت آدمی ایک ایسے تھیٹر کا خیال کر سکتا تھا جہاں ہر طرف زرد چہرے نظر آ رہے ہوں اور بالکل محو ہوکر گانے والے کی پاٹ‌دار آواز سن رہے ہوں۔

''بس کافی ہے،، اس کی بیوی نے خفگی کے لہجے میں کہا۔ اس معمولی لیکن مضبوط اور اٹل لہجے میں اتنا زور تھا کہ گانےوالے کی آواز اس میں ڈوب گئی۔ ''یہ لیمپ جلانے کا وقت ہے۔ دیکھو کتنا اندھیرا ہو گیا ہے۔ یہ کبھی نہیں گاتے تھے اور آج گانے لگے تو دم نہیں لیتے۔ کل صبح سویرے ان کو پوزوفکا جاکر اپنے پیسے جمع کرنے ہیں۔،،

لیمپ کی چمنی بجی، ایک دیاسلائی جلی اور کھڑکی پر ایک غم‌انگیز سیاہی دوڑ گئی۔

چھوٹی لڑکی بڑی بڑی روشن آنکھوں سے باپ کو حیرت سے تک رہی تھی۔ پادری دہیتری پر سیاہ عبا بڑا عجیب اور بھدا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے گیتار دیوار پر لٹکا دیا اور لڑکی کا سر تھپ‌تھپا کر کہنے لگا:

''جاؤ، سو جاؤ، لیدوچکا۔،،

گالینا سنسان سڑک پر گھر واپس جا رہی تھی۔ گاؤں کے کنارے کتے بھونک رہے تھے۔ بائیں طرف سنسان مکانوں کے سیاہ خطوط نے تاروں بھرا آسمان نظروں سے چھپا دیا تھا۔

"بہت اچھے لوگ ھیں، دونوں... پادری کی آنکھیں بالکل سیاہ ھیں... اور اس کی بیوی نے ثانوی اسکول تک تعلیم پائی ھے... یہ سب کتنی عجیب باتیں ھیں..."

پھر اس میں متضاد قسم کے خیالات پیدا ھونے لگے — نہیں معلوم کیوں دیہات کے پادری، اس کی بیوی، سفید بطخوں اور گاؤں کی سڑک کے متعلق اس کے خیالات پہلے کچھ اور تھے...

"لیکن کیسے خیالات تھے؟"

وہ اس سوال کا جواب نہیں دے سکی۔

صبح سویرے ھی سے اسکول عورتوں، مردوں اور بچوں سے کھچا کھچ بھرا ھوا تھا۔ برساتی میں بھی مجمع تھا اور کھڑکیوں کے نیچے سے لوگوں کی آوازوں کا غل برابر آ رھا تھا۔

کھڑکیاں کھلی تھیں پھر بھی بڑے سے کلاس روم میں امس تھی۔ عورتیں اپنے تمتماتے ھوئے چہرے رومال کے کونوں سے پونچھ رھی تھیں، مردوں کی ناکوں پر پسینے کے قطرے کانپ رھے تھے اور وہ اپنے سر کے بھیگے بالوں کو کھجا رھے تھے۔

"مہربانی کرکے مجھے گھیرو نہیں۔ اگر تم لوگ میرے اوپر جھکے رھوگے تو میں لکھونگی کس طرح۔"

گالینا کمرے کے بیچ میں مجمع سے اس طرح گھری ھوئی تھی کہ اس کا دکھائی دینا مشکل تھا۔ وہ تھکی اور تمتمائی ھوئی میز کے پاس بیٹھی رولدار رجسٹر میں نام لکھ رھی تھی۔

"نام؟ خاندانی نام؟ عمر؟"

ایک عورت گھوڑ مونہی تھی اپنے چھوٹے لڑکے کو میز کی طرف ڈھکیل رھی تھی اور ھر ھر لفظ پر اپنا سر ھلاتی تھی جیسے کوا کوئی چیز چگتے وقت کرتا ھے — وہ ھر بات اپنی مرضی کے مطابق کرانا چاھتی تھی:

"فیلیمونکا... لکھ لو... یہی اس کا نام ھے... کیا؟ یہ شریر ھے... پڑوسیوں کی زندگی اجیرن کر رکھی ھے... کیا؟ ھاں، یہ چھ سال کا ھے، اور وہ زیما نکولا * میں سات سال کا ھوجائیگا۔ کیا؟ میں

---

* زیما نکولا۔ پرانے روس میں نکولا کے دو تہوار ھوتے تھے: زیما نکولا جاڑوں میں ٦ دسمبر کو اور لیتنی نکولا گرمیوں میں ۹ مئی کو۔

اس کو کیا کروں۔ ہونہہ؟ شوہر نہیں... بیوہ ہوں... لاچار... یہ اسکول جائے... اگر یہ دن بھر اسکول میں رہے تو میرا دن اچھی طرح کٹے... مجھے تو ہر وقت اسی پر نگاہ رکھنی پڑتی ہے...''

''بچے اسکول پڑھنے کے لئے بھیجے جاتے ہیں، دیکھ بھال کے لئے نہیں... یہ ابھی بہت چھوٹا ہے میں اس کو نہیں لے سکتی۔ ابھی تو یہ سات سال کا بھی نہیں ہے۔ ''

کوے نے پھر گردن ہلانا شروع کر دی۔ اس کی ناک کوے کی چونچ کی طرح تھی اور گرمی کے باوجود شال میں لپٹا ہوا سر بھی کوے ہی کی طرح معلوم ہوتا تھا۔

''تم کیسی باتیں کرتی ہو؟ میں آخر اس کو کیا کروں؟ اسے بڑے لڑکوں کے سپرد کر دینا... بڑے لڑکے ہمیشہ کارآمد ہوتے ہیں۔ وہ گھوڑوں کی دیکھبھال کر سکتے ہیں اور کھیتوں میں بھی کام کرتے ہیں۔ گھر پر بھی کافی کام رہتا ہے۔ ہم کو بڑے لڑکوں کی ضرورت ...''

''میں تم سے کہہ چکی۔ اب اس میں طےتوڑ کا کوئی سوال نہیں ہے... قاعدے کے مطابق سات سال سے کم عمر کے بچوں کو نہیں لے سکتی۔'' کوے کی گردن ملتی رہی۔ ''اچھا... اچھا...'' وہ بڑبڑائی۔ ''... اور تمہارے فیلیمون کی عمر ابھی صرف چھ سال ہے۔ دوسرا کون ہے؟''

عورت نے اس کی طرف سب کچھ سمجھنےوالی معافی آمیز نگاہوں سے دیکھا، اس آدمی کی طرف سے پیٹھ موڑ کر جو اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا، اور ایک لڑکے کا ہاتھ پکڑے کھڑا تھا، وہ نیچے جھکی، اپنا اسکرٹ اٹھایا اور پیٹی کوٹ سے ایک گندہ رومال نکالا جس میں دوہری گرہ لگی تھی۔ میز کے سہارے اپنا پیٹ دبا کر اس نے گرہیں کھولنے کی کوشش کی اور آخرکار ان کو ڈھیلا کر لیا۔ پھر کچھ سکوں کے بیچ سے تہہ کیا ہوا ایک روبل کا نوٹ نکالا جو ایسا گندہ تھا کہ پہچانا نہیں جاتا تھا۔ اس نے بڑے مزے میں نوٹ کی تہیں کھولیں اور رجسٹر پر رکھ کر اس کا کونہ ہاتھ سے پکڑے رہی کہ کہیں اڑ نہ جائے۔ پھر مربیانہ اور فتحمندانہ لہجے میں بولی :

''یہ لو۔ ''

گالینا پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف گھورنے لگی۔

''یہ کیا ہے؟''
عورت نے اپنا اسکرٹ اٹھایا اور دوہری گرہ والا رومال پھر رکھ لیا۔
''جب ہم کرسمس میں بطخ پکائیں گے تو تمہارے لئے بھی لائیں گے اور تکیہ کے لئے اس کے پر بھی حالانکہ تکیہ چھوٹی ہی ہوگی۔ میں خود تمہارے لئے تکیہ بنا دونگی... ہے نا؟''
اب گالینا سمجھ گئی اور صرف اس کا چہرہ ہی نہیں بلکہ اس کے کان اور بالوں کی لٹوں کے نیچے تک گردن سرخ ہو گئی۔
''نکلو یہاں سے! فوراً نکل جاؤ! کیا مطلب ہے تمہارا؟ تمہیں شرم نہیں آتی...'' اس نے گندہ روبل رجسٹر پر سے ہاتھ سے ہٹا دیا۔
''تمہیں شرم آنی چاہئے۔''
عورت نے میز کے کونے سے نوٹ اٹھایا اور چاروں طرف دیکھا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ناراض تھی یا بدحواس۔
''تم کیا کر رہی ہو؟ تم کہیں کچھ پی تو نہیں گئی ہو؟ روپیہ ادھر ادھر کیوں پھینک رہی ہو؟ بڑی پیسے والی ہو... ہے نا؟''
''جاؤ، یہاں سے چلی جاؤ! اس سے کہو کہ یہاں سے چلی جائے!''
''تم سے کہا جا رہا ہے تو جاتی کیوں نہیں ہو'' چاروں طرف کھڑے ہوئے آدمیوں نے چلا کر کہا۔ ''تم نے سب لوگوں کے سامنے ایسی بات کیوں کی!.. ارے کسی کلرک کو بھی دوسروں کی موجودگی میں پیسے نہیں دیتے۔ فوراً پکڑ جاؤ۔ بھلا کوئی ایسی بات کرتا ہے؟''
اور پھر اس کی میز کے چاروں طرف ان عورتوں اور مردوں کا شور گونجنے لگا جن کی آوازوں کو کھلی ہوا اور کھیتوں کی فضا نے بھاری بنا دیا تھا۔ چاروں طرف افینوگینوف، تالدیکینا، زاسوپونیکوف اور اسکوروسیسلوف تھے۔
آخر یہ سب کہاں سے آگئے تھے۔ گاؤں تو اتنا بڑا نہ تھا۔ غالباً یہ لوگ قریب کے گاؤں سے آئے تھے... اس کا حلق خشک ہو رہا تھا اور اس کے منہ کا مزا بیماروں جیسا میٹھا ہو گیا تھا۔
ارے خدا، یہ سب کب ختم ہوگا!
آخرکار جب وہ ۹۰ بچوں کا داخلہ کر چکی تو اس نے کہا کہ بس اتنے کافی ہیں۔

جن آدمیوں کے بچے نہیں لئے گئے تھے انھوں نے آہیں بھریں، اس کے متعلق ذرا دیر چاؤں چاؤں کی اور پھر اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

عورتیں تھوڑی دیر تک رکی رہیں۔ انھوں‌نے بھی آہیں بھریں بلکہ کچھ تو رو بھی پڑیں اور پھر اپنی لال لال آنکھیں پونچھکر چلی گئیں۔ درجہ خالی ہوگیا اور اس کا گندہ، گردآلود فرش نظر آنے لگا۔ فضا میں بھی ابھی تک گھٹن تھی۔تین عورتیں باقی رہ گئیں۔ ان کے ساتھ تین لڑکیاں اور ایک لڑکا تھا۔

دو عورتیں تو بالکل خاموش اور الگ تھلگ کھڑی تھیں۔ ان کو خود بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کس بات کی منتظر ہیں لیکن تیسری نے جو حاملہ ہونے کی وجہ سے گول مٹول ہو گئی تھی اور ایک گندہ بچہ گود میں لئے تھی چیخنا شروع کر دیا:

"یہ کیا بات ہے؟ اس نے کچھ لوگوں کے بچوں کا داخلہ کر لیا لیکن ہمارے بچوں کے لئے جگہ نہیں ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ فروسکا کی ماں کی شادی نہیں ہوئی ہے لیکن اس نے فروسکا کو لے لیا، ان بچوں کو نہیں لیتی جو حلالی ہیں اور اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتے ہیں۔ سنتی ہو، تم خود اپنے قانون قاعدے بنا رہی ہو... تمھاری ایسی بہت سی ہم کو یہاں قانون قاعدے سکھانے آتی ہیں۔ آخر تمام امیر بچے پڑھنا لکھنا کیوں سیکھ لیتے ہیں اور غریبوں کے لئے کیوں جگہ نہیں ہوتی؟ یہ کوئی استانی ہے۔ ذرا سی لونڈیا۔ اگر دوکاندار چپکے سے ایک کنگھا اور کچھ فیتے تھمادے تو اس کے ساتھ رات بسر کرنے کو تیار ہو جائےگی۔ اولیانوفکا کا استاد تو سب کا داخلہ کر لیتا ہے اور یہ لونڈیا سارے ٹھسے کی مری جاتی ہے — ہائے ہائے... اب میں اس لونڈے کا کیا کروں؟.." پھر وہ غصے میں پھوٹ‌پھوٹ کررو نے لگی۔

"تمھاری یہ ہمت... تم کیا اڑا رہی ہو... واسیلی، بلانا تو بڑے... ان کو لے جاؤ یہاں سے!.."

"اخاہ!" عورت غصے میں چیخی اور گود کے بچے کو اس طرح ہلایا جیسے یہ سب اس کی غلطی سے ہو رہا ہو۔ "اچھا۔ تو تمھیں یہ سب پسند نہیں!.. ہمارا خون چوس‌چوس کر موٹی ہوتی ہو... ایسی اچھی جگہ مل گئی تو ہوش میں نہیں رہیں..."

دن یکے بعد دیگرے یکساں گذرتے گئے۔ ہر صبح وہ دیکھتی کہ سورج نسبتاً دیر میں نکلتا ہے اور گاؤں کے آخری گھر کے پیچھے سے ذرا دائیں طرف ہٹ کر اس کی لمبی اور ترچھی کرنیں اس کی کھڑکی پر پڑتی ہیں۔ ہر صبح دیوار کی دوسری طرف سے غل غپاڑے، چیخوں، پیر پٹکنے اور ہنگامے کی آوازیں آتیں اور درجہ میں اس کے داخل ہوتے ہوتے ہوا میں گندگی اور گھٹن پیدا ہو جاتی۔

پچاس بچوں کی آنکھیں اس کو گھورتیں۔ ان کے دلوں تک رسائی کا ذریعہ اسے ڈھونڈھنا پڑتا۔ اس کو کسی نہ کسی طرح سبق شروع ہی کرنا ہوتا۔ نظری طریقۂ تعلیم — ٹھیک رہے گا۔

اس نے کتاب کھولی، ایک درخت کی تصویر نکالی اور اس کو اس طرح اوپر اٹھایا کہ سب بچے اسے دیکھ سکیں۔ پھر اس نے کہا:

''بچو! تم اس تصویر میں کیا دیکھتے ہو؟''

پچاسوں بچوں نے کتاب کو نہیں بلکہ اس کو دیکھا اور دم سادھے بیٹھے رہے۔

''تصویر میں کیا ہے؟ اچھا، بتاؤ۔ کیا یہ گھر ہے؟''

''گھر''، پچاس بچکانی آوازوں نے کورس میں جواب دیا جیسے کوئی صدائے بازگشت ہو۔

''یہ کس قسم کا گھر ہے؟ اسے اچھی طرح دیکھو۔ کبھی تم نے ایسا بھی گھر دیکھا ہے؟ اچھا۔ تو پھر یہ کیا ہے؟''

پھر سخت خاموشی چھا گئی، پورے پچاسوں بچے اس کی طرف ٹکٹکی لگائے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

''اچھا۔ یہ کیا ہے؟ درخت؟''

''درخت!..''، چاروں طرف سے کورس میں آواز آئی۔

''شاباش۔ اچھا اب دیکھو یہ کیا ہے؟''

پھر سب اس کو چپ چاپ دیکھنے لگے۔

''اس کو اچھی طرح دیکھو۔ تمہارے سب کے آنکھیں ہیں۔ یہ کیا ہے؟''

خاموشی۔

میرے خدا۔ کیسے گونگے، کاٹھ کے الو ہیں...

''بتاؤ۔ کیا یہ چڑیا کی طرح ہے؟''

''چڑیا کی طرح!..'' پھر پچاسوں نے صدائے بازگشت کی طرح ایک ساتھ کہا۔

''یہ کس طرح کی چڑیا ہے؟ کیا تم نے کبھی کوئی چڑیا بموں میں بندھی اور گردن میں پٹا پڑی ہوئی دیکھی ہے جس کے پیچھے گاڑی لگی ہو۔ دیکھو۔ اب میں نے تمھیں بتا دیا ہے۔ بتاؤ، یہ کیا ہے؟''

پھر سب اس کی طرف خاموش ٹکٹکی لگائے دیکھتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چاہے ان کی جان جاتی رہے لیکن ان کے منہ سے ایک لفظ نہ نکلے گا۔

''تمھیں دکھائی نہیں دیتا کہ یہ گھوڑا ہے؟ کیا تم نے گھوڑے کبھی نہیں دیکھے ہیں؟''

''گھوڑا'' سب نے اس سے اتفاق کیا۔

وہ ان کے ساتھ اپنی جان کھپاتے کھپاتے تھک گئی، اس کی آواز بیٹھ گئی پھر بھی وہ یا تو مورتیوں کی طرح گم صم بیٹھے رہتے یا اس کے الفاظ بالکل صدائے بازگشت کی طرح دہرا دیتے۔

پڑھانے کے فن میں اسے اچھے نمبر ملے تھے۔ اس نے ٹیچر اور درجہ کی استانی کی موجودگی میں تختۂ سیاہ پر لکھ کر سبق پڑھائے تھے — یہ تمام چیزیں اسکول کے لئے بہت ضروری اور اہم تھیں لیکن یہاں یہ قطعی غیر ضروری یا بالکل بےکار تھیں۔ اب اس کا سامنا بے کیف، کاٹھ جیسے چہروں کی ایک نا قابل تسخیر دیوار سے تھا۔

ان سب باتوں کا پڑھانے کے فن، اس کی ثانوی اسکول اور آٹھویں درجے کی تعلیم سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہاں اس کو خود سوچکر کوئی طریقہ تلاش کرنا تھا جس سے گاؤدی پن اور ضد کا یہ مضبوط قلعہ فتح ہو سکے۔

انٹرول میں گالینا ذرا دیر کے لئے اپنے کمرے میں چلی گئی — اس کا سر چکرا رہا تھا اور اس کی آنکھوں کے سامنے حلقے سے ناچ رہے تھے۔ درجے میں بڑے زور کا ہنگامہ ہو رہا تھا۔ فرش چرچرا رہا تھا اور ہاہو، چیخوں اور قہقہوں سے دیواریں ہل رہی تھیں۔

وہ پریشان ہو کر درجے میں لوٹ آئی۔

اس نے اونچے درجے کے ایک لڑکے کو بلایا جو ایک سال سے اسکول میں پڑھ رہا تھا۔

''یہ لو اور پڑھو۔''

لڑکے نے اپنا چہرہ سکیڑ کر زور زور سے پڑھنا شروع کیا:
''اور... اور... ک... ک... کوا... بھونکا... پھاٹک پر...،،
''کوا؟ کیسا کوا؟ کتا!،،
لڑکا اپنے باپ کے لمبے بوٹ پہنے تھا۔ وہ گالینا کی طرف اس طرح گھورنے لگا جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو۔
''تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ اچھا اس کو ٹھیک ٹھیک کون بتا سکتا ہے؟،،
''میں بتا سکتی ہوں،، ایک چھوٹی سی لڑکی جس کے چہرہ پر جھائیاں تھیں بولی۔ اس کی سن جیسی بھویں جوش سے کھنچی ہوئی تھیں۔
''اچھا، بتاؤ!،،
''بکری۔،،
''کیسی بکری؟ بھلا اس سے بکری کا کیا تعلق؟،،
جو دیوار اس کے اور بچوں کے درمیان کھڑی تھی اب اچانک ہٹ گئی۔ لڑکے اپنی جگہوں پر سے اچھل پڑے اور ڈسکوں پر چڑھ گئے۔ ایک دوسرے سے گتھ سے گئے۔ کتابیں اور قلم پھینک دئیے اور مختلف آوازوں میں چلائے:
''ان کے صحن میں ایک کتا رہتا ہے اور وہ بکری کے سوا کسی پر نہیں بھونکتا۔ اگر کوئی بکری قریب آجاتی ہے تو وہ بھونکنے لگتا ہے۔،،
''یہ سب اتنے بھدے کپڑے کیوں پہنے ہیں؟،، وہ سوچنے لگی۔ ''روسی اور یوکرینی لباس بڑے خوبصورت ہوتے ہیں۔ یہاں یوکرینی بھی ہیں۔ یہ ایسا دورافتادہ اور کوردہ مقام ہے کہ آدمی یہاں سے شہر تین سال میں پہنچ سکتا ہے پھر بھی ان لوگوں نے لڑکیوں کو بھدے شہری بلاؤز پہنا رکھے ہیں۔ ان میں یہ بات کہاں سے آئی؟ ایسا کیوں ہے؟،،
درجے کو پھر خاموش کرنے میں اسے کافی وقت لگا۔ حتی کہ واسیلی تک یہ دیکھنے آگیا کہ آخر کیا گڑبڑ ہے۔ اس کی آمد سے بچوں کو ایک اور تفریح کا سامان مل گیا اور وہ بے تحاشا چلا اٹھے۔
''کانا... کانا... لے بھاگا ایک آنہ!،،..

انٹرول میں واسیلی لڑکوں کے کان اور بال خوب کھینچتا تھا اور ایک آدھ لات بھی رسید کر دیتا تھا لیکن نہ معلوم کیوں بچے اس کی شکایت نہیں کرتے تھے۔ گالینا کو اس کے متعلق معلوم ہوا تو اس نے واسیلی کو پھٹکارا کہ اگر اس نے کسی لڑکے کو ذرا چھوا بھی تو اس کو برخاست کرا دیگی۔

واسیلی نے جواب تو نہیں دیا لیکن اس کی طرف گھور کر دیکھا جس کا مطلب یہ ہو سکتا تھا کہ اس کو گالینا پر افسوس بھی ہے اور غصہ بھی۔

اس کندذہن اور ہنگامہ‌پرور غول کو وہ ایک دن میں کورس کا دسواں حصہ بھی نہ پڑھا پاتی۔ وہ اسکول کے بعد بھی بچوں کو روکتی اور ان کے دماغ میں باتیں ٹھونسنے کی کوشش کرتی یہاں تک کہ بچوں اور اس کے دونوں کے دماغ بیکار ہو جاتے۔ وہ پچھڑے ہوئے بچوں کو کھانے کے بعد پھر بلاتی اور شام کے وقت اس کا سر بالکل بیر شراب کے کڑھاؤ کی طرح ابلنے لگتا اور وہ مشکل سے اپنے کو گھسیٹ کر بستر تک لے جاتی۔

پڑھنے یا سوچنے کے لئے کوئی وقت ہی نہ تھا۔

تاریکی کے ساتھ سناٹا بھی آتا۔ دیہات کا سناٹا جس میں تنہائی کا احساس ہوتا اور آرزؤں کا ریلا۔

تکیہ پر سر رکھتے ہی گالینا کو گہری اور بےخبر نیند گھیر لیتی اور پھر اچانک اس کو دھکا سا لگتا، آدھی رات کو وہ جگ اٹھتی اور پڑی پڑی اندھیرے میں گھورنے اور سناٹے میں سننے کی کوشش کرتی رہتی۔

”بچے زندگی کے پھول ہیں... کس نے یہ کہا تھا؟.. بکواس... لوگ اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں...“

اس نے ایک آہ بھری۔ پھر سب باتیں توقع کے خلاف ہوئیں۔ ہر چیز الٹی ہوئی۔ بالکل اس کی توقع کے خلاف۔ شہروں میں اخباروں کے مضامین اور کتابوں میں اسکولوں کی کمی کے متعلق بڑے زور شور سے لکھا جاتا ہے۔ وہاں یہ سب باتیں بالکل سیدھی سادی اور صاف معلوم ہوتی ہیں کہ ہر خزاں میں بہت سے بچے اسکولوں میں داخل نہیں ہو سکتے کیونکہ جگہ نہیں ہوتی۔ بس ختم۔

لیکن یہاں — ایک حاملہ عورت اپنا بچہ لائی۔ اس کی زندگی کا خاص ڈھنگ ہے۔ اس کے اپنے حالات، مصیبتیں اور تکلیفیں ہیں لیکن اس کی تمام باتیں اسکولوں کی کمی سے کسی طرح کا تعلق نہیں رکھتیں۔

''ہمارا خون چوس چوس کر موٹی ہوتی ہو!،، اس عورت نے کہا تھا۔

''کون موٹا ہوتا ہے؟ ارے۔ اس کا مطلب مجھ سے تھا!.. میرے خدا...،،

گالینانے کروٹ لی اور سو تک گنتی گنی۔

گاؤں کے پادری کی آنکھیں بھی سیاہ ہیں۔ پہلے وہ بڑی باقاعد گی سے آکر بچوں کو مذہبی تعلیم دیتا تھا۔ کبھی کبھی وہ شام کو آتا تھا، چائے پینے اور باتیں کرنے میں کچھ وقت کٹ جاتا تھا۔

اس نے آخر یہ عبا قبا کیوں پہنا؟ اس پر تو ذرا بھی نہیں سجتی۔ اس کو مضبوط ہونا چاہئے، ایسے چوڑے چکلے شانوں‌والا جو ٹھہرا ہے... پھر اس نے سبق میں ناغے شروع کر دئے۔ وہ گرجا گھر کے چوکیدار سے کہلا دیتا کہ گالینا مذہبی سبق خود پڑھ لے — یا تو گرجا گھر میں کوئی سروس ہوتی یا پادری کو کسی دوسرے گاؤں جانا ہوتا۔

اس نے یونیورسٹی میں داخلہ نہیں لیا، غلطی کی... اور پھر اس‌نے گالینا کے یہاں آنا بند کر دیا۔ لیکن پھر بھی وہ جہاں کہیں ملتا دوستانہ طریقہ سے پیش آتا اور ہاتھ ملاتا۔ ...اگر وہ غور سے دیکھتی تو اسے پتہ چلتا کہ بادلوں کے ٹکڑے کھڑکی کے شیشے کے سامنے سے آہستہ آہستہ رینگ رہے ہیں...

پھر بارش شروع ہو گئی۔ چھت پر اس کی پٹر پٹر ہو رہی تھی۔ ہوا بوندوں کو کھڑکیوں کے شیشوں تک اڑا کر لاتی اور وہاں ان کو ٹکرا کر توڑ دیتی۔ اس کی کھڑکی کے سامنے برچ کے ننگے درخت بےاختیار اپنے سر ہلاتے اور ہوا کے سامنے جھک جاتے۔ بارش کی دھند میں اب اسے سڑک، جھونپڑیاں، کنواں اور سفید بطخیں نہیں نظر آرہی تھیں۔

شہر میں تو بارش کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کرتا ہے۔ وہاں بلند بالا مکانات، تیز رفتار ٹراموں، ٹرام کی گھنٹیوں، ٹرام کے اوپر بجلی

کے تاروں سے نکلتی ہوئی نیلی چنگاریوں، ٹاپوں کی آوازوں، دھکم پیل مجمع اور دوکانوں کی کھڑکیوں کی جھلملاتی روشنی (جو تنگ فٹ پاتھ تک مشکل سے پہنچتی ہے) میں وہ چھپ جاتی ہے — لیکن یہاں تو بارش ہر چیز پر حاوی ہے۔ وہ ہر چیز کو چھپا لیتی ہے۔ یہاں تک کہ بارش سے دھلے ہوئے برچ کے درخت بھی جھک جاتے ہیں اور بارش ہوتی رہتی ہے۔ چھتوں اور کھڑکیوں پر اس کی پٹرپٹر متواتر سنائی دیتی ہے۔ اور وہ دیواروں کو کوٹتی پیٹتی رہتی ہے لیکن اس کی کوئی صورت شکل نہیں ہوتی۔ بالکل دھندلی اور غیر واضح سی شے۔ وہ ننگے کھیتوں اور خالی جنگلوں میں بھی اپنا زور اسی طرح دکھاتی ہے حتی کہ وہ ان اکادکا پتیوں کو بھی لے ڈالتی ہے جو درختوں کے ٹھنٹھوں میں کہیں نیچے پڑی رہ جاتی ہیں۔

لڑکے سر سے پیر تک کیچڑ میں لتھڑے ہوئے آتے اور جب وہ کمرہ چھوڑتے تو فرش نظر نہ آتا۔

کبھی کبھی جب ہوا اس دھندلی بارش کو اڑا لے جاتی تو ہر چیز سیاہ نظر آتی — سنسان سڑک پر گوندی ہوئی کیچڑ، بھیگی ہوئی جھونپڑیاں، کنوئیں پر بیٹھا ہوا کوا اور ایک ہی سمت اڑتے ہوئے نم، نیچے بادلوں کے ٹکڑے۔

شاذونادر کوئی کسان دکھائی دے جاتا۔ اس کے سر پر بھیگی ہوئی ٹوپی ہوتی۔ داڑھی تر اور کوٹ کی پیٹی خوب کسی بندھی ہوتی۔ وہ اپنا لنگڑا گھوڑا لئے کیچڑ میں لڑکھڑاتا گذرتا اور جہاں تک ممکن ہوتا باڑوں سے مل کر چلتا اور پھر سڑک پر سوائے سیاہ کیچڑ کے سمندر، ترچھی جھونپڑیوں اور کنوئیں کے سیاہ شہتیر کے کچھ اور نہ دکھائی دیتا۔ اس پورے منظر پر پھر بارش اپنا دھندلا پردہ ڈال دیتی۔

حتی کہ وہ بچے بھی جو اسکول کے مختصر وقت میں شوروغل کرتے رہتے اور فرش پر کیچڑ کی تہہ چھوڑ جاتے اس ویرانی اور تنہائی کے احساس کو نہ توڑ سکتے کیونکہ ان کی بھی ہر بات یکساں تھی خواہ آج ہو یا کل۔ ہفتوں اور مہینوں تک تمام باتیں یکساں رہتیں۔

ایسی شامیں مطالعے میں اچھی طرح کٹ جاتیں۔ گالینا بستر پر لیٹ جاتی، لیمپ قریب کر لیتی اور اپنے کو ایک دوسری فضا اور

مختلف حالات میں محو کر لیتی۔ بڑی فن‌کارانہ اور جان‌دار چیزوں کا تصور کرتی۔

اس کے دوست اکثر اس کو شہر سے کتابیں، رسالے اور اخبار بھیجتے رہتے۔ اور کبھی کبھی تو ان کے پلندے کے پلندے آجاتے۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کتاب چھونے کو دل ہی نہ چاہتا۔ وہ غیردلچسپ اور بےجان معلوم ہوتیں۔ تب شفق کے دھندلکے میں وہ بڑی تنہائی محسوس کرتی اور اس پر ایک دہشت سی طاری ہو جاتی...

واسیلی چھوٹا سماور لایا جو اپنی کبرسنی کی وجہ سے سبز پڑ گیا تھا اور اس پر جابجا عمر رفتہ کے نشان تھے۔ اس سے بھاپ کے بادل باغیانہ انداز میں نکل رہے تھے۔ واسیلی نے سماور میز پر رکھا۔ کوئلے پھونکے اور اس پانی کو پونچھا جو ابل کر ڈھکن کے اوپر آ گیا تھا اور پھر دروازے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے جس کی وجہ سے وہ مودب اور ساتھ ہی باوقار معلوم ہوتا تھا۔

''بارش تو جانے کا نام ہی نہیں لیتی۔''

گالینا خوش تھی کہ واسیلی سماور رکھ کر چلا نہیں گیا۔

''واسیلی، اپنا پیالہ لاؤ۔ میں تمھیں چائے دونگی۔''

''شکریہ۔ لیکن میں بعد کو پی‌لونگا،'' اس نے سردمہری سے کہا، پھر بھی اپنا پیالہ لے آیا۔

''واقعی،'' اس نے کہنا شروع کیا ''اس گاؤں میں بڑی جہالت ہے، آدمی کہیں جا آ نہیں سکتا، کسان دولت مند ہیں لیکن وہ گلے گلے تک گندگی میں رہتے ہیں۔''

''یہ آدمی بھی تنہائی محسوس کرتا ہے،'' گالینا نے اس کا بڑا سا ٹوٹا پھوٹا پیالہ چائے سے بھرتے ہوئے سوچا۔

''یہ رہی تمھاری چائے، واسیلی۔''

واسیلی نے پیالہ لے لیا۔ اس نے اپنی پھوٹی آنکھ سے پروقار انداز میں اور اپنی سلامت آنکھ سے ادب کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔

وہ دروازے کے قریب ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ طشتری میں تھوڑی سی چائے انڈیلی اور شکر کا ایک ٹکڑا اپنی زبان سے چوستا ہوا چائے سڑکنے لگا۔

دیوار پر اس کا بےڈھنگا سا سایہ نظر آ رہا تھا۔

پہلے گالینا واسیلی کو پسند نہیں کرتی تھی ۔ وہ اس بات پر خاص طور سے ناراض تھی کہ وہ بچوں کے کان اور بال کھینچتا تھا ۔ لیکن اب واسیلی یہ کام خاموشی سے کرتا تھا ۔ اس کو بچوں سے کوئی کینہ نہ تھا، وہ محض ہنگامہ روکنے کے لئے ایسا کرتا تھا ۔ اب بھی بچے اس کی شکایت نہیں کرتے تھے ۔

''یہاں ایک نوجوان استانی تھی، بہت صاف ستھری، نازک بدن ۔ اس کو رنج و غم نے موت کے گھاٹ اتار دیا ۔ ''

''موت؟ کے گھاٹ اتار دیا؟''

''ہاں، یہاں ایک آٹا مل تھی اور اس آٹامل میں ایک انجنیر تھا ۔ بڑا بانکا اور زندہ‌دل ۔ بالکل تصویر تھا ۔ مل کا کام بڑا گندہ ہوتا ہے لیکن وہ بڑی احتیاط کرتا تھا ۔ ہمیشہ صاف ستھرا رہتا ۔ اپنے جوتے رومال سے صاف کرتا رہتا ۔ اچھا، تو وہ استانی کے پاس آنے جانے لگا ۔ اور استانی بھی بس اس پر فدا تھی ۔ اس کی صورت دیکھ کر جیتی تھی ۔ ہر شخص استانی کو پسند کرتا تھا ۔ اس سے محبت کرتا تھا ۔ آپ تو جانتی ہی ہیں کہ یہاں کے لوگ کیسے ہیں لیکن استانی کے خلاف کبھی کسی‌نے ایک لفظ بھی نہیں کہا ۔ پھر انجنیر نے اس کے یہاں آنا بند کر دیا اور بس ایک دن اس سے رخصت ہونے آیا ۔ 'خدا حافظ، آننا الیکساندروونا'، اس نے کہا ۔ اور وہ اسی جگہ دیوار کے پٹ سے لگی کھڑی رہ گئی''، واسیلی نے اپنی طشتری رکھ دی اور کواڑ کے پٹ پر جھک گیا ۔ اس‌نے اپنی پھوٹی آنکھ بند کرلی ۔ ''وہ بالکل سفید ہوگئی ۔ پھر وہ بچوں کے پاس چلی گئی ۔ اس کو اپنا کام کرنا تھا لیکن وہ باربار منہ پھیر کر اپنے آنسو پونچھتی ۔ راتوں کو وہ نہ سوتی اور صبح تک اس کی کھڑکی سے روشنی جلتی دکھائی دیتی رہتی ۔ ایک دن میں‌نے کھڑکی سے جھانکا ۔ مجھے خیال ہوا کہ کہیں لیمپ سے آگ تو نہیں لگ گئی ہے ۔ پردہ ذرا ایک طرف ہٹا ہوا تھا ۔ میں نے دیکھا کہ استانی گھٹنوں کے بل فرش پر جھکی ہے، اس کا سر بستر پر ہے اور پورا جسم اینٹھ رہا ہے... ہم نے اس کو خزاں کے موسم میں سپرد خاک کر دیا ...''

واسیلی کا سایہ بھی اسی طرح تھا، گڑمڑا کر گیند بن گیا تھا اور اس کی جنبشوں کے ساتھ آہستہ آہستہ حرکت کر رہا تھا ۔ تاریک کھڑکی پر بارش کی آواز ہو رہی تھی ۔

''اس کے بعد ایک مرد ٹیچر آیا ۔ اس کے بال بچے تھے ۔ لیکن اس سے پہلے ایک عورت تھی، سن دار ۔ وہ جئی کی کھیر بہت پسند کرتی تھی ۔ وہ اکثر چولھے کے سامنے کھڑی ہو کر کھیر گھوٹتی ۔ شاید اس کو کوئی بیماری تھی ۔ وہ یہاں چند مہینے رہی اور پھر اس کا تبادلہ ہو گیا ۔ اب وہ جوان آیا ۔ بڑا زندہ دل تھا ۔ اس کی شادی ہوئی ۔ اس کی بیوی بڑی خوش‌مزاج اور شوخ تھی ۔ اس کے گال بالکل گلاب جیسے تھے ۔ پھر بچے پیدا ہونے شروع ہوئے اور پیدا ہی ہوتے گئے ۔ ہر سال ایک پورا کمرہ بھر گیا اور ٹیچر کی بیوی بالکل ہڈی چمڑا رہ گئی اور بدصورت ہو گئی ۔''

''یہ سب اسی کمرے میں ہوا؟''

''ہاں، اسی کمرے میں، اور پھر افسروں نے اس کو ستانا شروع کیا ۔ اس سے کہا کہ وہ یہاں سے نکلے اور اپنے خاندان کے لئے گھر ڈھونڈھے ۔ اس نے زانو ٹیک کر ان سے التجا کی کہ آخر وہ دو گھروں کی کفالت کس طرح کریگا ۔ اگر کوئی بچہ چیختا تو اس کی چیخ فوراً روک دی جاتی — وہ اس کے منہ میں تکیہ ٹھونس دیتے اور وہ بالکل چپ ہو جاتا ۔ یہ سب باتیں کتنی ڈراؤنی تھیں ۔ میں یہاں چھبیس سال سے ہوں اور میں نے بہت کچھ دیکھا ہے ۔ میں فوج کی نوکری ختم کرنے کے بعد یہاں آیا تھا ۔''

واسیلی کی زندگی کی بھی اپنی کہانی تھی ۔ دوسروں کی طرح نہیں بلکہ مخصوص ۔ اس کا اپنا مخصوص سایہ بھی تھا ۔ کوبڑا سا یہ نہیں بلکہ ایک گیند کی طرح گول مول اور بالکل واسیلی کی طرح اداس اور خاموش ۔

اس کے بچے تھے، وہ مر گئے ۔ اس کی بیوی مر گئی اور اس کے عزیز اور قریبی جان پہچان کے لوگ بھی یا تو مر گئے یا کہیں چلے گئے — ایک سائبیریا کو، دوسرا تولا کو اور تیسرا ماسکو کو حتی کہ کوئی بھی گاؤں میں باقی نہیں رہ گیا اور وہ پرانے درخت کے ٹھنٹھ کی طرح تنہا رہ گیا ۔ نہ تو اس کا کوئی ملنےوالا رہا اور نہ کوئی گھر ۔ کوئی ایسا عزیز قریب بھی نہ تھا جو آخری وقت آنے پر اسکی آنکھیں موند سکے ۔ چھبیس سال وہ اسکول ہی میں رہا تھا ۔ یہی اس کا گھر، اس کا خاندان اور دوست تھا ۔ اسی وجہ سے چاہے جتنی تبدیلیاں ہوئیں، چاہے کوئی بھی آیا، بڈھا یا جوان، سخت یا نرم، لڑکی یا شادی‌شدہ عورت،

بال بچوں والے باپ یا تنہا سرد اس کا برتاؤ سب کے ساتھ یکساں رہا۔ وہ سب کا سامان گاڑی سے اتارتا، خاموشی سے اسکول کے اندر لے جاتا اور ایک لفظ کہے بغیر اس طرح سماور لے آتا جیسے وہ ان سب لوگوں کو ایک زمانے سے جانتا تھا اور ان سے ہر موضوع پر گفتگو کرکے تھک چکا تھا۔

سردی بڑھتی گئی۔ ہر چیز زیادہ سخت اور مضبوط ہوتی گئی۔ کیچڑ بھی سخت پڑ گئی اور معلوم ہوتا تھا کہ بہار تک اسی طرح رہیگی۔ برف کے نیچے پڑی رہےگی۔ جھونپڑیاں بھی اب زیادہ ٹھوس معلوم ہونے لگیں، صبح کو ان کی چھتیں کہرے سے سفید ہو جاتی تھیں۔

ننگے اور ٹھنڈے درخت بھی صبح کو سفید ہو جاتے اور کنوئیں کا کٹھرا اور باڑوں کی چوٹیاں سفید نظر آتیں، جوھڑوں میں برف کی ہلکی تہہ بطخوں کے لال لال پنجوں کے نیچے کرکرا کر ٹوٹتی، کتوں کے بھونکنے کی آواز دور سے سنائی دیتی، اتنی صاف اور گونج دار جیسے ہوا کو نازک شیشے کی طرح توڑ کر چکناچور کر دیگی۔

اب سورج جھونپڑیوں کے اوپر زیادہ بلند نہ ہوتا لیکن صاف ہوتا، اس میں آب‌وتاب ہوتی اور اس‌کے چہرے کو کوئی بادل داغدار نہ کرتا۔ وہ سڑک کے سامنےوالی جھونپڑیوں کے اوپر چمکتا۔ چھتوں، درختوں اور کنوئیں کے ایک طرف سفید پالا پگھل جاتا۔ سڑک کا دوروالا سرا نیلگوں اور نم نظر آتا۔ یہ اس نیلگوں دھند کی طرح تھا جو بہار کے ساتھ آتی ہے لیکن یہاں بہار کی کوئی مسرت نہ تھی — صرف جدائی اور تنہائی کی کسک تھی۔

”میرے خدا، میں نے کیسے... آخر یہی سب چیزیں شہر میں بھی ہوتی ہیں لیکن میں‌نے پہلے ان کو کبھی نہیں دیکھا...“

گالینا بدبودار درجے کی گھٹن سے نکل کر تیزی سے سڑک پار کرکے کھیتوں میں پہنچ گئی۔ درخت، کھیتوں کی زرد گھاس، بچے کھچے نوخیز سیپل کے درختوں کے تنوں پر ساکت لال پتیاں — یہ سب اسے بڑے پیار سے الوداع کہہ رہی تھیں۔ پورے منظر کا کچھ انداز ہی نرالا تھا ایک مخصوص انداز جس کی وجہ سے خزاں

کی اداسی کم ہو گئی تھی۔ سورج سرد ہو چکا تھا لیکن ابھی اس میں ہلکی ہلکی گرمی باقی تھی جیسے جاڑوں کے ذرا پہلے ہوتی ہے۔

دور، فاصلے پر جنگل بھی اسی بھورے دھند میں لپٹا ہوا الوداعی سانسیں لے رہا تھا۔ لڑکی گہری گہری سانسیں لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اس سے پوچھ رہا ہو:

''تم کیا چاہتی ہو؟''

''میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔''

''کیسے؟''

''یہ میں نہیں جانتی لیکن میں اس طرح زندہ رہنا چاہتی ہوں کہ میرا دل اس کو اچھی زندگی کہہ سکے۔ کس طرح... کس طرح... آج کی طرح ــ کتنا پیارا منظر ہے! میں‌نے تو ایسا سورج پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا... شاید اس سے پہلے وہ اتنا حسین کبھی نہ رہا ہو... میں تنہا کیوں ہوں؟.. لڑکے کھیلتے کودتے اور غل مچاتے ہیں، بہت سے کسان ہیں، پادری اور اس کی بیوی ہیں۔ لیکن میں تنہا ہوں...''

گرجا گھر کے پیچھے، تنگ گھاٹی کے اونچے کنارے سے ویران میدان کا بڑا اچھا منظر تھا جس میں جابجا گاؤں کے دھبے دکھائی دیتے تھے۔ یہ گاؤں خزاں‌زدہ تاریک باغوں سے گھرے ہوئے تھے ــ گوریائنووہ اور پوزوفکا اور بہت سے گاؤں تھے۔ دولت مند کسانوں کے پکے مکانات جابجا لال لال چمک رہے تھے اور ان کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ ان کے مکین خوش‌وخرم ہیں۔

کازان کی دیوی کے تہوار سے چند دن قبل گاؤں میں ایک عجیب چہل پہل شروع ہو گئی۔ گرجا گھر اچھی طرح جھاڑا پونچھا گیا اور برساتی کے سامنے جگہ صاف کرکے اس پر سنہری ریت بچھائی گئی۔ گاؤں کے مکھیا نے عورتوں کو اسکول بھیجا۔ انھوں نے پوری عمارت کو صاف کرکے اس پر سفیدی کی۔ پادری کا گھر بھی صاف کیا گیا اور بہت سی جھونپڑیوں کے سامنے بالو بچھائی گئی۔ عورتیں صبح سے رات گئے تک کھانے پکانے میں مصروف رہتیں۔ مردوں نے حمام جاکر اچھی طرح غسل کیا اور اپنے سروں میں اتنا تیل لگایا کہ شام کو عبادت کے وقت گرجا کی بند فضا میں ان کے سر تربتر نظر آتے تھے۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' گالینا نے پوچھا۔ ''کیا یہ کوئی مذہبی تہوار ہے؟''

''نہیں، ہم اپنے محسن کا استقبال کرینگے۔''

''کون محسن؟''

''بہت ہی امیر آدمی ہے، اگر وہ چاہے تو پورا صوبہ خرید سکتا ہے۔''

بہر حال محسن صاحب تو شام کی عبادت میں تشریف لائے نہیں۔ پادری دمیتری نے اپنا نیا عبا پہن کر بڑے تقدس اور شان سے وعظ دیا۔ وعظ میں اس کی بیوی نیا پھولدار ریشمی فراک پہن کر آئی اور دوسری عورتیں بھی نئے نئے بلاؤز پہنے تھیں۔ بچوں کے بال بہت اچھی طرح سنوارے بنائے گئے تھے۔ پورا گرجا پادری کی دلکش آواز سے گونج رہا تھا، لیکن محسن صاحب نہیں آئے۔

وہ دوسرے دن عبادت سے پہلے آیا۔ اس کی پرانی اور کھلی بگھی میں تین سرنگ گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ اور اوپر کوچ بکس میں اس کا باڈی گارڈ ریوالور لگائے بیٹھا تھا جس میں ایک پیلی ڈوری لگی تھی۔ گاڑی پادری کے گھر کے سامنے رکی۔ پادری کی بیوی اس کا استقبال کرنے آئی اور پھر وہ لوگ ساتھ ساتھ گرجا میں گئے۔

گرجا کے اندر مجمع نے اس کو جانے کے لئے جگہ دی اور جب وہ گذر رہا تھا تو جھک جھک کر اس کی تعظیم کی۔ پادری نے جو اس وقت اپنے معتقدین کے سامنے عوددان ہلا رہا تھا نووارد کے ساتھ بڑی فیاضی دکھائی اور اس کے سامنے ہلکے ہلکے اٹھتے ہوئے خوشبودار دھوئیں کا ایک بڑا بادل چھوڑ دیا اور کھڑکی سے آتی ہوئی سورج کی ترچھی کرنوں نے اس بادل کے درمیان سے گذر کر نیلے خطوط کی شکل اختیار کر لی۔

''خدایا! ہمارے اوپر رحم کر...'' بچوں کی آوازیں اس وقت ہمیشہ سے زیادہ سرتال میں گا رہی تھیں۔ پادری نے اسکولی بچوں کا ایک کورس تیار کیا تھا۔ ان تمام باتوں کو دیکھ کر گالینا کو اپنا بچپن یاد آگیا، نیلے دھوئیں کے بادل، اپنی مرحوم ماں اور وہ چھوٹا سفید لباس اور سفید سلیپر جو وہ اس بھولے بسرے زمانے میں پہنتی تھی۔

''اچھا تو یہ محسن ہیں!.. ارے میں سمجھی تھی...''

وہ داهنی طرف کورس گانےوالوں کے پاس کھڑا ہو گیا اور گانے لگا۔ حالانکہ وہ بالکل بےسرا گا رہا تھا مگر اس کو اپنے اوپر بڑا اعتماد تھا۔ اس کی گدی پر بال بالکل صاف تھے اور گوشت کی تہیں نظر آتی تھیں جس سے کاروبار میں اس کی خوش حالی اور کھانے پینے کی افراط کا پتہ چلتا تھا۔ اس کے بال پرانے روسی اسٹائل میں اونچے اور گول کٹے ہوئے تھے... وہ بڑے زور شور سے اپنے اوپر صلیب کے نشان بناتا، آہیں بھرتا۔ اس کا کوٹ بہت عمدہ تھا اور بار بار تعظیم کے لئے جھکنے پر اس کی چوڑی چکلی پیٹھ نمایاں ہو جاتی تھی۔

گالینا نے بھی اپنے اوپر صلیب کا نشان بنایا کیونکہ اس موقع پر یہ ضروری تھا — وہ سامنے کھڑی تھی اور محسن کے چہرے کو کنکھیوں سے دیکھتی تھی لیکن اس کے چہرے کی ایک جھلک بھی نہ دیکھ سکی۔ جب طویل دعا ختم ہوئی اور محسن زمین پر سجدہ کر چکا تو وہ اپنے ہاتھوں پر اٹھتے ہوئے گھوما اور مجمع کے سامنے جھکا۔ پھر اس نے اپنے پیٹ پر ہاتھ باندھ لئے اور اپنا سر اونچا کرکے کھڑا ہو گیا۔ گوشت کی تہیں اس کے کالر پر لٹک رہی تھیں، اس نے پھر آہ بھری اور ایسی سرگوشی میں پادری دمیتری سے آگے آگے دعا پڑھنے لگا کہ پورے گرجا میں سنائی دے۔

گالینا کی نگاہوں نے محسن کا یہ نقشہ کھینچا کہ اس کا چیچک کے داغوں سے بھرا چہرہ کسانوں جیسا ہے۔ دیہاتیوں جیسی ہلکی سنہری داڑھی، بال موٹے موٹے اور بیچ سے نکلی ہوئی مانگ جو دیہاتیوں کا فیشن ہے اور آنکھیں تو اس نے دیکھی ہی نہیں۔

مرد و عورت، جوان، بوڑھے اور بچے سب گرجا کی برساتی میں جمع ہو گئے۔ وہ سب بڑے اشتیاق سے آگے بڑھ رہے تھے۔ محسن پادری کی بیوی کے ساتھ باہر آیا۔

"گاؤں آپکا خیرمقدم کرتا ہے!" پورا مجمع ایک ساتھ چلایا۔

ایک سفید جھبرے بالوں والا بڈھا آگے بڑھا، نووارد کے سامنے جھکا اور لکڑی کی کشتی میں روٹی اور نمک پیش کیا۔

"نیکیفور لوکیچ، تمام باشندوں کی طرف سے یہ قبول فرمائیے... خدا آپ کو سلامت رکھے، آپ ہمارے محسن ہیں۔"

"محسن..."

"خدا آپ کو طویل زندگی عطا فرمائے اور خوش‌حال رکھے... هم پیر پیغمبروں سے آپ کے لئے دعا کرینگے..."
محسن نے روٹی اور نمک قبول کر لیا۔
"شکریه۔ شکریه — آپ سب کا شکریه۔ "

اس نے روٹی اور نمک کی کشتی ایک عورت کو دے دی جو قریب کھڑی تھی۔ وہ عورت اس کو لیکر بڑی احتیاط اور ادب سے چلنے لگی۔

"گالینا" پادری کی بیوی نے کہا "یه همارے اسکول کے ٹرسٹی نیکیفور لوکیچ هیں... اور یه نئی استانی هیں... همارے گاؤں کا کام تو بس نیکیفور لوکیچ کے دم سے چل رها ہے... انهوں نے گرجا بنوایا، اسکول کی نئی چھت بنوائی، هم کو لگان پر زمین دی ..."

نیکیفور لوکیچ نے گالینا کا هاتھ مصافحے کے لئے لیا، اس وقت گالینا نے دیکھا که اس کی آنکھیں چھوٹی اور پرمکر هیں۔ اس نے اپنا هاتھ کھینچنے کی هلکی سی کوشش کی لیکن وہ اس کا هاتھ پکڑے رها۔
"اچھا، خاتون۔ مجھے تعریف سے اتنا شرمنده نه کیجئے۔ "
وہ مجمع سے گھرے هوئے آگے بڑھنے لگے۔

پادری کے گھر پر چائے پارٹی تھی۔ اس میں سفید جھبرے بالوں‌والا بڈھا اور دوکان‌دار بھی موجود تھا جس کی ناک لمبی اور داڑھی صاف تھی۔ اس کا چہرہ بالکل بیر شراب کے ڈونگے کی طرح تھا اور اس کی بھویں باهر نکلی اور همیشه تنی رهتی تھیں۔ گاؤں میں اسکول کے سوا صرف اس کا گھر ایسا تھا جس کی چھت لوهے کی چادر کی تھی۔ گرجا گھر کا مکھیا جو بالکل گنجا، زرد اور جلندر کا مریض تھا ان لوگوں کی طرف مخاطب هوئے بغیر چائے پیتا رها۔ اس کے منه میں شکر کا ایک ٹکڑا تھا جس کو وہ اپنے گال اور زبان کے درمیان دبائے هوئے چوس رها تھا۔ اس نے پادری کی بیوی سے کہا:

"سات مہینے سے میں بچھوے کا پانی پی رها هوں۔ ابال کر پیتا هوں۔ اب میں ذرا اچھا هوں، پہلے تو سانس نهیں لے سکتا تھا۔ جب میں گھوڑے لیکر جاتا تھا تو میرا دم گھٹنے لگتا تھا۔ "

"یه لیجئے، نیکیفور لوکیچ" پادری کی بیوی نے اس کی طرف خوبصورت پھولے پھولے رولوں کی پلیٹ کھسکاتے هوئے کہا۔

اس نے سب لوگوں کی تواضع تیل کی طرح گاڑھی، خانہ‌ساز چیری کی شراب سے کی۔ اب تو محفل میں جان پڑ گئی۔

''ہم لوگ آپ کا انتظار کر رہے تھے۔ اس طرح جیسے ایسٹر کا انتظار کرتے ہیں،، جھبرے بالوں‌والے بڈھے نے کہا اور محسن کی طرف شراب کے نشے میں مست نگاہوں سے دیکھا۔ ''دیکھئے، جب تک یہ گرجا باقی ہے، جب تک ہم میں سانس باقی ہے ہم آپ کو دعائیں دیتے رہیں‌گے۔ ،،

''نیکیفور لوکیچ،، پادری دمیتری نے ہاتھ اٹھا کر اپنے عبا کی چوڑی آستین احتیاط سے ٹھیک کی اور بولا: ''ہمارے پیشوا یسوع مسیح نے کہا ہے کہ 'سوئی کے ناکے سے اونٹ کا گذر جانا آسان ہے لیکن امیر آدمی کا خدا کی سلطنت یعنی بہشت میں داخل ہونا مشکل ہے'۔ یہ الفاظ ملامت یا تادیب کے لئے نہیں کہے گئے ہیں بلکہ ان کے ذریعہ ہمارے آسمانی معلم نے بتایا ہے کہ جن کو بہت دیا گیا ہے ان سے بہت مانگا بھی جائیگا...،،

''یقیناً۔ بہت مانگا جاتا ہے،، جھبرے بالوں‌والے بڈھے نے اپنی سفید بالوں کی لٹ جو اس کی آنکھ پر آ گئی تھی پیچھے جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ایک گھوڑا خریدا ہے۔ بڑا مضبوط اور کارآمد ہے۔ جس طرح میں اس کو لادیا ہوں ...،،

پادری کی بیوی نے بےچینی سے اپنا سر گھمایا۔

''بچو، جاؤ، اپنی نرس کے پاس جاؤ۔ وہ تم کو کچھ دیگی۔ ،،

پھر وہ جھبرے بالوں‌والے بڈھے کی طرف مڑ کر کہنے لگی: ''پادری دمیتری بات کر رہے ہیں، ان کو ختم کر لینے دو۔ ،،

''... جن کو بہت دیا گیا ہے ان سے بہت مانگا بھی جائیگا۔ یہ بات لوگ بھول جاتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ...،،

''ہاں، ضرور بھولتے ہیں،، گنجے مکھیا نے لقمہ دیا۔ ''میں سات مہینے سے بچھوے کا پانی پی رہا ہوں اور میں نے اپنی لڑکی سے کہا...،،

''چپ رہو، دیمیانچ،، پادری کی بیوی نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔

''... اور ان پر خدا کی رحمت ہوتی ہے جو بھولتے نہیں، جو ہمارے پیشوا کی تعلیم کو یاد رکھتے ہیں، جن کی سخاوت لامحدود ہوتی

ہے۔ خدا نیکیفور لوکیچ کے کاموں میں برکت دیتا ہے اور وہ بھی یہ نہیں بھولتے کہ جو کچھ بھی ملتا ہے وہ اوپروالے کی دین ہے...''

''جب کھاد کے ڈھیر سے وہ آدمی نکلا تھا تب یہ اس طرح کی باتیں نہیں کر رہے تھے...'' گالینانے سوچا۔ اس نے پادری دمیتری پر اپنی نظریں گاڑ رکھی تھیں۔

''... اور ان کی سخاوت لامحدود ہے۔ ان کے خرچ سے گرجا بنا، اسکول پر نئی چھت پڑی ...''

''پرانی چھت میں تو بس سوراخ ھی سوراخ تھے'' جھبرے بالوں والے بڈھے نے کہا۔

''بچے اسکول میں بیٹھ کر چھت کے درمیان سے سورج دیکھ سکتے تھے ...'' مکھیا نے اس کی حمایت کی۔

''... لیکن نیکیفور لوکیچ نے ھمارے محنت کش کسانوں کو آراضی دیکر سب سے بڑا فائدہ پہنچایا ہے...''

''خدا ان کی ھر مراد برلائے۔ انھوں نے آراضی کے سلسلے میں بڑا نیک کام کیا ہے۔''

''ھم اپنی تمام زندگی آراضی کی وجہ سے آپ کو دعائیں دیتے رھیں گے...''

محسن نے اپنے کوٹ کا کالر کھول دیا اور اپنی زوردار دیہاتی آواز میں بولنے لگا۔ معلوم نہیں کیوں وہ سیدھا گالینا کی طرف دیکھ رھا تھا۔

''میں نے ھر کوپک ان ھاتھوں سے کمایا ہے... اپنی کمر توڑ کر، راتوں کی نیند حرام کرکے...''

''ھم جانتے ھیں۔''

''آدمی بے محنت کئے ایک کوپک بھی نہیں کما سکتا۔''

''یہ کوپک بڑا چور ھوتا ہے۔ راتوں کی نیند حرام کر دیتا ہے...'' دوکان‌دار نے چونک کر باریک نسوانی آواز میں کہا اور فوراً ھی اس کے چہرے پر پھیلی ھوئی مسکراھٹ نے اس کا چہرہ بدل دیا۔ اب وہ بیر شراب کا ڈونگا نہیں رھا، اس کی آنکھوں میں شرارت‌آمیز مسکراھٹ کھیلنے لگی۔ لیکن بات ختم کرتے ھی اس کا چہرہ پھر لمبا اور پتلا ھوگیا، بالکل کٹھرے میں بیٹھے ھوئے بھیڑئیے کی طرح اور پھر اس کی بھویں چڑھ گئیں۔

''اس طرح ... میں نے ایڑی چوٹی کا پسینہ ایک کرکے ہر کوپک کمایا ۔ مجھے اس بات کا افسوس نہیں ہے کہ میں کم لگان پر آراضی دے دیتا ہوں ۔ میں تو یہ سب اپنے گاؤں کے لئے کرتا ہوں اور آراضی تقریباً مفت اٹھا دیتا ہوں — مجھے اس کی وجہ سے ہر سال چھ یا آٹھ ہزار کا نقصان ہوتا ہے اور آٹھ ہزار کچھ کم رقم نہیں ہوئی ۔ لیکن مجھے اس کا افسوس نہیں ہے ۔ ''

''ہمیں یقین ہے... یہ لیجئے، نیکیفور لوکیچ'' پادری کی بیوی نے اس کی طرف پنیر کے کیک بڑھائے ۔ ''اور کچھ شراب بھی ۔ ''

''جب ہم گرجا جاتے ہیں تو گورنر ہمیشہ میرا بازو تھام لیتا ہے، جب بھی میں مانگ بھیجتا ہوں لاٹ پادری مجھے مقدس روٹی بھیج دیتے ہیں ۔ فوراً کوئی راہب اس کو چاندی کی پلیٹ میں لیکر آجاتا ہے اور جھک کر سلام کرتا ہے ۔ مجھے سخاوت کے لئے خود شہنشاہ سے ایک چاندی کا تمغہ ملا ہے ۔ ''

اس نے اپنے کوٹ کے دامن اٹھائے، اپنی جیب ٹٹولی اور مسکرا کر پر مکر نگاہوں سے سامنے دیکھتے ہوئے مٹھی میں چند کاغذ، رسیدیں، شکرئے کے خطوط، پرانے بٹن اور ایک چاندی کا تمغہ جس میں فیتہ لگا تھا نکالا ۔ ہر شخص نے تمغہ لیکر باری باری دیکھا ۔

''میرا داماد آج کل ماسکو کی ایک کوآپریٹیو میں ہے — اس کو بھی شہنشاہ نے ایک تمغہ عطا کیا ہے ۔ اس نے کسی کو ڈوبنے سے بچایا تھا ۔ کہتے ہیں کہ اس تمغہ کا نمبر ۵٦ ہے'' دوکاندار نے اپنی زنانی آواز میں کہا ۔

پادری کی بیوی نے کھانس کر ہونٹوں کے کونے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے پونچھے ۔

''یہ تو اس بات کی عادی ہو چکی ہے'' گالینا نے سوچا ۔ ''دیہاتی عورتوں کی طرح ۔ ''

''ترکاری کی باڑیوں کے بغیر بہت تکلیف ہے'' پادری کی بیوی نے کہا ۔ ''ہم کو ہر چیز خریدنی پڑتی ہے اور آپ تو جانتے ہیں کہ کسان کیسے ہوتے ہیں، وہ چیزیں بیچتے نہیں ہیں لوٹتے ہیں ...''

''ہاں، کسان لالچی ہوتے ہیں'' جھبرے بالوں والے بڈھے نے کہا ۔

دوکان دار نے پہلے محسن کی طرف مخاطب ہو کر سر جھکایا پھر پادری، اس کی بیوی اور دوسروں کی طرف ۔ اس کا چہرہ کافی لمبوترا ہو گیا ۔ اس نے اپنی بھویں پھر چڑھائیں اور شراب کا جام چڑھا گیا ۔

محسن نے اپنے کوٹ کے بٹن کھول دئے جیسے اس کو گرمی معلوم ہو رہی ہو، اپنے بالدار ھاتھ پر آستین ذرا اوپر چڑھا لی اور اس طرح میز پر مکا مارا کہ برتن کھڑکھڑانے لگے اور گلاسوں میں چائے چھلک گئی -

''میں کنجوسی نہیں کرونگا! .. کل میں سیدورکا کو بھیجونگا، وہ دریا کے پار ''سوکری کوت،، کا ایک قطعہ ناپ دیگا - یہ گرجا کی ضرورتوں کے لئے ترکاری کی باڑی بن جائیگا - ،،

پادری کی بیوی اتنی خوش ہوئی کہ اس کو اپنے زودحس چہرے کے تاثرات چھپانا مشکل ہوگئے - پادری کی سیاہ آنکھوں سے مہربانی اور نرمی کا اظہار ہونے لگا -

''آخر یہ سب لوگ اس سے ''آپ جناب،، سے کیوں باتیں کرتے ھیں جب کہ وہ سب کو ''تم،، کہتا ھے حتی کہ پادری اور اس کی بیوی کو بھی...،، گالینا حیرت سے سوچنے لگی -

''بہت بہت شکریہ، نیکیفور لوکیچ، ہمارے پورے حلقے کی طرف سے ...،،

''یہ تقریباً ایک سو روبل لگان کا ہوگا... کافی اچھا قطعہ ھے،، دوکاندار نے منہ سکھا کر کہا اور پھر یک دم مسکرا پڑا، اس کی آنکھوں میں وہی شرارت‌آمیز مسکراھٹ کھیلنے لگی اور اس کے پورے چہرے پر جھریاں پڑ گئیں -

''اس آراضی میں بہار کا سیلاب آتا ھے - وہ تو واقعی سونے کی کان ھے!،، جھبرے بالوں‌والے بڈھے نے کچھ چباتے ہوئے کہا -

چائے کے بعد وہ سب اسکول گئے - ان کے پیچھے مردوں اور عورتوں کا ایک ھجوم تھا - چھوٹے بچے ان کے آگے آگے راستے سے سور ھنکاتے جا رہے تھے - دروازوں پر کھڑی ہوئی لڑکیاں جو سورج‌مکھی کے بیج چبا رہی تھیں تعظیم کے لئے جھک رہی تھیں -

انھوں نے اسکول کا معائنہ کیا - نیکیفور لوکیچ نے اسکول کا کونہ کونہ دیکھا اور واسیلی کو ھدایات دیں :

''بڑھئی کو بلاکر کہو کہ لکڑی کے سائبان میں پھر دروازہ لگا دے تاکہ ایندھن تک برف نہ پہنچ سکے اور واسکا فینوگینوف کو بلاؤ - پرنالے کی مرمت کی ضرورت ھے - کونے بیکار ہو گئے ھیں - اس سے کہو کہ سب ٹھیک کرے - ،،

پادری کی بیوی نے گالینا کو ہلکے سے کہنی ماری :
''ان سے اسکول کے سامان کے لئے کہو۔ حسب ضرورت سب ٹھیک کر دینگے... جانے سے پہلے ان سے کہہ دو...،،
گالینا کی تیوریوں پر بل آ گئے اور اس میں ایک طرح کی ضد سی پیدا ہو گئی۔
''تم نے خود ہی اس کے متعلق کہا تھا،، پادری کی بیوی نے کہا لیکن گالینانے کوئی جواب نہیں دیا۔
... پورا گاؤں نیکیفور لوکیچ کو رخصت کرنے گیا، چھوٹے چھوٹے لڑکے غل مچاتے ہوئے گھوڑوں کے آگے دوڑ رہے تھے۔ مردوں اور عورتوں نے اس کو الوداع کہی اور تعظیماً جھکے۔ تین چھوٹے گھوڑے اس کی گاڑی میں جتے تھے۔ کوچبان کے برابر کوچ بکس پر اس کا باڈی گارڈ بیٹھا تھا جسکے گلے میں ریوالور کی ڈوری لٹک رہی تھی۔
اسی شام کو گالینا دوکان کی طرف سے گذری۔ برساتی کے اندر اور باہر کچھ مرد بیٹھے تھے۔ بعض کھڑے تھے اور اپنی چھڑیوں پر جھکے ہوئے کچھ سن رہے تھے۔
''ایک بھی عورت نہیں،، گالینا نے سوچا۔
ایک تگڑا آدمی اٹک اٹک کر اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس کا بھدا چہرہ چٹائی نما بالوں سے ڈھکا ہوا تھا جیسے کسی اکھڑے ہوئے درخت کی جڑیں ایک دوسرے سے الجھ جاتی ہیں۔ وہ الفاظ کے ھجے لگاتا جاتا تھا اور اپنا سر اس طرح اوپر نیچے ہلا رہا تھا جیسے کسا پٹہ لگا ہوا گھوڑا ہلاتا ہے۔
''سلام،، دوکاندار نے اپنی ٹوپی اٹھاتے ہوئے کہا۔
دوسروں نے بھی اس کو سلام کیا۔
''رخصت کر دیا؟،، گالینا نے کہا۔
اس نے جھبرے بالوں والے بڈھے کو، اس مکھیا کو جو بچھوے کا پانی پیتا تھا اور اس بڈھے کو پہچان لیا جو پہلی مرتبہ گاؤں میں آتے ہوئے اسے ملا تھا۔ اس نے دوسرے لوگوں کو بھی پہچانا جو سال کے شروع میں اپنے بچے لیکر اسکول آئے تھے۔ وہ لوگوں سے بے تکلف ہونے اور اس غیرمرئی دیوار کو توڑنے کی بڑی خواہش رکھتی تھی جو

اس کے اور ان لوگوں کے درمیان حائل تھی، یہ دیوار یا تو جھجک تھی یا پھر الگ تھلگ رہنے کی عادت۔

''رخصت کر دیا۔ خدا ان کو سلامتی سے پہنچائے!،، کئی آوازوں نے جواب دیا۔

''ان کے ساتھ باڈی گارڈ کیوں رہتا ہے؟،،

''کیوں؟،، جھبرے بالوں والے بڈھے نے ہونٹ کھول کر سانس اندر کھینچتے ہوئے کہا۔ ''آج کل لوگ بڑے ہنگامے کر رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ اس کے اوپر کوئی اینٹ یا لوہا پھینک ماریں یا کسی باڑ کے پیچھے سے بندوق چلا دیں۔ آج کل لوگ تو بالکل وحشی ہو رہے ہیں۔،،

''کیا نیکیفور لوکیچ بہت بھلائی کرتے ہیں؟،،

''ارے، کیوں نہیں۔ وہی تو ہم لوگوں کو پال رہے ہیں۔ اگر وہ نہ ہوتے — تم خود دیکھ سکتی ہو۔ مثال کے طور پر اگر تم کسی زمیندار سے زمین لگان پر لو تو ساڑھے اٹھائیس روبل فی دیسیاتینا * دے گا لیکن نیکیفور لوکیچ ہم کو صرف چھ روبل میں دیدیتے ہیں۔ فرق دیکھ لیا نا؟ دریا کے چھڑان پر جو زمینیں ترکاری کے کھیتوں کے لئے ہیں زمیندار اس کے دو سو روبل فی دیسیاتینا...،،

''اس کو فروخت کر دیتے ہیں نا؟،،

''ارے نہیں۔ یہ صرف سالانہ لگان ہے اور نیکیفور لوکیچ وہی زمین ہم کو چالیس میں دے دیتے ہیں... سمجھیں نا؟،،

گالینا کو آراضی اور آراضی کے لگان کا کوئی اندازہ نہ تھا لیکن جو رقمیں اسے بتائی گئی تھیں ان میں بڑا فرق تھا۔

''وہ کہاں کے رہنے والے ہیں؟،،

''یہیں کے ہیں۔ اس گاؤں کے،، سب نے ایک ساتھ جواب دیا اور ان کے چہرے فخر و خوشی سے چمک اٹھے۔ ''وہ ہمیں لوگوں سے ایک کسان ہیں۔،،

''وہ سب سے غریب تھے۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ چیتھڑے لگے۔،،

---

* دیسیاتینا — آراضی کی ناپ جو ۲ء۷ ایکڑ کے برابر ہوتی ہے۔

''انھوں نے ٹھیکوں سے دولت کمائی،، دوکاندار نے کہا۔ اس کا چہرہ کچھ عجیب سا کینہ‌آمیز اور لمبوترا ہو گیا۔ ''وہ جانتے ھیں کہ کہاں دینا چاھئے اور کہاں وصول کرنا چاھئے۔،،

''یہ بات خوب جانتا ھے، اسمیں اس سے بچنا محال ھے،،۔

شام ٹھنڈی تھی، گالینا سردی سے کانپنے لگی پھر بھی ان لوگوں کے پاس سے جانا نہیں چاھتی تھی۔ اس کو امید تھی کہ جو دیوار اس کے اور ان لوگوں کے درمیان حائل تھی اس کے پار کی چیزوں کی وہ ایک جھلک دیکھ سکیگی۔ ڈوبتے ھوئے سورج کا نارنجی شعلہ غائب ھوگیا تھا اور سیاہ مکانوں پر ایک چمکدار چاند چمک رھا تھا جو ابھی نیا تھا۔

سنسان سڑک پر سرد چاندنی پھیلی ھوئی تھی۔ گالینا نیلے نیلے سایوں کے پاس سے گذر رھی تھی کہ ایک عورت بھیڑ کی کھال کا کوٹ اپنے شانوں پر ڈالے اور گرمی کے لئے ھاتھ جیکٹ کی جیبوں میں گھسیڑے اس کے پاس آئی۔

''الیکساندرووناِ،، عورت نے جھکتے ھوئے کہا۔ ''مہربانی کرکے میرے گھر چلئے۔ میری چھوٹی بچی بالکل بھن رھی ھے اور چقندر کی طرح سرخ ھو گئی ھے۔ وہ کچھ کھاتی نہیں ھے۔ بس، پانی پیتی چلی جاتی ھے۔ اس سے باز نہیں آتی۔ اندر آکر ذرا دیکھ لیجئے۔ میں آپ کے لئے ایک پیالہ دودھ لاتی ھوں۔،،

گالینانے سڑک پار کی جو ایک طرف کہرے سے سفید ھو چکی تھی اور جھونپڑی میں داخل ھو گئی۔ خراب بھاری اور کثیف ھوا نے چھوٹے سے چراغ کی سرخ لو کو تقریباً چھپا لیا تھا، اس کے اوپر بڑی اداسی سے سیاہ دھوئیں کا ایک حلقہ منڈلا رھا تھا۔ چولھا، ایک بڑے ٹرنک کا کونا اور ایک میز کا خاکہ مشکل سے دکھائی دے رھے تھے۔ تل‌چٹے دیوار پر دوڑتے ھوئے سرسرا رھے تھے۔

ان کی سرسراھٹ میں تیز سیٹی جیسی سانس کی آواز مخل ھو رھی تھی۔ گالینا اپنا سانس روک کر احتیاط سے جھکی، اس نے ایک بچکانہ سا لال چہرہ دیکھا جو مشکل سے نظر آ رھا تھا۔ سوکھے ھونٹوں کے درمیان سفید دانت دکھائی دے رھے تھے۔

گالینا خوف سے سرد پڑ گئی اور اس کی ساری طاقت جاتی رھی۔ اس نے کوشش کی کہ اس کے کپڑے میز یا ٹرنک سے نہ چھوئیں اور

وہ اس پریشان کن گھر سے بھاگ نکلنے تک اپنا سانس روکے رکھے لیکن اس کا دل بیٹھنے لگا اور اس نے ایک کسک سی محسوس کی۔

''بڑی عمروالے بھی خناق کی بیماری سے اکثر مرجاتے ھیں... اگر میں اس کے اوپر جھکی تو بس خاتمہ ہے...''

وہ پیچھے ھٹ گئی، اس نے اپنا لباس سمیٹ لیا تاکہ وہ چولھے سے نہ چھو جائے۔

''میں کچھ نہیں کر سکتی... میں ڈاکٹر تو ھوں نہیں... تمھیں ڈاکٹر بلانا چاھئے۔ ''

عورت کی سسکی نکل گئی، اس نے اپنی نوکیلی ناک انگلیوں سے ملی اور پھر صاف کی۔

''تم اس کو کوئی سفوف نہیں دے سکتیں؟ پیاری، ممکن ہے کہ اسی سے فائدہ ھو جائے۔ ''

اس کا دل چاھتا تھا کہ فوراً اس گھر سے نکل کھڑی ھو — سڑک پر وہ جی بھر کر گہرے سانس لے سکتی تھی — اور واسیلی کو کھانسی کا سفوف دے کر یہاں بھیج سکتی تھی۔ کچھ سفوف اس کے پاس پڑے تھے۔

''تمھیں ڈاکٹر کی ضرورت ہے... میں کچھ نہیں کر سکتی ... میں کچھ سفوف بھیج دونگی...''

اس نے نگاہ اٹھائی — چولھے کے اوپر سونےوالے تختے سے تین چھوٹے چھوٹے سر نیچے جھانک کر اس کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی بچکانی آنکھیں اشتیاق سے چمک رھی تھیں۔

''میرے خدا۔ ان کو تو کہیں الگ بھیج دینا چاھئے ...'' اس نے سوچا۔

اچانک اسکول میں اس کا چھوٹا سا کمرہ جس کی واحد کھڑکی سے ھمیشہ وھی گھروں کی قطار، کنواں اور ھمیشہ موجود رھنےوالی سفید بطخیں دکھائی دیتی تھیں ایسا سنسان اور خالی معلوم ھوا کہ اس کا دل نرم پڑ گیا۔

اس نے جلدی سے اپنی جیکٹ اتاری۔

''بہر حال مجھے اپنی زندگی کارآمد بنانا چاھئے ... کسی نہ کسی طرح مجھے زندہ تو رھنا ھی ہے...''

اس نے جیکٹ دروازے کے قریب لٹکا دی — وھاں اس میں کافی ھوا لگےگی اور جراثیم بھی کم ھوں گے۔

''لال بخار میں بدن پر کہیں کہیں چٹھے پڑ جاتے ھیں۔ خواہ گلے پر یا پیٹ میں ...،، اس نے سوچا۔

اس کے دل کے نیچے ایک چھوٹا ٹھنڈا گولا سا اٹھا — خوف۔ گالینا نے لڑکی کے جلتے ھوئے جسم کا معائنہ شروع کیا۔

''پا... نی...،،

''مجھے زیادہ روشنی چاھئے ... تم لیمپ کی بتی بھی ٹھیک سے کاٹنا نہیں جانتیں ... یہ تو بالکل دودکش کی طرح دھواں دے رھا ھے... بچی، ذرا مجھے اپنا حلق تو دکھانا... اپنا منہ کھولو... اور زیادہ... میرے خدا۔ مجھے کچھ بھی نہیں دکھائی دیتا... یہاں تو جنگل جیسا گھپ اندھیرا ھے۔ ،،

وہ تھک کر بیٹھ گئی اور خوف سے اپنے ھاتھ بنچ پر ملنے لگی، پھر ایک عزم کے ساتھ اٹھ کھڑی ھوئی۔

''سیدھی دوکان جا کر سر کہ لاؤ۔ ،،

''وہ مجھے نہیں دیگا۔ کہےگا کہ رات کو نہیں بیچتا ھوں۔ ،،

''کہنا ... اس کا نام کیا ھے؟،،

''ایوان فیدرووچ ۔ ،،

''ایوان فیدرووچ سے کہنا کہ میں نے مانگا ھے۔ مجھے اس کی سخت ضرورت ھے... یہ پیسے رھے۔ ،،

وہ سر کہ لے آئی۔ گالینا نے بچی کے جسم پر ملا۔ اس کا بستر پھر سے بچھایا اور اس کو لٹا دیا۔ اس نے عورت سے سماور جلانے کو کہا۔ گھر سے دوڑ کر چائے اور شکر لائی اور لڑکی کو چائے پلائی۔

''تمھیں دوسرے بچوں کو یہاں سے کہیں بھیج دینا چاھئے۔ ،،

''کہاں؟ گائے کے باڑے میں تو بڑی سردی ھے۔ ،،

''ان کو کسی دوسرے گھر پہنچا دو۔ ایسی جگہ جہاں بچے نہ ھوں۔ ،،

''میں یہ سب نہیں جانتی۔ اگر خدا کی مرضی نہیں ھے تو وہ بیمار نہ ھوں گے اور اگر وہ چاھتا ھے تو چاھے تم ان کو زمین کے سات طبقوں میں چھپا کر رکھو پھر بھی بیماری لگ جائیگی۔ شاید انوشکا ان کو رکھ لیگی۔ وہ اکیلی ھے۔ ،،

انھوں نے کسی نہ کسی طرح لڑکوں کو وہاں بھیجا اور پھر گالینا نے گھر صاف کرنا شروع کیا۔ اس نے عورت کی مدد سے جھاڑو دی، بچی کو اچھی طرح اوڑھا دیا اور پھر کمرے میں ہوا آنے کے لئے دروازہ کھول دیا۔ گالینا نے لیمپ کا کلا صاف کیا، اس کی شیشے کی کپی دھوئی اور بتی کاٹی۔ اب اس کو کمرہ، بڑا صندوق، چولھا، دیوار پر لگی ہوئی تصویریں، فوٹو غرض ہر چیز روشنی میں صاف دکھائی دینے لگی۔

پھر وہ دونوں جا کر باہر برساتی کے زینوں پر بیٹھ گئیں۔

''میرا ڈر کہاں گیا؟''، وہ حیرت سے سوچنے لگی۔

اس کے دل کے نیچے جو سرد گولا تھا وہ اب پگھل گیا تھا۔ کام کرنے کے بعد اس کے بازو اور پیروں میں میٹھا میٹھا درد تھا۔ شدید جاڑے کیوجہ سے اسے سردی لگ رہی تھی۔ صحن، باڑے، گاڑی، ننگے بید کے درخت اور باڑیں سب ایک سرد، نیلے شفاف سمندر کے نیچے تھے اور اس پرسکوت نیلاھٹ کے بہت اوپر لاتعداد ستارے اور تنہا سفید چاند تیرتا معلوم ھوتا تھا۔

''کیسی روشن رات ھے...''، گالینا نے کہا۔

یہ تو اس کے الفاظ تھے لیکن وہ کہنا چاھتی تھی :

''تمھیں محسوس نہیں ھوتا کہ یہ کیسی حسین رات ھے؟ ایک نیلا سمندر ھے اور ھم ٹہل رہے ھیں، برساتی میں بیٹھے ھیں ... مکانات سمندر کی تہہ میں ھیں ... اس حالت میں آدمی کا دل نہیں چاھتا کہ وہ کچھ سوچے یا بات کرے، اگر وہ سوچتا بھی ھے تو اس کا ان مکانوں، کوٹھاروں، باڑوں یا اس برساتی سے کوئی تعلق نہیں ھوتا۔''

بہرحال عورت نے تو اس کی وھی بات سمجھی جو اس کے منہ سے سنی تھی۔

''چاند خوبصورت ھے، سردی جلدی آ گئی۔ ابھی تو بارش ھونی چاھئے تھی۔ اس سال ایندھن کی مصیبت ھوگی۔''

''تمھارا شوھر کہاں ھے؟''

''میں بیوہ ھوں۔ ھماری حالت کسی سے بری نہ تھی۔ ھمارے پاس کھیت اور ترکاریوں کے لئے چمن بھی تھا۔ میں دکھڑا نہیں روتی... اگر وہ زندہ ھوتے...''، وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ''میں کیا کر سکتی ھوں، میں عورت ذات ھوں، مجھے مویشی بیچنا پڑے''۔

''تمھارے پاس زمین ہے؟''

''ھاں جو زمین ھمارے پاس ھے وہ فی کس ایک دیسیاتینا کا آٹھواں حصہ بھی نہیں پڑتی۔ اگر نیکیفور لوکیچ نہ ھوتے تو گاؤں میں کوئی بھی نہ رہ جاتا: وہ ھم لوگوں کے رازق ھیں...''

''وہ اچھے آدمی ھیں۔''

''اونہہ، وہ بہت ظالم... وحشی ھے۔''

''لیکن ھر شخص ان کو پسند کرتا ھے۔ سب ان کا استقبال کرنے جاتے ھیں۔''

''اور کیا کریں؟.. لوگ صرف اس کا استقبال ھی نہیں کرتے بلکہ اگر وہ چاھے تو لوگ لیٹ جائیں گے اور اس کی گاڑی اپنے اوپر سے گزر جانے دینگے... پورا گاؤں بالکل اس کی مٹھی میں ھے، یہاں چاروں طرف اس نے سب کچھ خرید لیا ھے، تمام زمینداریوں کو خرید لیا ھے۔ گاؤں سے باھر جانے تک کا راستہ نہیں ھے۔ اس نے سیلیوانوف کی اور شہزادہ بوگودوگئیفسکی اور کیرپیچینکو کی جاگیریں خرید لی ھیں۔ جس طرف بھی دیکھو سب اسی کا ھے۔ اگر وہ چاھے تو ایک بچھڑے کو بھی باھر نہ نکلنے دے۔ باھر نکلنے کا کوئی راستہ ھی نہیں ھے۔ اس نے ھمارے چاروں طرف ایک گھیرا ڈال دیا ھے۔''

حالانکہ شیشے کی طرح چمکدار نیلا آسمان غیر متحرک تھا لیکن سائے چل رھے تھے۔ باڑ پر، جو پہلے روشن تھی اب تاریکی پھیل گئی کوٹھار کے اس پار کونے میں سیاہ بادل کا ایک ٹکڑا ھٹ گیا۔ اور نیلے تارے بھرے آسمان کے پس منظر میں بید کے درختوں کی ننگی شاخوں کا سیاہ خاکہ دکھائی دینے لگا۔

کوٹھار کی تاریکی سے ایک جھبرا کتا نکل کر ان کے پاس آیا اور آھستہ آھستہ سر اور دم ھلانے لگا جس میں خاردار گھاس بھری ھوئی تھی اور مکان کی مالکہ کے پاس بتیسی نکالے کھڑا رھا۔ وہ کچھ سمجھ کر غرایا اور اپنا رخ گاؤں کی سرحد کی طرف موڑ دیا جہاں بہت دور ایک کتا برابر بھونک رھا تھا اور صرف کبھی کبھی اپنی آواز سننے کے لئے رک جاتا تھا۔ پھر اس نے کچھ سوچا اور چند قدم چل کر ٹھنڈی زمین پر دھم سے لیٹ گیا اور اپنے جسم سے پسو اڑانے لگا اور خاص انداز سے اپنا ایک پیر سر کے اوپر اٹھا لیا۔ آخر میں وہ گڑ

سڑا کر ایک گیند کی شکل بن گیا۔ اور ہر چیز پر خاموشی طاری ہو گئی۔

''میرے خدا۔ آخر لوگ ایسے سناٹے میں کیسے زندہ رہتے ھیں...''

گالینا حیرت سے سوچنے لگی۔

دور والے کتے نے بھونکنا بند کر دیا اور مکان کا سایہ کھسک کر بالوں کے اس گیند پر آ گیا جو زمین پر پڑا تھا۔

''تم لوگ ایسی غربت، جہالت اور گندگی میں رہتے ھو۔ چھتوں پر چھپر بالکل سیاہ اور اجڑپجڑ گئے ھیں''۔

''یہ تو سردوں کا قصور ھے۔ وہ لالچی ھو گئے ھیں۔ ذرا سوچو تو نیکیفور لوکیچ لوگوں کو پانچ چھه روبل فی دیسیاتینا آراضی دیتا ھے جب کہ ضلع میں دوسروں کو اٹھائیس یا تیس روبل پر ملتی ھے۔ اس کا مطلب یہی ھوا کہ کافی رقم لوگوں کی جیب میں جاتی ھے۔ وہ رقم بچاتے ھیں اور جب کافی ھو جاتی ھے تو کہیں اور جا کر خود اپنی زمین خرید لیتے ھیں۔ بہت سے لوگ یہاں سے چلے گئے ھیں۔ ھم بھی جانا چاھتے تھے لیکن میرا شوھر ھی مر گیا۔ نیکیفور لوکیچ نے اس علاقے کے اور تمام گاؤں کا خون چوس لیا ھے۔ اس نے لوگوں کی آنتیں تک نکال لی ھیں اور بھیڑوں کی طرح ان کا چرسا کھینچ لیا ھے۔ خدا نہ کرے کہ ھم ان کی طرح بھوکے اور ننگے ھو جائیں، بچے تو ابھی مکھیوں کی طرح مرنے لگے ھیں۔ تم نے وہ باڈی گارڈ دیکھا ھے جو اس کے ساتھ رھتا ھے۔ اس کی وجہ یہ ھے کہ لوگ اس کو مار ڈالنا چاھتے ھیں۔ اپنی روح کی نجات کے لئے وہ ھمارے گاؤں کی بہبودی چاھتا ھے — جانتی ھو نا، وہ یہاں کا رھنے والا ھے — لڑکیاں اس کے لئے نعتیں گاتی ھیں اور خدا سے دعا کرتی ھیں لیکن — تھو! وہ بری طرح مریگا یا لوگ اس کو مار ڈالیں گے ... وہ اس کو ختم کرنے کا تہیہ کر چکے ھیں ...'' عورت نے گالینا کی طرف جھک کر آخری بات سرگوشی کے انداز میں کہی۔

کتے نے اپنا سر اٹھایا، چاروں طرف دیکھا اور پھر سمٹ کر پڑ گیا۔

''... اگر اس کے دماغ میں کبھی کیڑے نے کاٹا اور اس نے ھمارے گاؤں کا بھی چرسا کھینچنا شروع کیا تو بس ھم لوگوں کا خاتمہ ھے۔ اس کے لگام لگانا بہت مشکل ھے۔ اسی لئے لوگ پیسہ بچانے کی فکر

میں لگے رہتے ہیں اور اپنے مکانوں کے لئے کچھ نہیں خریدتے بلکہ اس طرح رہتے ہیں جیسے سرائے میں رہتے ہوں، کتوں کی طرح ۔ ''

گالینا نیلی سنسان سڑک پر جمی ہوئی مٹی کے ڈھیروں سے ٹھوکریں کھاتی گھر پہنچی ۔ اسکول کی کھڑکیوں میں نیلی چمک تھی ۔

جب اس نے موم‌بتی روشن کی تو اس کو پہلی مرتبہ اپنا کمرہ آرام‌دہ معلوم ہوا ۔ وہ بستر پر سمٹ کر لیٹ گئی اور جلدی سے گرم ہو گئی اور خوشی سے نیند کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرنے لگی ۔

''ہر چیز گڑبڑ ہے'' اس نے سوچا ۔ ''مجھے اس کا کوئی اندازہ ہی نہ تھا ۔ اور یہ بچے بھی گندے اور جھگڑیلو ہیں ... اور سرد؟.. ان کی زندگی ایک زبردست فریب ہے ۔ وہ اس کا استقبال کرنے جاتے ہیں، اس کے سامنے جھکتے ہیں اور اس کے لئے دعا کرتے ہیں لیکن یہ سب جھوٹ ہے... کہتے ہیں کہ لوگوں میں سچائی ہے... کیا خوب سچائی ہے!.. میں سونا چاہتی ہوں ... ان میں کچھ بچے اچھے بھی ہیں ... شاید میں کل دیر تک سوتی رہوں ... میں نے سوچا تھا کہ میں ایک بات کرونگی یعنی اپنے طریقے سے زندگی گذارونگی لیکن ہر چیز الٹی ہو رہی ہے... لوگ بھی ایسے نہیں ہیں جیسے پہلے میں نے خیال کئے تھے ... اب میں کیا سوچ رہی ہوں ؟..''

ابھی یہ خیال ختم نہیں ہوا تھا کہ نیند کے نرم ہاتھوں نے اس کی لمبی لمبی پلکوں‌والی تھکی آنکھیں بند کر دیں ۔

بہرحال اجنبیت کی دیوار ہٹتی گئی ۔ لوگ اس کے پاس آنے جانے لگے ۔ اس سے کچھ لکھانے کے لئے آتے، مقامی کونسل سے متعلق اپنے معاملات میں مشورہ لیتے اور اپنی گھریلو باتوں میں بھی اس کی رائے دریافت کرتے ۔ کچھ لوگ دوا علاج کے لئے بھی اس کے پاس آتے ۔

اس نے کبھی بیماری، گندگی اور غربت کے متعلق زیادہ نہیں سوچا تھا لیکن اس کے چاروں طرف اتنے آلام و مصائب تھے کہ ان معاملات میں اسے دلچسپی لینی ہی پڑی ۔

زیادہ تر عورتیں اس سے ملنے آئیں ۔ اس نے کچھ ڈاکٹری کی کتابیں منگا لیں تاکہ وہ جو کچھ دوا علاج کرتی تھی اس کے متعلق سمجھ بھی سکے ۔

''تم اسپتال کیوں نہیں جاتیں؟.. ڈاکٹر تو ضرور ہوگا... میں کیا کر سکتی ہوں؟.. اسپتال تو دور نہیں ہے...''

"ہاں، اسپتال تو یہاں سے نزدیک ہی ہے - بس جنگل کے پیچھے لیکن وہ ہمارے صوبے میں نہیں ہے - صوبے کی سرحد جنگل کے اندر ہے اس لئے وہ ہمارا علاج نہیں کرتے - ہمیشہ یہی کہہ دیتے ہیں کہ اپنے اسپتال جاؤ ہمارے یہاں خود کافی مریض ہیں - ہمارا ڈاکٹر بہت سخت ہے لیکن وہ لوگوں کا علاج اچھی طرح کرتا ہے - گاؤں میں بخار پھیلا، ہر گھر میں کوئی نہ کوئی ضرور بیمار پڑا - لوگ بھاگنے لگے - اس وقت ڈاکٹر یہاں آکر کچھ دن رہا، جان توڑ کر کام کیا اور بخار ختم ہو گیا - خدا اس کو بڑی زندگی دے - لیکن یہاں سے اس کے یہاں اتنی دور جانا مشکل ہے - چالیس ورسٹ* ہے یعنی سڑک سے دو دن کا راستہ، وہاں اسپتال بھی ہے - "

گالینا لوگوں کا طبی معائنہ کرنے میں جھجکتی اور گھبراتی کہ کہیں لوگ اس کا اناڑی‌پن نہ بھانپ لیں - وہ ان کے سینے بھی بجا کر دیکھتی اور پھیپھڑوں کی آواز بھی سننے کی کوشش کرتی تاکہ بیمار اور تندرست کے درمیان امتیاز ہو سکے - وہ بچوں کی بدہضمی کا علاج کرتی، بوڑھی عورتوں سے ان کی بیماریوں کے متعلق بتاتی لیکن یہ سب ایسے عجیب اور سر سری انداز میں کرتی کہ نتیجہ اس کی توقع کے مطابق نہ نکلتا -

ایک دن ایک معمر عورت اس کے پاس آئی جس کا سینہ بالکل سپاٹ تھا اور اس کا زرد، تھکا اور ہڈیاں نکلا ہوا چہرہ سیاہ رومال سے جھانک رہا تھا - اس کے ساتھ ایک نوجوان تھا، اس کے شیو کئے ہوئے صفاچٹ چہرے پر نرمی کے آثار تھے - بڑے بڑے ہاتھ ہتھوڑوں کی طرح دونوں طرف لٹک رہے تھے - ان کے ساتھ کمرے میں بدبو بھی آئی -

بڑھیا نے اپنے لال لال پپوٹے جھپکانا شروع کئے جن کی پلکیں اڑ چکی تھیں اور اپنے آنسو روک کر باتیں کرنے لگی:

"میں اپنے بیٹے کو تمہارے پاس لائی ہوں - کنواری مریم کی قسم چاہے جتنا میں اس کو سمجھاؤں یہ سنتا ہی نہیں... میں نے کہا کہ ذرا اپنا خیال رکھنا لیکن اس نے کوئی پرواہ نہیں کی - اگر اس کا

---

* ورسٹ ۱۰۰۶ کلومیٹر کے برابر ہے -

باپ زندہ ہوتا تو اس کو بتاتا۔ اس کی کھال ادھیڑ دیتا، تب یہ سیدھا ہو جاتا،،۔

''کیا معاملہ ہے؟،،

بڑھیا نے ایک لپٹا ہوا رومال ایک ہاتھ سے سینے پر دبا رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے لڑکے کو آگے ڈھکیل رہی تھی جو حیران تھا کہ کیا کرے۔

''بیٹا، گھبراؤ نہیں، گھبراؤ نہیں، یہ بالکل ڈاکٹر کی طرح ہیں... شرماؤ نہیں ... بالکل بیل کی طرح اڑیل... ہاں۔ تم بالکل بیل ہو...،،

لڑکے نے پریشانی میں دانت نکال دئے اور بڑی، کھردری اور مضبوط انگلیوں سے اپنا پتلون ٹٹولنے لگا، پیٹی ڈھیلی کر دی اور مجرمانہ انداز میں چکٹی اور انتہائی بدبودار قمیص اوپر گھسیٹنا شروع کی۔

گالینا لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گئی اور اچانک پریشانی کی حالت میں چلائی:

''بھاگ جاؤ... بھاگ جاؤ... بھاگ جاؤ!.. تمہارا کیا مطلب ہے... میں تمھیں حکم دیتی ہوں یہاں سے نکل جاؤ... واسیلی، نکالو ان کو یہاں سے... ارے میرے خدا یہ لوگ کیسے... مجھے یہاں سے کیسے چھٹکارا ملے؟،،

وہ زور زور سے سسکنے لگی۔ پھر درجے میں بھاگ گئی اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ لیکن بڑھیا نے اپنی آنسو بھری آنکھیں رومال سے پونچھیں اور اپنا دوسرا ہاتھ سینہ پر دباتے ہوئے دروازے کے سامنے جھک گئی:

''ارے پیاری، غریب آدمیوں سے خفا نہ ہو۔ خدا نے ہم کو سزا دی ہے... میں نے اس سے کہا کہ اپنا خیال رکھے اور لڑکیوں سے الگ رہے خصوصاً اس چپٹی ناک والی فینکا سے لیکن یہ لڑکے تو کسی کی سنتے ہی نہیں۔ اگر اس کا باپ زندہ ہوتا تو اس کا ایسا چرسا کھینچتا کہ یہ لڑکیوں کے گھر کا راستہ بھول جاتا۔ فینکا بڑی گندی لڑکی ہے اور تم خود جانتی ہو کہ اسپتال یہاں سے ۳۰ ورسٹ کے فاصلہ پر ہے۔ ہم نے اس کے پولٹس باندھی لیکن پولٹس سے کیا فائدہ۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس کو اسپتال جانا چاہئے لیکن آخر وہاں ٹھہرے گا کیسے، یہی تو اکیلا فارم پر کام کرنے والا ہے۔ بلا کسی مرد کے گھر کا کام کیسے چل سکتا ہے؟ ہر چیز برباد ہو جائیگی۔ کوزلیخا

نے اس کے پوڈر چھڑک دیا تھا، چاندنی رات تھی جب اس نے پوڈر چھڑکا تھا ۔ لیکن جیسے ہی پوڈر چھڑکا یہ خالی اپنی قمیص پہنے پاگلوں کی طرح بھاگنے دوڑنے لگا، سل تک بھاگ گیا جو یہاں سے چھہ ورسٹ ہے اور پھر گاؤں واپس آیا ۔ 'اس میں جلن ہو رہی ہے، اماں'۔ یہ چلا رہا تھا ۔ اس میں ایسی جلن ہو رہی ہے کہ میں ایک جگہ کھڑا نہیں ہو سکتا'۔ لیکن اس سے فائدہ ہوا ۔ چھالے ٹوٹ گئے اور ان سے مواد نکلا ۔ اس کو اور پوڈر لگانا چاہئے لیکن اب یہ سارے باندھے بھی کوزلیخا کے قریب نہیں جاتا ۔ تم خود دیکھ سکتی ہو کہ لڑکا جلدی چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہو سکتا ۔ "

واسیلی آیا اور اس نے بڑھیا کو کندھوں سے دھکا دے کر باھر نکال دیا اور لڑکے کی پیٹھ میں اپنے گھٹنے لگا کر زور سے دھکیل دیا تا کہ وہ زینوں کے نیچے پہنچ جائے ۔

بہت دیر تک گالینا یہ منظر نہ بھلا سکی۔ وہ گھن سے یکدم جھجک کر تھرا اٹھتی ۔ اس نے واسیلی کو حکم دیا کہ وہ مردوں کو اندر ملنے کے لئے نہ آنے دے۔ جب کبھی سڑک پر کسی نوجوان سے مڈبھیڑ ہو جاتی وہ کراھیت سے اپنی آنکھیں جھکا لیتی — وہ ان سے نفرت کرنے لگی تھی ۔

پھر بھی مرد مریض اس کے پاس آتے رہے ۔ گاڑی کی بلی سے انگلی کچل گئی، گھیٹے پڑے ہوئے سخت ھاتھوں میں کوئی پھنسی نکل آئی یا کسی کو ایسا بخار آیا جس سے وہ بید کی طرح کانپ رہا ہو اور موت کی زردی اس پر چھا گئی ہو۔

وقت آھستہ آھستہ بچوں کے شوروغل، ان کے جھگڑوں، آنسوؤں اور بےمعنی باتوں میں یکساں گزرتا گیا اور بھورے و بے کیف دن چھوٹے ہوتے گئے ۔

ایک صبح جب وہ جگی تو پورا کمرہ اور ہر چیز سفید تھی — سڑک، باڑیں، چھتیں اور بادل ۔ سفیدی کے ساتھ خاموشی بھی آئی تھی، ایسی ھلکی خاموشی جو کچھ گداز معلوم ہوتی تھی ۔ ایک گھوڑا خاموشی سے چلا جا رہا تھا اس کے جھبرے بال زمین تک لٹک رہے تھے ۔ برف گاڑی کے پھسلنے والے پٹروں سے برف ادھر ادھر آھستہ آھستہ اچھل

رھی تھی اور ایک کوا چھت کی برف کو چھوتا ھوا مکانوں پر خاموشی سے اڑ رھا تھا۔

اس ھمہ گیر خاموشی کو صرف بچے توڑ رہے تھے، ان کے گال لال ھو گئے تھے اور وہ غل مچاتے، طرح طرح کی آوازیں نکالتے اسکول آ رہے تھے۔

گاؤں کے اس پار سے ھوا کے دوش پر گھنٹیوں کی آواز آئی، مچھروں کی بھن بھناھٹ کی طرح یہ مدھم آواز بڑھتی گئی اور آخرکار گرجا کے قریب پہنچ کر رک گئی۔

وہ کون ھو سکتا تھا؟

لنچ کے بعد گاشکا دوڑتی ھوئی اسکول آئی اور جھپٹ کر زینوں پر چڑھی۔ وہ اپنے ساتھ اپنے موٹے موٹے گلابی گال، برف کی تازہ مہک اور سردی لائی تھی۔ اس کی ابھری ھوئی آنکھیں چمک اور ھنس رھی تھیں۔

''مالکہ نے آپ کو بلایا ھے — کوئی مہمان آئے ھیں''۔

''کون مہمان؟''

''ارے۔ سیاہ...'' وہ ٹھٹھا مار کر ھنسی۔ ''اور بھینگے...'' پھر اس نے ٹھٹھا لگا دیا۔

گالینا اسے غور سے دیکھنے لگی۔

''گاشا، تمھاری عمر کیا ھے؟''

مضبوط، تندرست اور گلابی چہرہ سنجیدہ ھو گیا، چمکدار ابھری ھوئی آنکھوں کی ھنسی ختم ھو گئی۔ اب وہ گھورنے لگی۔ ھنسی کی جگہ چہرے پر حماقت کھیلنے لگی اور گداز ٹھڈی سے جانوریت ٹپکنے لگی۔

''میں سات سال کی عمر تک بولتی ھی نہ تھی...''

''لڑکی خوبصورت ھے'' گالینا نے سوچا۔

''گاشا، تم کہاں کی ھو؟''

لڑکی اس کو برابر گھورتی رھی، اس کی آنکھیں اور نکل آئی تھیں۔

''ماں مجھ کو خوب پیٹتی تھی اور باپ...''

''کیا تم یہاں پیدا ھوئی تھیں؟''

''نہیں...'' اس نے اپنا سر ھلایا۔ ''پوزوفکا میں۔''

پھر وہ چہک اٹھی، تندرستی، طاقت اور قہقہوں سے بھر گئی اور چلا کر بولی:

''سہمان... جلدی کیجئے...''

جب وہ درجے سے گزر کر جا رہی تھی تو فرش کے تختے اس کے بوجھ سے جھکے جا رہے تھے اور چرچرا رہے تھے۔ برف سے سرد زینے بھی اس کے دوڑنے سے چرچرائے اور پھر وہ سڑک پر پہنچ گئی۔ وہ بیک وقت بھاری بھی تھی اور نرم بھی، وہ دوڑ رہی تھی اور اپنے نمدے کے جوتوں سے برف اچھالتی جارہی تھی۔

جب گالینا پادری کے گھر پہنچی تو حسب معمول اس کا گرم جوشی سے خیرمقدم ہوا۔ وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی پادری کی بیوی کے لئے ایک رسالہ لائی تھی۔ پادری کی بیوی یہ رسالے منگاتی تھی اور جب رسالہ آتا تھا تو بڑے اشتیاق سے اس کے ورق الٹتی پلٹتی تھی لیکن جب گالینا دوسری مرتبہ آتی تو وہ بلا پڑھے رسالہ واپس کر دیتی اور نیا مانگتی۔

''آؤ میں تمھیں ملاؤں،، پادری کی بیوی نے کہا اور پہلے گالینا کی طرف، پھر پادری اور ایک سیاہ بال والے آدمی کی طرف دیکھا جس کی عمر تقریباً ۳۲ سال ہوگی اور جس کی آنکھیں سیاہ، تیز اور ترچھی تھیں۔

''یہ ہمارے ڈاکٹر ہیں اور یہ ہماری گالینا ہے۔،، اس نے گالینا کو چوما اور اس کے کانوں کے اوپر سے جھانک کر پادری کو دیکھا جو فوراً مڑ کر ڈاکٹر کو دیکھنے لگا اور بڑی محبت سے اس کو برابر دیکھتا رہا۔ ''تم دونوں میں کافی دوستی ہونی چاہئے۔،،

ڈاکٹر نے بڑی بے التفاتی سے گالینا سے ہاتھ ملایا، اس کا چہرہ گالینا کی طرف تھا لیکن اس کی آنکھیں جو چمکدار، سیاہ اور ایسی تیز تھیں کہ ان میں پاگل پن کا ہلکا سا شائبہ معلوم ہوتا تھا اس کے پیچھے کھڑکی کے پردوں پر تھیں۔

''کورسویاروف، ضلع ڈاکٹر،، اس نے اکھڑپن سے کہا، اپنا سر تیزی سے ہلایا، گھوما اور لیدوچکا کے پاس چلا گیا:

''کیا تم اسے ابھی پی رہے ہو؟ ٹھیک ہے، پی جاؤ اور تمھیں ایک انجکشن بھی دیا جائیگا۔ گرمیوں تک تم بالکل چنگی ہو کر اچھلنے کودنے لگوگی۔،،

''خدا کرے،، اس کی ماں کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

ڈاکٹر کمرے میں ٹہلنے لگا، اس کے سیاہ بال چوکور سر پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے اپنی انگلی کناری کے پنجرے میں ڈالی، پھر کھڑکی کو انگلیوں سے بجاتا رہا۔ صوفے پر بیٹھا اور پھر اچک کر کھڑا ہو گیا۔ قالین کے ایک الٹے ہوئے کونے کو غصے سے لات ماری۔ ترچھے کھڑے ہوکر، کمرے کے دوسرے کونے کی طرف دیکھتے ہوئے گالینا سے اچانک پوچھا:

''کورس پڑھے ہیں؟''

گالینا چونک پڑی۔ اس نے سوچا کہ ''یہ کون سا امتحان ہوتا ہے؟''

''ثانوی اسکول۔''

''ہاں۔''

پھر وہ بلاوجہ ادھر ادھر ٹہلنے اور قالین کو ٹھوکریں مارنے لگا۔

''اس کی داڑھی کیسی کچی اور رنگ منگولوں کی طرح زرد ہے...'' گالینا کے دل میں خیال آیا۔

وہ پھر اس کے سامنے ترچھا کھڑا ہوا اور اس کی مخالف سمت دیکھنے لگا:

''آپ اپنے خیالات کی وجہ سے یہاں آئی ہیں نا؟ کسانوں میں علم کی روشنی پھیلانے۔ اونہہ؟''

گالینا نے بھویں سکیڑ لیں اور اس کی پیشانی پر بل آ گئے۔

''امتحان؟!'' اس نے سوچا۔

چائے کی میز پر انھوں نے ایک دوسرے سے ذرا بھی بات چیت نہیں کی۔ رات میں سفید و سیاہ کھڑکیوں میں برف ھلکی ھلکی چمک رہی تھی اور گھڑی ٹک ٹک کر رہی تھی۔

ڈاکٹر اپنے گلاس سے چائے کے گھونٹ لے رہا تھا اور باتیں کرتا جاتا تھا:

''خدا جانے یہ لوگ کس چیز کے بنے ہیں۔ پوزوفکا میں خارش پھیل گئی ہے، ذرا سوچئے تو۔''

''بالکل قطب شمالی کی طرح'' پادری دمیتری نے کہا۔

''میں اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ گھر گھر جا کر سائٹریک ایسڈ اور پھلوں کا رس بانٹتا ہوں...''

''پہلے تو ان کو کھانا کھلانا چاہئے'' پادری کی بیوی نے کہا۔

پادری دمیتری نے اس کو غصے سے دیکھا :

''کھا... نا... کھلا... نا چاهئے...''

ڈاکٹر نے اپنا ایک پیر گھٹنے پر رکھ کر اپنے جوتے کا تلا دیکھنے کی کوشش کی کہ کہیں نکل نہیں گیا ہے ۔ پھر اس نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا، جھکا اور آتش دان کے کھلے منہ میں دھواں چھوڑ دیا جہاں ایک سرخ لرزاں شعلہ فرش پر هلکا سا لہراتا ہوا دکھائی دے رہا تھا اور آرام‌دہ گرمی پھیلا رہا تھا ۔

''ہم ایک گھر میں گئے، شوہر مر رہا تھا، اس کو بہت دنوں سے فتق کا مرض تھا، وہ بنچ پر پڑا تھا اور اس کے بازو نیچے لٹک رہے تھے ۔ اس کے پیر نیلے ہو چکے تھے ۔ اس کی بیوی اپنا اسکرٹ اوپر چڑھائے چولھے کے پاس مشغول تھی ۔ کچے فرش پر ایک بچہ سور کے پیٹ پر سر رکھے پڑا تھا ۔ سور غرا رہا تھا جس سے دونوں خوش ہو رہے تھے ۔ ایک بچھڑا کھڑا بنچ پر پڑے ہوئے آدمی کو دیکھ رہا تھا ۔ اس نے آدمی کے پیٹ پر سے قمیص چبانا شروع کر دی ۔ آدمی نے اپنی اکڑی ہوئی انگلیاں مشکل سے چلائیں اور پھر بچھڑے کی طرف سے نظر ہٹا کر عورت کو دیکھنے لگا اور بہت کوشش کرکے کہا : 'آخر دیکھتی کیوں نہیں... چڑیل...'، عورت چولھا چھوڑ کر جھپٹی اور بچھڑے کے منہ پر کچھ مارتے ہوئے کہنے لگی : 'چپ چاپ پڑے رہو ! دیکھو خدا نے تمھیں کیسی سزا دی ہے ۔ کیسا پڑا ہے ۔ ہر چیز گڑ بڑ ہے لیکن اس کو کوئی پرواہ نہیں...'، میں نے اس کی نبض دیکھی، اپنی پچکاری اور کافور نکالا اور اس کو انجکشن دیا ۔ اس کی حالت خراب تھی، آخری سانسیں تھیں ۔ عورت نے اپنا سر دروازے سے نکالا اور چلائی : 'گاشکا، گاشکا... یہ کتیا کہاں چلی گئی...'، ڈیوڑھی سے لڑکوں کے کھیلنے کی آواز آ رہی تھی ۔ عورت نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور ہاتھ مل کر کہنے لگی : 'مر رہے ہو ! مجھے کیوں چھوڑے جا رہے ہو ؟'، اور اس نے اپنی دم نکلتی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف تیوری چڑھا کر دیکھا اور ایسی آواز میں جو مشکل سے سنائی دیتی تھی کہا : 'مرو، تم خود...'، اس نے جملہ پورا بھی نہیں کیا تھا کہ اس کا جبڑا بند ہو گیا ۔ عورت نے اپنا سر لاش پر ڈال دیا اور چیخنے لگی، پھر اچانک اچک کر اپنے کونڈے کے پاس پہنچ گئی جس میں خمیر اٹھ رہا تھا ۔ 'ارے میرے خدا، اس نے کہا اور آٹا گوندھنے

لگی کیونکہ روٹی پکانا نہیں روکا جا سکتا تھا۔ میری ملاقات اس عورت سے بعد کو پھر ھوئی۔ اس کا چہرہ بالکل ست گیا تھا، آنکھیں دھنس گئی تھیں، وہ صبر و غم کی ایک خاموش تصویر تھی... کسانوں کے اپنے قوانین زندگی ھیں...،،

وہ اٹھ کر پھر کمرے میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ قالین کو پھر ٹھوکر ماری حالانکہ اب قالین الٹا نہیں تھا۔ پادری کی بیوی نے کناری کا پنجرا ڈھک دیا تاکہ روشنی کی وجہ سے چڑیا کے سونے میں خلل نہ پڑے۔

''ھمارے کسان، ھمارے دھقان ایک زبردست تاریکی میں زندگی بسر کرتے ھیں لیکن وہ دل کے نرم ھوتے ھیں،، پادری دمیتری نے اپنی آستین چڑھاتے ھوئے کہا۔ ''مجھے ایک واقعہ پیش آیا...،،

گالینا نظریں جھکائے بیٹھی رھی۔ اس کی پلکوں کا سایہ اس کے چہرے پر پڑ رھا تھا جس سے حیا کا اظہار ھوتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے گندے، گھامڑ بچے، گندگی اور نیکیفور لوکیچ کے سامنے کتے کی طرح دم ھلانےوالے لوگوں کا ایک تاریک اور گھنا جنگل پھر رھا تھا۔ ساتھ ھی ساتھ اس میں ایسے جذبات پیدا ھوئے جس میں تضاد تھا۔ اسے خیال آیا کہ کسی صورت سے ڈاکٹر کی خوداعتمادی توڑنا چاھئے۔

''لوگوں پر اس کا الزام دھرنا آسان ھے... ان کو ملزم ٹھہرانا آسان ھے،، اس نے کہا اور اپنی بات کی وضاحت کرنے کی اھلیت نہ پاکر سرخ ھوگئی کیونکہ جو کچھ وہ کہہ رھی تھی وہ اس کے اپنے مشاھدے اور خیالات کے خلاف تھا۔ ''لوگوں کی حالت بہت خراب... ان کی زندگی بڑی کٹھن...،،

دو بہت تیز ترچھی نگاھوں نے اس کو گھیر لیا اور اس کو محسوس ھوا جیسے ان میں نفرت بھری ھے۔

''لوگ! کون لوگ؟،،

وہ ایک کونے سے دوسرے کونے تک دوڑ رھا تھا۔ اس نے اپنے پیر سے قالین کا کونا سیدھا کیا جو اس نے خود الٹ دیا تھا، ڈھکی ھوئی کناری کو جھانک کر دیکھا اور گالینا کے چہرے پر آنکھیں گاڑ کر اس طرح قریب آتا گیا جیسے اس کو مسحور کرنے کے لئے ھپناٹزم کر رھا ھو۔

''آپ کا نیکیفور لوکیچ بھی تو آخر لوگوں ھی میں سے ھے - وہ ۲۳ گاؤں میں خارش کا باعث ھے - اس نے ان گاؤں‌والوں کا سب کچھ ھڑپ کر لیا ھے بس ان کے پاس اب ھڈی چمڑا چبانے کے لئے رہ گیا ھے... لوگ! ھر دھقان... اونہہ باتیں بنانے سے کیا فائدہ...''

جیسے وہ ضبط کرنے کی کوشش کر رھا ھو اس نے اپنے بال برابر کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اور کھڑے ھو گئے - وہ پھر آتش‌دان کے پاس بیٹھ گیا جس کی وجہ سے اس کا ایک رخ بالکل سرخ خون دکھائی دینے لگا اور اس کا کھڑے بالوں‌والا سایہ ٹوٹے پھوٹے خطوط میں سوفے اور دیوار پر پڑکر ساکت ھوگیا -

''لوگ! .. ھر کسان اس وقت تک اچھا، مہربان اور نرم دل رھتا ھے جب تک اس کے گلے میں پھندا پڑا رھے ، جب وہ بنچ پر پڑا سر رھا ھو اور اس کے پیٹ پر سے بچھڑا قمیص چبا رھا ھو- لیکن اس حالت سے نکلتے ھی وہ اپنے پڑوسیوں کے گلے میں پھندا ڈال دیتا ھے - نیکیفور لوکیچ تو انتہائی ظالم اور بڑا خونخوار ھے - اسی طرح کا کسان بھی ھوتا ھے — یا تو اس کا خون کوئی چوستا ھے یا وہ کسی کا خون چوستا ھے - تمھیں پتہ نہیں کہ جب میں ان لوگوں کے بازو اور پیر یا پیٹ کاٹتا ھوں تو مجھے کتنی خوشی ھوتی ھے — ھر چھہ میں سے ایک ضرور فتق کا مریض ھوتا ھے - ''

''میرے تین گھرے رنگ کے سرنگ گھوڑے چوری گئے'' پادری نے کہا اور پھر عادت کے مطابق اپنی چوڑی آستین ٹھیک کی - ''اور پھر میں نے کیا دیکھا کہ وھی آدمی آکر میرے کھاد کے ڈھیر میں بیٹھ گیا...''

''نہیں، آپ کو حقیقت کا سامنا کرنا پڑیگا، اپنی آنکھیں بند کر لینا یا اپنا سر تکئے کے نیچے چھپانا ٹھیک نہیں ھے'' ڈاکٹر نے لقمہ دیا، اس کی آنکھیں چمک رھی تھیں اور اس کی توجہ پادری کی طرف نہیں تھی -

گالینا اب بھی اس سے کشیدہ تھی - اس نے آنکھیں اوپر اٹھائے بغیر سوچا : ''یہ کسی ایک کسان کا سوال نہ تھا بلکہ تمام کسانوں کا معاملہ تھا - ''

دراصل اس کا خیال یہی تھا - صرف وہ الفاظ میں اس کی وضاحت نہیں کر پاتی تھی - بہر حال مخالفت کے جذبے کے ماتحت اس نے بڑی عجلت سے ایک دلیل پیش کرنے کی کوشش کی جو اس نے کسی

کتاب میں پڑھی تھی۔ اس میں ''لوگ'' کا لفظ پوری دیہاتی زندگی کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔

اس نے اپنی بات پھر دھرائی:

''کسانوں کو ملزم ٹھہرانا آسان ہے۔ اس سے زیادہ کوئی آسان بات نہیں۔ لیکن اگر آپ دیکھیں کہ وہ کس طرح زندگی بسر کرتے ھیں۔ جو مصائب...''

یہ محسوس کرکے کہ پھر وہ جو کچھ کہنا چاھتی تھی نہیں کہہ رھی ہے اس نے جانے کی اجازت چاھی۔

''گالینا، ھمارے یہاں آیا کرو، تم تو ھم لوگوں کو بھول ھی گئی ہو۔ یہ رھا تمہارا رسالہ۔ مجھے اسے پڑھنے کا پھر وقت نہیں ملا۔ میں پھر پڑھونگی۔ جب نیا رسالہ آئے تو لانا۔''

پادری کی بیوی نے اس کو چوما اور پھر کنانکھیوں سے اپنے شوھر کی طرف دیکھا۔

تاریک سڑک پر سخت سردی تھی اور اندھیری جھونپڑیوں کے اوپر نیلی خلا میں تارے چمک رہے تھے۔

پا افتادہ راستے پر برف پیروں کے نیچے چر مرا رھی تھی۔ اس نے اپنے دانت بھینچ کر ایک خوشکن جھر جھری روکی جو خصوصاً ایسے وقت محسوس ھوتی ہے جب آدمی کوئی گرم گھر چھوڑکر باھر سردی میں جاتا ہے۔

برساتی کے زینوں پر اس نے ایک لمحے کے لئے مڑکر دیکھا۔ اس کو محسوس ھو رھا تھا جیسے ڈاکٹر سرد تاریکی میں آ رھا ہے اور اس کا لمبا، بال‌دار کوٹ اس کے پیروں میں الجھ رھا ہے۔

اس نے دروازہ بند کر لیا، اپنے کمرے میں چلی گئی، لیمپ جلائے بغیر جلدی سے کپڑے اتارے کیونکہ وہ اس صاف اور ٹھنڈے بستر کے لئے بےتاب تھی جو اس کے کمبل اوڑھتے ھی گرم ھو جائے گا۔

ایسا معلوم ھوتا تھا کہ جاڑا کبھی ختم ھی نہ ھوگا۔ وھی برف میں ڈھکی ھوئی جھونپڑیاں تھیں جو بوڑھیوں کی طرح سفید ٹوپی پہنے معلوم ھوتی تھیں، وھی لامحدود برف گاؤں سے باھر دور تک پھیلتی چلی گئی تھی، برف کے ڈھیروں کے درمیان وھی گہری لیک تھی جو گاؤں کی سڑک پر برف‌گاڑیوں کے گذرنے سے بن گئی تھی — جب برف گاڑیاں

گزرتیں تو برف کے اوپر صرف سر اور شانے دکھائی دیتے تھے، کنوئیں کے چاروں طرف برف کے تودے روزبروز اونچے ہوتے جا رہے تھے اور جب گھوڑے حوض پر پانی پینے آتے تو ان کو ایک گھٹنا برف پر ٹیکنا پڑتا ــ کسان برف کاٹنے کی پرواہ نہ کرتے۔

کرسمس سے پہلے گالینا اور پادری کی بیوی ایک کرسمس پارٹی میں شرکت کے لئے گاڑی پر ایک گاؤں گئے جو پندرہ ورسٹ کے فاصلہ پر تھا۔ یہ پارٹی ایک اسکول میں تھی، یہاں اس کی ملاقات اپنے هم پیشہ ٹیچروں، استادوں اور استانیوں سے ہوئی۔

پھر ایک مرتبہ اس کو تمام چیزیں توقع کے خلاف بالکل عام معلوم ہوئیں۔

بالکل معمولی لوگ، وہ آپس میں ہنسی مذاق اور لگاوٹ کی باتیں کر رہے تھے۔ غریبی، مظلومیت کا کوئی خاص نشان نہ تھا اور نہ تو اس بات کا پتہ چلتا تھا کہ یہ لوگ جاهلیت کی تاریکی میں علم کی روشنی پھیلانے کا اعلی کام خاموشی سے کر رہے ہیں۔

وہاں وہ پراسرار رومانی فضا بھی نہ تھی جو بڑی خوبصورتی سے انسان کی حقیقی زندگی پر پردہ ڈال دیتی ہے: یہاں کی دیواریں آنسوؤں سے تر تھیں اور گالینا کو اپنے دل کی گہرائیوں میں اس بات پر ایک کسک سی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ گوشت مشکل سے ملتا ہے اور دودھ گراں ہو گیا ہے۔ وہ انسپکٹر، امتحانوں اور اسکول بورڈ کے متعلق باتیں کرتے رہے اور اپنے غیر حاضر ساتھیوں کے بارے میں طرح طرح کی گپیں ہانکتے رہے۔ یہ سب باتیں اتنی سیدھی سادی اور اتنی عام تھیں کہ کچھ بےتکی سی معلوم ہونے لگیں۔

جب وہ پادری کی بیوی کے ساتھ وہاں سے واپس ہو رہی تھی تو اس نے اپنا چہرہ شدید سرد ہوا سے بچانے کے لئے آستین کے پرانے فر سے چھپا لیا۔ اس کو ایک آسودگی سی تھی جیسے اس کے تجربوں میں زندگی کے کسی نئے پہلو کا اضافہ ہوا ہو۔

اس کو یہ یاد کرکے خوشی ہوئی کہ جب وہ اور پادری کی بیوی برف گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہونے والے تھے تو سب ٹیچر، مرد اور عورتیں، ان کو رخصت کرنے آئے تھے اور اس نے اور پادری کی بیوی نے چلا کر ان سے کہا تھا:

''اندر جاؤ، سردی کھا جاؤگے۔ ''
...آخرکار ایک افسر اسکول آیا۔ یہ واقعہ ایک دن لنچ کے بعد ہوا۔

صبح سے ذرا گرمی تھی۔ برف جم کر اور پکی پڑ گئی تھی۔ دور جنگل اور آسمان کے افق کا رنگ نیلگوں تھا۔ اسکول خالی ہو چکا تھا اور گالینا لنچ کے بعد گاؤں کی دوکان چلی گئی تھی۔

حسب معمول ایوان فیودورویچ نے اسے بہت جھک کر سلام کیا اور اس سے حالات بیان کرنا شروع کر دئیے:

''دیکھئے یہ ایسے ہے۔ میری بیوی بیمار ہے۔ آپ تو جانتی ہیں کہ اس کے کولھے ذرا موٹے ہیں۔ بہتر یہی تھا کہ اس کا خون نکالا جائے۔ چنانچہ فصد کھولی گئی اور اس کے ساتھ بڑی بدبو نکلی۔ بس وہ ایک بورے کی طرح گر پڑی اور پھر نہ اٹھ سکی۔ اچھا۔ ''

اچانک اس نے اپنا منہ ایک طرف اٹھایا اور سننے لگا۔

''گھنٹیوں والی برف‌گاڑی ... یہ پولیس انسپکٹر نہیں ہے، اس کی گھنٹی بڑے زور سے بجتی ہے... ٹن... ٹن... ٹن... یہ تو چھوٹی گھنٹی ہے۔ یہ پولیس سرجنٹ نہیں ہے اور یہ بیمےوالا بھی نہیں ہے کیونکہ اس کی گاڑی کے ساز میں گھنٹیاں لگی ہیں۔ کیا کوئی آدمی آپ سے ملنے آ رہا ہے؟ سنئے، وہ بڑھا کانا لڑکوں کو بھگا رہا ہے۔ ممکن ہے کہ انسپکٹر ہو۔ وہ بہت ہنگامہ کریگا۔ اپنے کو بڑی اہم شخصیت سمجھتا ہے۔ ''

گالینا سڑک پر آ گئی، واسیلی ننگے سر ان جھونپڑیوں کی قطار میں دوڑ رہا تھا جو شام کے دھندلکے میں غائب ہو گئی تھی اور کھڑکیوں پر اپنی چھڑی سے کھٹ کھٹا کر چلا رہا تھا:

''بچوں کو اسکول بھیجو، انسپکٹر آیا ہے''۔

وہ دوڑ کر گالینا کے پاس آیا:

''انسپکٹر آیا ہے، آپ کو پوچھ رہا ہے۔ ''

اسکول کے پاس ایک چوڑی تین گھوڑوں کی برف‌گاڑی کھڑی تھی جس میں قالین پڑا تھا۔ گاڑی کے ساز کی گھنٹیاں ابھی تک ہلکی ہلکی بج رہی تھیں۔

بلاروشنی کے نیم تاریک درجے میں ایک چھوٹا گول‌مٹول شخص بھیڑئے کی کھال کا لمبا کوٹ، بال‌دار ٹوپی اور گرم بوٹ پہنے ٹہل

رها تھا اور بےتکلفی سے ٹیچر کے کمرے میں جھانک رہا تھا۔ وہ ہر لمحہ گھوم کر دیکھتا اور چلاتا:

"بےحد خراب، کوئی ضابطہ نہیں! اس کے کیا معنی؟"

شام کی دھندلی روشنی میں اس نے گالینا کو فر کوٹ اور ٹوپی پہنے ہوئے دیکھا اور اس کی طرف گھوم پڑا:

"تو آپ نے مجھے انتظار کرایا!.."

"مجھے پہلے سے اطلاع نہ تھی..."

"کیا آپ چاہتی تھیں کہ میں آپ کے پاس کوئی وفد بھیجتا؟.. اور اسکول، ظاہر ہے بالکل برباد ہو گیا ہے... اچھا۔ تو کیا آپ میرا خیرمقدم اوورکوٹ پہنے پہنے کرینگی؟.."

گالینا کی حلق رندھ سی گئی اور وہ اپنا اوورکوٹ اتارنے چلی گئی۔ بچے درجے میں بھر گئے، انھوں نے چاروں طرف سہم‌سہم کر دیکھا پھر اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ واسیلی نے لیمپ جلایا۔ گالینا کنارے کی ڈسک کے پاس کھڑی تھی اور اپنے اوپر قابو رکھنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔

چھوٹا گول مٹول آدمی اب بھی درجے میں ادھر ادھر ٹہل رہا تھا، اس کا اوورکوٹ فرش پر لوٹ رہا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ بھی گالینا کی طرف نہیں دیکھا۔

"عبادت!"

بچے اپنے پیر پٹکتے اور کھڑبڑاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے بزرگ کی شبیہ کی طرف اپنا رخ پھیر دیا جو اندھیرے کونے میں ہونے کی وجہ سے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ انسپکٹر اپنی پیشانی پر تین انگلیاں رکھے انتظار کر رہا تھا۔

"مارفوشا، دعا پڑھو..." گالینا نے اپنے رندھے ہوئے گلے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"اس کو خاندانی نام سے پکارو!.." انسپکٹر نے تیز آواز میں چلا کر کہا۔ وہ اپنی انگلیاں پیشانی پر رکھے رہا اور اپنا سر ذرا جھکا کر انتظار کرنے لگا۔

گالینا سکنڈ بھر کے لئے ٹھٹھکی اور پھر یادداشت پر زور دیکر بولی:

"بلاندینا، دعا پڑھو..."

چھوٹی لڑکی نے اپنی نیلی آنکھیں اندھیرے کونے کی طرف اٹھائیں، اپنی انگلیاں انسپکٹر کی طرح پیشانی پر رکھیں اور باریک آواز میں شروع کیا:

"مقدس‌ترین..."

اچانک اس نے اپنا سر پھیرا اور اپنی استانی کی طرف ہاتھ کے نیچے سے دیکھتے ہوئے کہنے لگی:

"ہم آج صبح تو دعا پڑھ چکے تھے..."

"پڑھو، پڑھو..."

انسپکٹر درجے میں ادھر ادھر ٹہل کر پھر رہا تھا۔

"آپ کو اسکول کے ضابطے کا بھی کچھ دھیان ہے یا محض آپ کے لئے یہ کوئی خالی خولی لفظ ہے؟"

"مقدس‌ترین خدا اپنے روح‌القدس کے ذریعہ برکتیں نازل کر..."

انسپکٹر نے بڑے زور سے اپنے اوپر صلیب بنائی اور بچوں کی طرف دیکھا۔ انھوں نے بھی زوروں سے اپنے اوپر صلیب بنائی۔

جب دعا ختم ہو چکی تو انسپکٹر نے ان سے سوالات شروع کئے:

"سرے والے لڑکے بتاؤ، سات سیب اور تین اور ان میں سے چار نکال لو اور باقی کو تین لڑکوں میں تقسیم کر دو۔ ہر لڑکے کو کتنے ملیں گے؟"

لڑکا اس کی طرف منہ اور آنکھیں کھولے ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا۔

"اچھا۔ اچھا۔ ادھر آنا... ذرا اپنا ہاتھ دکھانا۔"

لڑکا یہ نہیں سمجھ سکا کہ وہ چاہتا کیا ہے لیکن اس نے اپنے ہاتھ بڑھا دئے جس میں بڑے بڑے گندے ناخن تھے۔

"تم ان کو ہاتھ کہتے ہو؟ یہ تو پنجے اور چنگل ہیں۔ اچھا۔ اب تم اور تم اپنے ہاتھ دکھاؤ... سب ایک سے ہیں، جانوروں کے پنجے، یہ ہاتھ نہیں ہیں۔ اپنے ناخن فوراً کٹواؤ۔ جاؤ، بھاگو اپنے گھروں کو!.."

لڑکے جو اب بھی نہیں سمجھ سکے تھے کہ بات کیا ہے اپنے شانے جھکا کر خرگوشوں کی طرح انسپکٹر کو دیکھتے، ایک دوسرے کو دھکے دیتے اور ٹکراتے درجے سے نکلے اور سڑک پر پہنچ کر تیز بھاگ لئے۔

انسپکٹر درجے میں ادھر ادھر ٹہلتا رہا، پھر ٹھیک گالینا کے سامنے آ کر رک گیا جہاں وہ ابھی تک بےحس و حرکت کھڑی ہوئی تھی۔

''میں آپ کو بتانا چاھتا ھوں...'' اور اچانک رک گیا۔

ابھی تک اس نے استانی کے چہرے کی طرف نہیں دیکھا تھا، ابھی تک اس نے ایک گونگی اور بےحس و حرکت مورتی کی موجودگی محسوس کی تھی۔ اب اس نے الجھی ھوئی گھنی پلکوں میں کنواری آنکھیں دیکھیں، آنکھیں جو چمکدار اور بھیگی ھوئی تھیں اور اس کا سبب یا تو هیجانی کیفیت تھی یا شرم‌ورنج کا احساس تھا۔ اس کے رخسار شباب کی گرمی سے دھک رہے تھے۔

''بیٹھ جائیے، مہربانی کرکے... جب بچے یہاں تھے، تو آپ نہیں بیٹھ سکتی تھیں کیونکه ضابطه ضروری چیز ھے... ھونہه۔ ارے، کوئی ھے؟'' انسپکٹر اپنا بھاری کوٹ اتارنے کی کوشش کر رھا تھا۔ ''اے، چوکیدار!''

''واسیلی!'' گالینا نے چوکیدار کو پکارا۔ ''کوٹ اتارنے میں آپ کی مدد کرو۔''

واسیلی نے بےتکےپن سے کوٹ گھسیٹ لیا اور انسپکٹر نے یه کام سلیقے سے کرنے کی کوشش میں ربڑ کے جوتے اتارنے کے لئے اپنا بڑا پیٹ مشکل سے جھکایا۔

اوورکوٹ کے بغیر وہ اور بھی گول‌مٹول معلوم ھونے لگا، اس کا چہرہ بالکل صاف تھا صرف ٹھڈی پر تین سفید بال نظر آرھے تھے۔ وہ برابر اپنے ھاتھ ملتا جا رھا تھا۔

''میری نوکری بڑی واھیات ھے۔ میں تھک گیا ھوں۔ سمجھیں نا! تھک گیا ھوں۔ میں نے لمبا سفر کیا ھے اور سردی کے مارے ٹھٹھرا جا رھا ھوں۔ یه اچھا ھے که دن ذرا گرم ھے... مجھے ابھی اور آگے جانا ھے۔ ھاں، ورنه میں دورہ پورا نہیں کر پاؤنگا... ھر جگه لاپروائی ھے... آپ کو یقین نه آئےگا، یه اسکول نہیں ھیں، خدا جانے کیا ھیں... آپ کے شاگردوں کو دیکھ کر اچھا خیال ھوتا ھے، ذھین چہرے ھیں... دوسرے الفاظ میں بالکل مختلف...''

اس نے اپنے ھاتھ ملے، ایک ڈسک پر بیٹھ گیا اور پھر اٹھ کھڑا ھوا۔

''میرے خدا! آخر یه چاھتا کیا ھے؟..'' گالینا سوچنے لگی۔

''یقین کرنا، مجھے آج پورے دن ایک گھونٹ چائے پینے کا بھی وقت نہیں ملا... بس جلدی، جلدی ...''

''کیا آپ چائے پئینگے؟'' گالینا نے اپنی پریشانی میں ھچکچاتے ہوئے پوچھا۔

''اگر آپ کو زحمت نہ ہو ... اگر زحمت نہ ہو ... میں آپ کو زحمت دیتے ہوئے ڈرتا ہوں ... اجازت دیجئے۔''

یہ کہہ کر وہ گالینا کے کمرے میں چلا گیا اور گالینا نے واسیلی کو بلایا۔

''واسیلی، ذرا سماور جلا دو اور اس کو اندر لاکر رکھ دو لیکن دیکھو اس کے بعد چلے مت جانا، دروازے کے قریب بیٹھنا۔ جانا نہیں...''

انسپکٹر نے وہ پوسٹ کارڈ دیکھے جو خوشکن بےترتیبی سے لکڑی کی دیوار پر لگے تھے اور صاف بستر، کتابیں اور رسالے بھی۔ یہاں کی فضا میں آرام، خوشی اور اچھوتی صفائی تھی۔

چھوٹا ہرا سماور ابل رہا تھا اور کبھی کبھی مدھم، سادی آواز میں گنگنانے بھی لگتا تھا۔

انسپکٹر برابر باتیں کئے جا رہا تھا۔ اس نے شہر کی تمام خبریں بتائیں، ڈائرکٹر کو برا بھلا کہا اور تھیٹروں کے متعلق تمام اطلاعات دیں۔

''صاف بات یہ ہے کہ ہماری نوکری بھی بڑی گھٹیا ہے۔ دو کوڑی کی۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ سب ہم کو کوستی ہیں اور ہم سے پریشان رہتی ہیں۔ اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو یہی کرتا... میں ایک زمانے میں ثانوی اسکول میں ٹیچر تھا لیکن پرنسپل سے نہ نبھ سکی... یہ سب شاگردوں کی وجہ سے ہوا۔ لوگ کہتے تھے کہ میں ان کے ساتھ بہت نرمی برتتا ہوں۔ چنانچہ نوکری چھوڑنی پڑی... میں جانتا ہوں کہ میری نوکری بڑی گھٹیا ہے۔ ہر شخص پر کتے کی طرح جھپٹنا، بھونکنا اور زور سے کاٹنا۔ اگر آدمی ایسا نہ کرے تو افسران اس سے جواب طلب کر لیں۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے لیکن اس سے کسی کو فائدہ نہیں ہوتا۔''

''کچھ پاگل ہو گیا ہے؟'' گالینا نے اپنے سے سوال کیا۔

گالینا کئی مرتبہ یہ دیکھنے باھر گئی کہ واسیلی بیٹھا ھے یا نہیں۔ وہ ایک بنچ پر بیٹھا اونگھ اونگھ کر سر ھلا رھا تھا۔ واپس ھوتے ھوئے اس نے ادھ کھلے دروازے سے جھانک کر دیکھا، چھوٹے آئینے میں انسپکٹر ایک چھدری لٹ کان کے پیچھے سے لا کر اپنے گنجے سر پر جما رھا ھے۔

کھڑکی سے پتہ چل رھا تھا کہ رات اندھیری ھے اور گاڑی کے ساز کی گھنٹیاں تھکے گھوڑوں کے ھلنے سے آھستہ آھستہ بج رھی تھیں۔

''اچھا، میں کس طرح سے کہوں... میں نے ابھی تک شادی نہیں کی ھے اور کہاوت ھے کہ مالکہ کے بغیر گھر یتیم سا رھتا ھے۔ دوسری طرف یہ بھی ھے کہ جب آدمی کو زندگی کام کرکے گزارنا ھے تو پھر ان سب باتوں سے کیا فائدہ؟''

گالینا نے اس کی طرف سکون سے دیکھا۔ اس کے گول سر اور بٹن جیسی ناک کو، اور اچانک محسوس کیا جیسے وہ خود انسپکٹر ھو اور انسپکٹر ٹیچر ھو۔ اس نے اپنی ھنسی روکی اور اس کو اور چائے دی۔

بارہ بجے کے قریب انسپکٹر رخصت ھوا۔ تاریک کھڑکی کے باھر ساز اور گاڑی کی گھنٹیاں بج رھی تھیں، رفتہ رفتہ ان کی آواز مدھم ھوکر عام خاموشی میں غائب ھوگئی۔

گالینا ذرا دیر خاموش کھڑی رھی پھر اس نے اپنا آئینہ اٹھا کر دیکھا۔ ایک خوبصورت چہرہ، جھکی ھوئی آنکھیں اور پرغرور ناک اس کو گھور رھی تھی۔ وہ مسکرائی اور آئینے میں ایک خوبصورت مسکراتا ھوا چہرہ نظر آیا جس میں دلکش موھنیاں پڑ گئی تھیں۔

''کیسا احمق ھے یہ۔''

اس نے آئینہ اپنی جگہ پر لٹکا دیا۔

وہ جتنی جلدی ممکن تھا سو جانا چاھتی تھی لیکن اس کی آنکھوں کے سامنے اب بھی انسپکٹر کی تصویر تھی۔ بس، وہ برف گاڑی میں برابر چلا ھی جا رھا ھے۔ بےچین، اس کی کسی کو پروا نہیں تھی۔ اور پھر وہ کچھ سوچنے لگی۔ اس نے ٹھڈی تک کمبل اپنے اوپر کھینچ لیا۔

''بیوقوف!''

اور پھر کسی نے اس سے پوچھا:

''کیا خوشی صرف تمھارے ھی لئے بنی ھے؟''

''لیکن میں میں ھوں اور وہ...''
وہ بڑے سکون سے نیند کے آغوش میں چلی گئی۔

دوسرے دن صبح کو گالینا لڑکوں کو بڑی دیر تک قابو میں نہ لا سکی۔ وہ جھنڈ کے جھنڈ کھڑے ھوکر انسپکٹر کے متعلق باتیں کر رہے تھے اور ایک دوسرے کی بات کاٹتے جاتے تھے۔ وہ اس کے بھیڑئیے کی کھال کے کوٹ، بالدار ٹوپی اور بڑے بڑے بوٹوں کی باتیں کر رہے تھے۔
''گالینا الکساندرووونا، ھمیں اپنے چنگل کاٹنے کے لئے قینچی دیجئیے...''
سبق کے آدھے وقت وہ ایک دوسرے کے ناخن کاٹتے رہے۔ چیخیں اور قہقہے بلند ھوتے رہے۔ کسی کا ناخن زندہ کٹ گیا اور خون بہہ نکلا۔ سورج مکھی کے بیجوں کے چھلکوں کی طرح کٹے ھوئے ناخنوں اور ان سے نکلے ھوئے سیاہ میل کے ڈھیر ڈسکوں پر لگے تھے۔
''کل کے سوال کا جواب کون دے سکتا ھے؟''
''میں، میں!''
سب اچک کر کھڑے ھو گئے۔
گالینا نے پھر سوال کو بہت صاف صاف دھرایا اور بچوں کی پھٹی پھٹی گھورتی آنکھوں کو دیکھ کر متحیر رہ گئی۔
''ارے یہ لڑکیاں اور لڑکے تو بالکل نئے ھو گئے...'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ''یہ کب...''
''اچھا، بتاؤ؟''
''تین۔''
''دو۔ دو۔ دو!..'' وہ سب اپنے ھاتھ اٹھا کر چلائے۔
''ٹھیک، ھر ایک کو دو سیب ملے۔''
اس نے محسوس کیا جیسے اب وہ بچوں سے قریب ھوگئی ھے اور کہا: ''اچھا اب میں تم کو پڑھ کر سناؤنگی۔''
بچے بڑی خوشی سے قریب‌ترین ڈسکوں پر آ گئے اور ایک دوسرے سے بھڑ کر کھڑے ھو گئے۔
پہلی مرتبہ اس کو بچوں کو پڑھ کر سنانے میں خوشی ھوئی۔ وہ کبھی کبھی ان پر سرسری نظر ڈال لیتی اور دیکھتی کہ پچاس بچے اس کی طرف بڑی توجہ سے گھور رہے ھیں۔

"اور اس کے سامنے یہ سب کیسے احمق ہو گئے تھے..."
تھوڑے دن بعد انسپکٹر پھر اچانک آیا۔ وہ بہت گھبرایا معلوم ہوتا تھا۔ اس مرتبہ وہ دن میں آیا اور یہ عذر پیش کیا کہ اس کو اسی راستے سے واپس ہونا تھا۔ اس نے سبق پر پورا گھنٹہ صرف کیا اور بچوں سے بڑی نرمی سے سوالات کرتا رہا۔

گالینا اپنی مسکراہٹ چھپائے ہوئے اطمینان سے سبق پڑھاتی رہی۔

"ایسوں کو خوب سونڈنا چاہئے" اس نے سوچا۔

اس نے انسپکٹر سے بڑے اعتماد کے ساتھ لائبریری کی رقم کے لئے کہا۔ انسپکٹر نے تھوڑے سے تکلف کے بعد وعدہ کر لیا کہ اس کا انتظام کر دیگا۔ اس نے کہا کہ وہ ڈائرکٹر سے کہیگا اور اسکول کے ٹرسٹی نیکیفور لوکیچ سے بھی۔

گالینا نے بڑے کھرے انداز میں اس کا شکریہ ادا کیا۔

گاؤں میں بھی قید تنہائی کی طرح وقت بڑی مشکل سے گزرتا ہے، پھر بھی دیکھتے دیکھتے مہینے اور سال گزر جاتے ہیں۔

آخرکار موسم سرما میں پالے کا دور گزرگیا اور سردی کم ہونے لگی۔ دھوپ کے رخ پر، چھتوں کی برف گھل گھل کر ٹپکنے لگی۔ برف پر سائے زیادہ گہرے نیلے ہو گئے۔ اب سورج جھونپڑیوں کی قطاروں کے اس حصے سے دن بدن قریب نکلنے لگا جو گرجا کی طرف تھا۔ گرمیوں میں سورج گرجا کی پرلی طرف سے نکلے گا۔

گالینا کی زندگی حسب دستور گزرتی گئی۔ وہی بچے، وہی تھکی ہاری عورتیں، بیماری اور مصائب، وہی آدمی جو طرح طرح کے کاموں سے اس کے پاس آتے تھے، وہی برف سے پٹی ہوئی سڑک اور وہی برفانی ٹیلے کے بیچ میں کنواں۔

اور کہیں دور، بہت دور شہر تھا، تھیٹر تھا، "حکم کی بیگم"، ناچنے گانے کی شامیں اور جوانی تھی — ہر وہ چیز جس کے بغیر زندگی اجیرن معلوم ہوتی ہے، کہیں دور جا کر غائب ہو گئی تھی اور اب یادوں کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔

ڈاکٹر آیا اور گاشکا دوڑتی ہوئی اس کو پادری کے یہاں مدعو کرنے آئی:

"پھر بھینگی آنکھوں والا مہمان، کلوٹا" اس نے کہا۔

گاشکا ہنسی کے سارے پھوٹی پڑتی تھی لیکن پھر اچانک سنجیدہ ہو گئی ۔ اس کی جانوروں کی ایسی ٹھڈی اور آنکھیں حیرت سے پھٹی پھٹی نظر آنے لگیں ۔

''سیرا ایک جوان ہے ۔ ''

''تو تم اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟''

''وہ مجھ سے جہیز مانگتا ہے : بھیڑ کی کھال کا کوٹ، دو کمبل اور دو تکئے ۔ اماں ابا یہ چیزیں مجھ کو دیتے نہیں ۔ ''

''کیوں نہیں؟''

''یہ خرچ نہیں برداشت کر سکتے ۔ ''

''جہیز کے لئے اپنی تنخواہ بچاؤ ۔ ''

''ماں باپ تنخواہ لے لیتے ہیں'' ۔

''تم کیوں دے دیتی ہو؟''

''مجھے دینا پڑتا ہے ۔ وہ آراضی کا لگان ادا کرنے کے لئے سب کچھ نیکیفور لوکیچ کو دے دیتے ہیں ۔ ''

وہ پہلے ایک پیر پر زور دئے کھڑی تھی، پھر پیر بدل کر کھڑی ہو گئی اور کچھ یاد کرنے لگی ۔

''پادری اور اس کی بیوی ہمیشہ اس کو بھگا دیتے ہیں ۔ ''

''کس کو بھگا دیتے ہیں؟''

''میرے جوان کو ۔ ''

''کیسے؟''

''ڈنڈے سے ۔ جب کبھی وہ آتا ہے مالکہ ایسے چیختی ہیں جیسے کسی نے خون کر دیا ہو اور پادری دمیتری ڈنڈا لیکر اس کے پیچھے دوڑتے ہیں ۔ وہ باڑ پھاند کر بھاگ جاتا ہے اور میں گائے کے باڑے میں چھپ جاتی ہوں ۔ ''

اس نے گالینا کی طرف دیدے نکال کر گھورا اور پھر اچانک ٹھٹھا لگا دیا، اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا ۔

''ہمیں جلدی کرنی چاہئے ۔ ہے نا؟ وہ لوگ انتظار کر رہے ہیں...''

گالینا نہیں گئی ''وہ ڈاکٹر اپنے کو بڑا لاٹ صاحب خیال کرتا ہے...''

پوری شام وہ پڑھ نہ سکی، وہ جھنجھلا گئی تھی اور کچھ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنا آئینہ اٹھایا اور دیکھا۔ ایک غصے سے بھرا چہرہ اس کو تک رہا تھا۔

بہت دیر تک وہ نہ سو سکی۔ سنسان کھڑکی تاریک تھی اور اس کا سناٹا تنہائی، تیاگ اور مستقبل کے دھندلکے میں کھوئے ہوئے اداس دنوں کی نشاندھی کر رہا تھا۔

اس نے لیمپ بجھا دیا، کپڑے اتارے بغیر بستر پر لیٹ گئی اور آنکھوں کو زور سے بھینچ لیا جو اس سے بغاوت کر رہی تھیں۔ اس نے جب پھر آنکھیں کھولیں تو تاریک کھڑکی جس پر پالا پگھل رہا تھا پہلے کی طرح اداس تھی۔

آئندہ اسے کیا پیش آنے والا تھا؟

زیادہ سے زیادہ وہ کسی اسکول ٹیچر سے شادی کر لیگی، مان لو کہ اس لمبے والے سے... جس کے سیاہ بال تھے... وہ بھی دوسروں کے ساتھ اس کو رخصت کرنے آیا تھا... کرسمس پارٹی میں ... اور پھر پانچ بچے... چیختے ہوئے... پانچوں چیختے ہوئے... ان کے منہ میں تکئے ... چھوٹا تکیہ...

اس کی ھچکی بندھ گئی اور اس نے اپنا چہرہ تکئے میں چھپا لیا جس نے اس کے نمکین آنسو جذب کر لئے۔

ان کے منہ تکئے سے بند کر دئے جائیں گے... اور... پھر... کیا؟ بیوہ، سات بچے اور وہ خود بدصورت، بس ھڈی چمڑا ...

”میرے خدا، میرے خدا!،، اس نے بڑی یاس آمیز حالت میں اپنے آنسو روکتے ہوئے کہا۔

یہ حالت بڑی دیر تک رہی۔ پھر دیوار کے دوسری طرف سے چوبی پہیوں کی کھڑکھڑاھٹ اور چکی کے پتھروں کی بھنبھناھٹ معلوم ہوئی۔ واسیلی کہہ رہا تھا: ”آٹا چکی چلنے لگی ھے... وہ ھر چیز پیسیگی... ھر چیز ...،، پھر اس نے اپنی آنکھیں نچاتے ہوئے بڑی خوفناک آواز میں چیخ کر کہا: ”چھت اوپر اٹھاؤ، لڑکو!،،

گالینا اچھل کر بستر سے اٹھی، کھڑکی سے چمکدار روشنی آرھی تھی۔ گرجا کے پیچھے سورج بہت صاف چمک رہا تھا۔

”میرے خدا، صبح ھو گئی!..،،

دیوار کے دوسری طرف سے بچوں کے شوروغل کی آواز آ رھی تھی۔

واسیلی نے دروازہ کھٹ کھٹایا : ''اٹھنے کا وقت ہو گیا، بچے آ گئے ہیں ...''

اس نے اپنے چہرے پر برف جیسے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دئیے، اپنے بال برابر کئے اور درجے میں پہنچی۔ پورا درجہ سورج کی روشنی سے بھرا ہوا تھا۔ حتی کہ آخری کونے بھی پگھلتے ہوئے برف کی ناقابل برداشت چمک کھڑکیوں سے آ رہی تھی۔

بچوں نے اپنے اپنے ڈھنگ سے اس کو سلام کیا اور بڑی خوشی سے اپنے ھاتھ ہلائے۔

''بچو! اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جاؤ۔''

انھوں نے دعا پڑھی۔ ان کی کتابیں اور کاپیاں سرسرانے لگیں۔

پھر وھی پرانی باتیں شروع ھوگئیں۔ سات اور تین کو جوڑو۔ نو میں سے دو گھٹاؤ۔ تین سے تین کو ضرب دو، جوڑ کیا ہوا، گھٹاؤ — غرض ھر چیز ٹیچر کے لئے اتنی پرانی، جانی پہچانی اور بچوں کے لئے غیرمتوقع اور مشکل تھی کہ وہ پریشان آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔

ایک آواز نے پوچھا :

''کیا تمھارے لئے یہاں بڑا سناٹا ھے؟''

''مجھے پتہ نہیں... میرے پاس وقت نہیں ھے...''

''تمھیں یاد ھے کہ تم اسکول چھوڑنے کا انتظار کس اشتیاق سے کر رہی تھیں — پانچواں، چھٹا، ساتواں اور آٹھواں فارم اور پھر ھر چیز مختلف، پرمسرت، پرلطف اور آزاد ھوگی جیسے تم نئی زندگی میں داخل ھو رہی ھو... اسکول چھوڑ کر یہاں آ گئیں — یہ گندے، ناک سڑکتے بچے، بھیڑ کی کھال کے کوٹوں کی کھٹی کھٹی سی بو، بھیگے جوتے، ٹھنڈک، کوئلہ کی گیس، بھیڑبھکڑ، درد شکم میں مبتلا عورتیں، جاڑے کے اداس دن، لمبی، بہت لمبی راتیں اور سنسان گاؤں... ایسا سنسان کہ کتے بھی نہیں بھونکتے... تمھیں یاد ھے؟..''

''مجھے یاد ھے۔''

سبق چلتا رہا، پھر انٹرول ھوا اور پھر دوسرا سبق۔ ھوا کافی بھاری ھو چکی تھی، تھکن کی وجہ سے چہرے بےجان ھو گئے تھے اور آنکھوں میں بے کیفی آ گئی تھی۔ بچے پھر بالکل ان احمقوں کی طرح معلوم ھونے لگے تھے جنھوں نے اس کو پہلے دن بدحواس کر دیا تھا۔

کھڑکی سے ایک بڈھی بطخ کی آواز آرہی ہے جس کی چونچ گومڑدار تھی۔ وہ اپنی گردن پھیلا کر سورج، دھوپ، نیلے آسمان اور روشن فضا کو دیکھ رہی تھی اور چیخ رہی تھی۔ اس وقت ایک لڑکا سوال کا جواب دے رہا تھا لیکن بیچ میں ایک باریک آواز نے کہا:

''یہ تو درسیدونتوف کا بطخا ہے''۔

درجے میں فوراً ایک ھلچل مچ گئی۔

''یہ درسیدونتوف کا نہیں ہے یہ تو دادی کوزلیخا کا ہے۔''

''کوزلیخا کا بھی نہیں۔ یہ تو بوڑھے ایریک کا ہے۔''

''پتہ نہیں کہ تم کیا بک رہے ہو...''

''تمھارا دماغ چل گیا ہے...''

''ایریک کی بطخ ایسی ہے...''

لڑکے نے اپنا پیٹ اور اس کے ساتھ سوتی قمیص اس طرح اندر کی طرف بھینچی کہ اس کی پسلیاں باھر نکل آئیں اور اس نے بطخ کی طرح چہرہ بنایا اور اسی کی طرح بولنے لگا۔ باھر کی بطخوں نے اس کی بولی کا جواب دیا۔

درجے میں ناقابل بیان ھنگامہ تھا: بچے چاروں ھاتھوں پیروں سے ڈسکوں پر چل رہے تھے اور تمام قلم، پنسلیں اور کتابیں پھینکتے جا رہے تھے، دوسرے بچے ان کے پیر پکڑ کر پیچھے کھینچ رہے تھے، کچھ کھڑکی کے تختے پر چڑھ کر چڑیوں کی طرح بولیاں بول رہے تھے۔ وہ مختلف قسم کے کپڑے پہنے تھے۔ کچھ سوتی پتلونوں میں تھے، کچھ اپنے باپ کے لمبے جیک‌بوٹ پہن کر آئے تھے، کچھ گھاس کے تلے کے جوتے پہنے تھے۔ لڑکیاں چھوٹے، بےتکے، شہر کے بنے ھوئے بلاؤز پہنے تھیں اور رنگین چتھڑے ان کی چوٹیوں میں گندھے تھے۔

سب چہروں پر یکساں تاثر تھا اور ساتھ ھی یہ چہرے جن پر زیادہ تر چپٹی ناکیں تھیں مختلف تھے۔ ان کے بےدھلے گھنے بال گول کٹے ھوئے تھے۔ ان میں سے بہتوں کی آنکھیں نیلی تھیں۔

کچھ اس ھنگامے میں خاموش بیٹھے تھے، ان کے منہ کھلے تھے اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بیوقوفوں کی طرح کسی طرف گھور رہے تھے۔

گالینا کھڑی مسکرا رہی تھی۔ وہ یہ سوچ‌سوچ کر ھنس رہی تھی کہ کس طرح کل وہ بیوہ ھوگئی تھی اور وہ بھی سات بچوں سمیت۔

مسکراتے ہوتے اس نے ہنگامے کی طرف توجہ کی جو کافی دیر سے جاری تھا۔

''بس کافی ہو چکا، بچو۔''

اگر آپ کے قابو سے آگ باہر ہو جائے تو اس کا بجھانا دشوار ہوتا ہے اور ایک مرتبہ لڑکے قابو سے باہر ہو جائیں تو پھر ان کو بھی کنٹرول کرنا مشکل ہوتا ہے۔ جب شرارت کا بھوت کسی مجمع میں اس طرح پہنچ جائے تو اسکول سے بھاگ ہی جانا بہتر ہے۔

''بس کافی ہو چکا۔''

اس کی آواز غل غپاڑے میں ڈوب گئی۔ گالینا کی تیوریاں چڑھ گئیں اور ان کے درمیان ایک شکن پڑ گئی۔ اس نے قریب کے لڑکے سے پیمانہ لیا اور اس کو ڈسک پر زور سے پٹکا۔

''خاموش!''

یہ بھی بیکار گیا۔ صرف ان بچوں نے جو اس کے قریب تھے ایک دوسرے کے بال نوچنا اور پیٹھ پر سوار ہونا بند کر دیا۔

آخرکار ہنگامے پر قابو پا کر گالینا نے زور سے پوچھا:

''تم بچوں میں سے کسی نے کبھی جنگلی بطخیں دیکھی ہیں؟''

مدھم پڑتا ہوا شور کمرے سے غائب ہو گیا، کھڑکی کے تختوں سے اور ڈسکوں کے نیچے سے چھوٹے، پسینے میں شرابور، پریشان بال شیطان نکلے۔ ان کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ ایک دوسرے کو ڈھکیلتے اور دھکے دیتے ہوئے وہ اپنی اپنی جگہوں پر پہنچے، ایک دوسرے سے سرگوشی کرنے لگے، پھر خاموشی ہوئی اور سب اس گلابی رخساروں والے گورے چہرے کی طرف متوجہ ہو گئے جسکی باریک ابروؤں کے درمیان ایک شکن پڑی ہوئی تھی۔

''کس نے جنگلی بطخیں دیکھی ہیں؟''

ایک لڑکی نے جس کا چہرہ اترا ہوا تھا — اس کے خاندان میں آتشک کا مرض تھا — اپنا زرد، گندہ ہاتھ اٹھایا اور اوپر نیچے اچکنے لگی۔ وہ اپنا ہاتھ جھٹک کر گالینا کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتی تھی۔

''فینیا، بتاؤ۔''

لڑکی نے ہکلاتے ہوئے، اپنی سفید ادھ جھڑی پلکیں جھپکا کر بولنے کی کوشش کی اور کہا:

''چچا ف... ف... فید... و... ل کی ب... ب... ط... خ پ... پا... کل ہو... ہوکر ج... جنگ... جنگلی...''

''اور لوگوں نے اس کو مار ڈالا!..'' دوسرے بچوں نے کورس میں ایک ساتھ کہا۔

''لیکن یہ اور بات ہوئی۔''

اس نے ان پر کنٹرول رکھا حالانکہ ان کی آنکھیں پھر چمکنے لگی تھیں اور ان کے چہروں پر رنگ دوڑ گیا تھا۔ پھر وہی پرانا قصہ شروع ہو گیا: پندرہ میں سات جوڑو۔ اٹھائیس میں سے نو گھٹاؤ، جوڑ کیا ہوا، گھٹاؤ کیا ہوا — یہاں تک کہ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے درجے کی دیواریں بھی ہمہ‌تن گوش ہیں۔

یہ بہار کا پہلا دن تھا۔ برف کی چھوٹی چھوٹی قلمیں ہر جگہ چھتوں سے لٹکی ہوئی دھوپ میں چمک رہی تھیں اور ان سے بلور کی طرح شفاف، رنگارنگ پانی کے قطرے آنسوؤں کی طرح ٹپک رہے تھے۔ سڑک کے بیچ کی لیک کالی پڑ گئی تھی۔ چھتوں پر پگھلتی ہوئی برف کے تودے ایک طرف نیلے ہو گئے تھے اور آسمان کے پس منظر میں ابھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

ایک مرتبہ پھر گاشکا قہقہے لگاتی آپہنچی اور چلا کر کہنے لگی:

''مالکہ آپ کو بلا رہی ہیں، ترچھی آنکھوں‌والے مہمان آئے ہیں۔''

''اچھا، اچھا،'' گالینا نے جواب دیا۔ ''میں ابھی آتی ہوں۔''

اس کا خیال تھا کہ ڈاکٹر پھر کبھی نہ آئیگا۔

اس نے کپڑے بدلے، آئینہ اتار کر اپنا چہرہ دیکھا — اپنی کھڑی کھڑی ناک۔

''میں بالکل نئی ہو گئی... میں ہر دن نئی ہو جاتی ہوں... مختلف... ہر شخص کو مٹھی میں رکھنا اچھی بات ہے: انسپکٹر، بچے، کسان اور عورتیں... اور ڈاکٹر؟..''

اس نے آئینہ پھر جگہ پر رکھ دیا۔

جب وہ پادری کے گھر پہنچی تو اس گھر کی حالت پہلی جیسی تھی، وہی کناری، وہی ابلتا ہوا سماور، سرخ سرخ سموسوں کا ڈھیر اور وہی پادری دمیتری، جسیم، خوبصورت اور ان کی سیاہ داڑھی، اور عبا جو اس کے اوپر بڑا بےتکا اور بلا ضرورت معلوم ہوتا تھا۔

ڈاکٹر نے اس سے اس طرح سر سری صاحب سلامت کی جیسے وہ چند منٹ پہلے ھی ایک دوسرے سے مل چکے ھوں۔ وہ اب بھی اسی طرح نچا کھچا تھا اور کسی ایسی چیز پر غور کر رہا تھا جو اس کے موجودہ ماحول سے بہت دور تھی، اب اس کی بھوؤں تک بالوں کی ایک لٹ لٹک رہی تھی۔

سورج ابھی چمک رہا تھا اور اس کی کرنیں جھونپڑیوں سے گزر کر کھڑکیوں پر گر رہی تھیں جو پالے سے پاک صاف تھیں۔ دور کمرے میں بچے غل مچا رہے تھے اور کھیل رہے تھے۔ پادری کی بیوی پرانا رسالہ لائی۔

''گالینا، مجھے اسے پڑھنے کا وقت نہیں ملا۔ میں اسے پھر پڑھونگی،،۔ اور اس نے بڑے اشتیاق سے اس رسالے کے ورق الٹنا شروع کر دئے جو گالینا اپنے ساتھ لائی تھی۔

لیدوچکا نے اپنی بڑی بڑی گول آنکھوں سے، پر خیال اور دریافت طلب نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھا۔ ان نظروں میں ایک خاص کھوج تھی، کوئی ایسی کھوج جس کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔

ڈاکٹر ایسی باتیں کر رہا تھا جن کا تعلق کسی سے بھی نہیں تھا، پھر بھی یہ باتیں عجیب نہیں معلوم ھوتی تھیں اور سب کو یہی محسوس ھوتا تھا کہ وہ بھی اسی کی طرح سوچ رہے تھے۔

''ان لوگوں کے لئے جو آپس میں قریبی دوست ھوتے ھیں سب سے مشکل بات خیالات کی مطابقت ھوتی ھے۔،،

اس نے اپنی چمکتی اور ذرا ترچھی آنکھیں لاپروائی سے پادری، اس کی بیوی اور گالینا کی طرف پھیریں۔ گالینا نے اس جھرجھری کو روکنے کے لئے اپنے دانت بھینچ لئے جو ڈاکٹر کے گھورنے کی وجہ سے اس کے اندر پیدا ھوگئی تھی۔

''سب سے خراب چیز ... ھاں... دوسروں کے ساتھ آدمی کا رویہ ... اس شخص کے ساتھ بھی جو سب سے قریبی دوست ھو... اس میں ایک خاص بات ھوتی ھے... آدمی کے اندر جو کچھ ھے وہ اس کا جائزہ لے سکتا ھے یعنی اپنے رد عمل کا، لیکن دوسرے شخص میں آدمی اپنا تضاد ڈھونڈھتا ھے۔ سمجھے نا۔ کوئی نئی اور مختلف بات۔ کوئی ایسی بات جو آدمی کے خیالات کے سلسلے کو توڑکر اس میں کوئی نئی چیز پیدا کر دے، ھر چیز کو الٹ‌پلٹ دے...،،

پادری کی بیوی نے اس تقریر کو اپنے طریقے سے سمجھا۔
"اگر بچے نہ ہوں تو سب ٹھیک ہے۔"
"اگر آدمی یہ جانتا ہے کہ کیسے کوئی شخص جنبش کرتا ہے، سوچتا ہے، ہنستا ہے، کام کرتا ہے... تو بڑی مصیبت ہے۔ جیسے کوئی اپنے کو آئینے میں دیکھ رہا ہو۔"
گالینا نے اپنا سر جھکا لیا اور اس کے نتھنے پھول گئے۔ پہلے کی طرح اس کے الفاظ میں سچائی کے شائبے نے گالینا کے دماغ میں سخت مخالفت کی جھنجھلاہٹ پیدا کر دی:
"میں آپ کی بات نہیں سمجھی..."
لیکن پادری نے اس کو بات نہیں پوری کرنے دی۔
"نکانور سرگئی‌وچ ہمیشہ بات کو نئے ڈھنگ سے کہتے ہیں..."
اس کی بیوی نے بیچ میں لقمہ دیا:
"مردوں کے لئے باتیں بنانا آسان ہے۔ لیکن عورت کو بچوں، مکان اور نوکروں کی دیکھبھال کرنی ہوتی ہے... یہ سچ ہے کہ ذہنی ترقی ضروری ہے۔ مثال کے طور پر میں ہوں، مجھے رسالے تک پڑھنے کا وقت نہیں ملتا... لیکن یہ رسالہ میں ضرور پڑھونگی، گالینا... گاشکا نے ابھی دو گلاس اور تین طشتریاں توڑ دیں۔ میں اس کی تنخواہ میں سے کاٹ لونگی۔ لیکن پادری کہتے ہیں کہ مجھے ایسا نہ کرنا چاہئے۔"
"یہ تو ایک فقیر کے یہاں چوری کرنا ہے۔"
"کیا مطلب ہے، فقیر! پادری مجھے تمہارے اوپر حیرت ہوتی ہے، حیرت۔ آخر میں... یعنی... یہ بات عجیب ہے، ناقابل بیان... ایک عجیب قسم کی سفارش... وہ برابر توڑتی پھوڑتی رہیگی اور تم اس کا سر تھپتھپاؤگے اور شاید..."
پادری دمیتری نے عاجز ہوکر اپنے ہاتھ ہلائے۔
پادری کی بیوی جوش سے سرخ ہو رہی تھی اور اس نے بوکھلاہٹ میں گالینا کا پیالہ لے کر اس میں چائے انڈیلنا شروع کر دی۔
"ایک منٹ، ابھی میں یہی چائے نہیں ختم کر چکی ہوں، اس میں آدھا پیالہ چائے ہے۔"
"سب سے بری بات یہ ہے" ڈاکٹر نے کہا جیسے وہ اپنے آپ سے کہہ رہا ہو۔ وہ عجیب افسردہ انداز میں مسکرایا۔ "سب سے

بری بات خیالات کی مطابقت ہے۔ ہاں۔ جب آدمی ایک دوسرے کے اندر ایسٹر کے سخت انڈوں کی طرح فٹ ہو جائیں۔ تقریباً دس انڈے...،،

''میری سمجھ میں نہیں آتا،، گالینا نے اب بھی اپنی نگاہ اٹھائے بغیر کہا۔ ''میں نہیں سمجھتی... اگر دو دوستوں کی رائے میں اتفاق ہے تو اس کا یہی مطلب ہوا کہ دونوں میں کوئی چیز مشترک ہے۔ اگر یہ کسی عورت و مرد کا معاملہ ہے مان لو کسی شوہر اور بیوی کا تو یہ بڑی خوشی کی بات ہے اگر دوست ہیں تو بھی، کیونکہ ان میں تعلقات قائم رکھنے کا یہ ایک ذریعہ ہے۔،،

ڈاکٹر کی آنکھوں میں اب واقعی بھینگاپن آ گیا اور وہ حقارت سے چمکنے لگیں:

''یہی تو بات ہے! کوئی چیز مشترک... بس ان میں یہی مشترک ہوتا ہے... عورت ایک ماہر تعمیر سے شادی کرکے ماہر تعمیر بن جاتی ہے۔ اس کو صرف عمارتوں سے ہی دلچسپی ہوتی ہے۔ اگر وہ کسی موسیقار سے شادی کرتی ہے تو بس اس کو اوپیرا اور گیتوں سے دلچسپی ہوتی ہے۔ اگر اس کا شوہر پولیس افسر ہو تو اس کو جاسوسی کے معاملات سے دلچسپی ہو جاتی ہے۔ اگر وہ پادری ہو تو...،،

''اب آپ بہت بڑھ رہے ہیں، جناب،، پادری کی بیوی نے چلا کر کہا۔ اس کے کان سرخ انگارہ ہو رہے تھے۔ اس نے برتن دھونے کا تسلا پرے ڈھکیل دیا۔

''ہاں، یہ ذرا... ذرا زیادتی ہے،، پادری دمیتری کی آواز میں ہر ایک کی آواز ڈوب گئی۔

''تو پھر ہمارے پاس کیا رہ گیا؟ پھر شادی کا تقدس کہاں رہا؟،، پادری کی بیوی نے ایک بھیگا تولیہ ڈاکٹر کی طرف ہلاتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر کی آنکھیں اور بھینگی ہو گئیں اور ان میں ایسی چمک پیدا ہو گئی کہ پادری کی بیوی سوچنے لگی: ''کہیں یہ پاگل تو نہیں ہو گیا ہے؟،، — اور چپ ہو گئی۔

''اور اگر کسی ماہر تعمیر کی بیوہ کسی مصنف سے شادی کر لیتی ہے تو بس وہ ادب میں غرق ہو جاتی ہے اور کسی دوسری بات کے متعلق بات ہی کرنا نہیں پسند کرتی۔ انجام وہی ہوتا ہے — وہ ایک دوسرے کو اپنی روح، اپنی زندگی نذر کردیتے ہیں اور اپنے

بے حد خفیہ راز بتا دیتے ہیں۔ پھر پانچ چھ سال میں ہر چیز آخری قطرے تک ختم ہو جاتی ہے اور مصیبت کا دور شروع ہو جاتا ہے — یہ ہوتا ہے بوریت کا دور۔''

پادری کی بیوی زور زور سے برتنوں کو تولئے سے جھاڑتی ہوئی اچک کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے پھولے ہوئے سرخ چہرے پر سفید دھبے نظر آنے لگے۔

''ارے، بس حد ہو گئی۔ اب اور کیا ہوگا؟ خدا کا شکر ہے، میں پادری دمیتری کے ساتھ بارہ سال سے انتہائی ہنسی خوشی کے ساتھ گذربسر کر رہی ہوں۔ خدا ہر ایک کو ایسی خوشی نصیب کرے اب ہم ایک دوسرے سے اکتا جائیں؟ میں نے ان کے بچے پیدا کئے اور ہم نے ایک دوسرے کو اپنے تمام راز بتا دئے۔ اب میں چلی جاؤں اور پادری دمیتری سے تم کیا چاہتے ہو؟ کوئی زیادہ جوان، ہے نا؟.. دیکھو کیسے خوبصورت ہیں یہ! ان کے لئے تمہارے ذہن میں کون ہے۔ میں تم سے پوچھتی ہوں؟ یہاں بہت سی چھوکریاں ہیں۔ گاشکا سے شادی کر سکتے ہیں۔ وہ تندرست لڑکی ہے... اور اس کے علاوہ...''

''بس۔ بس کافی ہے۔ کافی۔ میں تم سے کہتا ہوں۔ بیوی۔ کیا تم پاگل ہو گئی ہو؟'' اور پادری دمیتری ناراضگی کے ساتھ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''واقعی کافی ہے... میں یہ نظریات جانتی ہوں۔ یہ تمہارے مذاق کے مطابق ہیں۔ تم نے میری جوانی، تندرستی اور طاقت سب چھین لی اور اب مجھے طاق پر رکھے دے رہے ہو...''

''واقعی تم اکتا گئی ہو۔ تم نے ایسا ڈرامہ بہت دن سے نہیں کیا تھا۔ ایسا ڈرامہ تو تمہارے لئے دال بھات ہے۔ تمہارے یہ سب ڈرامے یہاں جمع ہو گئے ہیں'' پادری دمیتری نے اپنے گلے پر ہاتھ مار کر کہا۔ ''تم تو میری جان کو آگئی ہو...''

اس کی بیوی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ سسکیاں لے کر کہنے لگی:

''واقعی، یہ میرا قصور ہے... میں نے تمہاری زندگی تباہ کر دی... جب تم مجھ سے معاشقہ کر رہے تھے اس وقت تم خود کشی کی دھمکی دیتے تھے... ب — بچے صرف میری تسلی کا باعث ہیں...''

لیدوچکا نے، جو اپنی ماں کو بڑی بڑی دریافت‌طلب نگاہوں سے دیکھ رہی تھی اپنے دبلے پتلے بازو اٹھائے اور اپنی ماں کے گلے میں ڈال کر پیاری، لیکن دریافت کرنے والی آواز میں جس میں بچپن کا شائبہ تک نہ تھا کہا :

''اماں؟''

جب اس کے بڑوں جیسے پراسید لہجے کا جواب نہیں ملا تو اس کی بڑی اور پھٹی پھٹی آنکھوں میں پریشانی اور اداسی پھیل گئی ۔

اس کی ماں نے اس کو محبت سے لپٹا لیا اور اپنے آنسو پونچھ ڈالے ۔

''اونہہ، میں کیسی بیوقوف ہوں!.. لیدوچکا جاکر کہو کہ ہم لوگوں کے لئے کچھ کھانے کو لائیں ۔ ''

کھڑکی سے رات معلوم ہو رہی تھی، سماور ٹھنڈا ہو چکا تھا ۔

ڈاکٹر اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا ہر شخص سے پرے گھور رہا تھا ۔

''اگر میری ملاقات ہو جائے ... ہاں...'' ایک لمحے کے لئے اس نے اپنا چہرہ ہاتھ سے ڈھک لیا ۔ ''محبت آدمی کا حق ہے ۔ تیز، ہمہ گیر جذبات سے متاثر ہونا، اسی کا نام خوشی ہے ۔ کیسے ممکن ہے کہ اس خوشی کا اثر زائل ہو جائے ۔ پوری زندگی آدمی کو یاد نہ رہے ۔ یہ تو زبردست فریب ہوگا، کوئی بہت ہی زبردست اور ذلیل دھوکا ۔ ''

اس نے اپنا چہرہ ڈھک لیا، ذرا دیر ساکت بیٹھا رہا، پھر چہرہ کھولا اور اسکی آنکھیں سیدھی گالینا کو گھور رہی تھیں، سیاہ آنکھیں جن میں چمک نہ تھی لیکن گہرا غم جھلک رہا تھا :

''عورت کی اپنی کوئی زندگی نہیں ہوتی ۔ سمجھ میں آیا؟ کوئی تخلیقی زندگی نہیں ہوتی ۔ میں اس معنی میں نہیں کہہ رہا ہوں کہ وہ میز کے پاس بیٹھ کر انگریزی کاغذ اور سیپ کا قلم لے کر، اپنی نیلگوں آنکھیں نیلے آسمان کی طرف اٹھا کر...''

''لیکن میری آنکھیں تو بھوری ہیں'' گالینا نے سوچا ۔

''... شعر لکھے ۔ میرا مطلب اس قسم کی تخلیقی کوشش سے نہیں ہے بلکہ زیادہ سادہ، روزمرہ اور معمولی باتوں سے ہے ۔ مثلاً جب وہ اپنے بچے کو جھولا جھلاتی ہے تو وہ کوئی اپنا گیت گائے، وہ اپنی بنائی ہوئی کہانیاں کہے جو شاید بھدی ہوں اور لکھی نہ جا سکیں

لیکن اس کی اپنی هوں - اس کی آنکھیں کبھی دیکھنے میں عجیب معلوم هوں جیسے وہ اپنے خیالات میں محو هو اور کسی کے خیالات کی مداخلت نہ چاهتی هو - اس طرح سے یہ عورت بالکل انوکھی، بالکل نئی اور پہلے سے مختلف هو جاتی هے - آدمی کے اندر ایک سنسنی پیدا هو جاتی هے اور یہ جاننے کی خواهش کرتا هے کہ ان آنکھوں کے پیچھے کیا هے...''

''اپنے شوهر کے لئے سینگیں'' پادری دمیتری نے دانت نکال کر کہا -

ڈاکٹر نے اس کی بات سنی هی نہیں - وہ ادھر ادھر ٹہل رها تھا - اس کے هاتھ پیچھے بندھے تھے اور اس کا سر جھکا تھا -

''هر مرد کا کوئی نہ کوئی اپنا کام هوتا هے، اس کی سرگرمی کا ایک حلقہ هوتا هے جہاں وہ جا سکتا هے، جہاں وہ هر چیز سے پیچھا چھڑا کر جا سکتا هے- اپنے خاندان سے بھی - عورت کے پاس اس طرح کی کوئی چیز نہیں هوتی، هر چیز نگاہ کے سامنے هوتی هے، هر چیز ایک مرتبہ میں ختم هو جاتی هے اور بس پھر خاتمہ هوتا هے اور یہ دونوں کے لئے المیہ هے — بدقسمتی...''

گالینا هزاروں زهریلے اعتراضات کرنے کے لئے بےتاب هو رهی تھی لیکن وہ اس ڈر سے چپ رهی کہ بیکار تلخ بات کہنے سے بحث پر کوئی اثر نہ پڑیگا -

پادری کی بیوی جس نے اب اپنے هیجان پر قابو پالیا تھا سکون کے ساتھ بولی :

''تمہارے ایسے آدمیوں کو کبھی شادی نہ کرنی چاهئے - ''

گاشکا سنہری پالش کی بڑی کشتی میں پلیٹیں لے کر آئی جس پر پھولدار ڈیزائن بنے هوئے تھے - اس کے گالوں پر سرخی تھی اور وہ پھولے هوئے تھے اور اس کی خوف‌زدہ گھورتی آنکھوں سے هنسی ٹپک رهی تھی - پادری کی بیوی نے بڑے سلیقے سے پلیٹیں سب کو دیں -

''مہربانی کرکے خود نکالئے... یہ سانپ چھتریوں کا اچار هے... مختلف قسم کا... نکانور سرگئی‌وچ، گالینا...''

ڈاکٹر نے خود لے لیا اور اپنے خیالات میں ڈوبا رها، وہ پھر بھینگا هو گیا تھا -

''نکانور سرگئی‌وچ، تم کیا کر رهے هو - گوشت اور مچھلی ایک هی پلیٹ میں، یہ رهی - '' یہ کہہ کر پادری کی بیوی نے ایک اور پلیٹ اس کی طرف کھسکا دی -

''آپ کہہ رہی تھیں،، ڈاکٹر نے گالینا کی طرف دیکھے بغیر اس کو مخاطب کیا۔

گالینا ڈاکٹر پر جھنجھلا رہی تھی۔ آخر سب اسی کے گن کیوں گاتے ھیں اور اسی کو خوش کرنےوالی باتیں کیوں کرتے ھیں؟

''انسپکٹر مجھ سے دو مرتبہ ملنے آچکا ھے،، اس نے ڈاکٹر کی طرف دیکھے بغیر بے دلی سے کہا۔ ''بہت دلچسپ آدمی ھے۔ اس نے بچوں کو بلوایا اور...،،

''آپ نے کیا کہا تھا کہ سب کسان...،، ڈاکٹر نے بھینگی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ھوئے کہا۔

''یہ تو تمیز سے گذرتا جا رھا ھے،، گالینا نے سوچا۔

اس نے اپنی پلیٹ میں لال بیریاں اس انداز میں نکالنا شروع کیں جیسے وہ ڈاکٹر کو نظر انداز کرنا چاھتی ھو۔

''ہاں۔ مجھے چمچہ دیجئےگا۔ ،،

''آپ کہتی ھیں کہ تمام کسان بڑھ کر نیکیفور لوکیچ ھو سکتے ھیں...،،

''ارے، یہ تو خود آپ نے کہا تھا!،، گالینا نے اپنی نگاھیں حیرت سے اٹھائیں اور غصہ سے سرخ ھو گئی۔

''ھاں میں نے کہا تھا... فرق کیا پڑا... اور آپ نے بھی۔ آپ صریحی بات کی مخالفت نہیں کر سکتیں...،،

وہ پھر اداس و پریشان سا رک گیا۔

گاشکا کا چوڑا، سرخ چہرہ دروازے سے جھانکتا نظر آیا:

''گھوڑے کھڑے انتظار کر رھے ھیں۔ برف کے نیچے پانی ھے اور کوچوان بک جھک رھا ھے...،،

پادری کی بیوی نے زور سے اپنا ھاتھ ھلایا اور گاشکا غائب ھوگئی۔

''عورت رات کی طرح ھوتی ھے... خوابیدہ تاریکی۔ اور کسان... کسان جنگل کی طرح ھوتا ھے، گھنا، تاریک، سویا سویا۔ ایسے جنگل کے اندر جا کر آدمی دلدل میں پھنس جاتا ھے یا اپنا پیر کسی ٹھنٹھ سے ٹھکرا کر توڑ لیتا ھے، اس کو خیال ھوتا ھے کہ دور کہیں کھلی جگہ ھے لیکن جنگل ختم ھی نہیں ھوتا۔ اچھا۔ اب میرے جانے کا وقت آ گیا۔ کیا آپ بھی جا رھی ھیں؟،،

''ھاں۔ میں بھی جاؤنگی۔ ،،

''تو ساتھ چلیں، میں پہنچادوں۔ ''
''نہیں۔ میں ذرا دیر اور ٹھہرونگی۔''
وہ اداسی کے عالم میں کھڑا ہو گیا اور خدا حافظ کہا۔ ایک منٹ بعد ساز کی گھنٹیوں کی ہلکی جھنکار ختم ہو گئی اور ایک عجیب تاثر چھوڑ گئی جو انتظار کا تاثر ہو سکتا تھا یا رنج کا۔

پادری دمیتری ادھر ادھر ٹہل رہا تھا اور اس کے ساتھ اس کا سایہ پیروں پر لوٹتا جا رہا تھا۔ اس کی بیوی چائے کے برتن خوب کھڑ بڑا کر دھو رہی تھی۔

''غیرمعمولی آدمی، عجیب انسان...''

''پاگل'' اس کی بیوی نے اطمینان سے کہا۔

''ایسے لوگ روز نہیں ملتے۔ یہ آدمی پاگلوں کی طرح کام کرتا ہے۔ اس کو دو مرتبہ میعادی بخار آچکا ہے۔ کسان اس سے ڈرتے ہیں۔ میری پہلی ملاقات اس سے عجیب طرح ہوئی۔ میں یہاں سے چالیس ورسٹ کے فاصلے پر پدگورنئے گیا جہاں اسپتال ہے۔ اس زمانے میں وہاں ایک میلا تھا۔ میں گرجا کے مکھیا کے ساتھ تھا۔ وہ ایک بیل خریدنا چاہتا تھا۔ میں نے مکھیا کو اسپتال منجن لانے کے لئے بھیجا۔ بہت سستی سی چیز تھی۔ مکھیا نے جاکر ڈاکٹر کے اسسٹنٹ سے کہا کہ پادری کے لئے تھوڑا سا منجن چاہئے۔ اسسٹنٹ نے کچھ منجن انڈیلنا شروع کیا تھا کہ ڈاکٹر آ گیا۔ 'یہ کیا ہے؟' پھر اس نے مکھیا کی طرف مخاطب ہوکر پوچھا: 'یہ کس کے لئے؟' مکھیا ڈر گیا اور اس نے کہا: 'پادری نے مانگا ہے۔ عوددان صاف کرنے کے لئے'۔ 'پادری سے کہہ دینا کہ جب عوددان میں گوشت پیدا ہو جائیگا اور اس میں دانت نکل آئیں گے تب میں ان کو منجن دونگا۔ اور اس وقت تک تم یہاں پھر اپنی صورت نہ دکھانا'۔''

''جاہل'' اس کی بیوی نے بیچ میں لقمہ دیا۔

''اس کے بعد ہم لوگوں میں صلح ہو گئی اور ہم دوست بن گئے۔''

گالینا اندھیرے میں گھر واپس ہوئی۔ وہ باڑوں کے قریب چل رہی تھی اور برف کے سخت ٹکڑے اس کے پیروں کے نیچے پڑ کر چرمرا رہے تھے۔ دن میں پگھلی ہوئی برف، ہلکی برف سے ڈھکے ہوئے پانی

کے گڈھوں اور شام کے پالے کی سخت کی ہوئی کھاد کی بو اٹھ رہی تھی — ان سب سے بہار کی سہک آرہی تھی۔

دن بڑے ہونے لگے، آسمان زیادہ نیلا ہوگیا اور سورج میں بھی گرمی پیدا ہوگئی۔ آنکھ کھولنے کے بعد پھر سورج سے بچنا ممکن نہ تھا اور خدا جانے سڑک پر کیا ہو رہا تھا۔ بڑی چمک تھی اور تیزی سے پانی بہنے کی آواز آ رہی تھی۔ بچوں کو اسکول لانا مشکل ہو گیا۔ وہ چشموں کے اوپر کود رہے تھے، لکڑی کے ٹکڑوں کے بنے ہوئے جہاز چلا رہے تھے اور جب وہ اسکول پہنچتے تو خوشی سے پاگل اور سر سے پیر تک شرابور ہوتے۔

حالانکہ سڑکیں چلنے یا سواری پر جانے کے لئے موزوں نہ تھیں لیکن گالینا سے صبر نہ ہو سکا۔ اتوار کو گرجا جانے کے بجائے جہاں سے بےسرے گیتوں کی آواز آ رہی تھی، وہ ادھر سے گزر کر بلندی پر پہنچ گئی حالانکہ اس کو ہر اتوار اور مقدس دن کو گرجا جانا چاہئے اور ایسا نہ کرنے پر اس کی رپورٹ ہو سکتی تھی۔

حد نگاہ تک پگھلتی ہوئی برف پھیلی تھی۔ اس کو دیکھنے سے آنکھوں میں چکاچوند پیدا ہوتی تھی، پگھلتی ہوئی برف کے اوپر ساری کھلی فضا چنگاریوں سے بھری تھی اور دھوپ میں اونچی جگہوں پر سیاہ زمین کے ٹکڑوں سے بھاپ نکل رہی تھی، دور اور قریب کے گاؤں سیاہ جزیروں کی طرح معلوم ہوتے تھے، چھتوں سے برف گر گئی تھی، گھوڑوں کی پھیلی ہوئی لید کے رنگ سے سڑک باداسی سی ہو گئی تھی اور ان جزیروں کے درمیان دور تک پھیلتی چلی گئی تھی۔

''نہیں، نہیں۔ وہاں مت جاؤ،، اس نے اپنے آپ کو تنبیہہ کی۔

لیکن وہ نیچے کی طرف چل پڑی تھی، وہ باربار پگھلتی ہوئی برف پر پھسل کر گرتی ہوئی نیچے تک پہنچ گئی۔ اس کے ربڑ کے جوتوں میں پانی بھر گیا تھا اور اس کے پیر بھیگ گئے تھے لیکن وہ بےانتہا خوش تھی۔

اس نے مڑکر دیکھا — گاؤں دور ایک ٹیلہ پر تھا۔ گرجا کے ہرے گنبد اور جھونپڑیوں کے چھپر جو جاڑے کے دوران سڑ گئے تھے زیادہ سیاہ نظر آرہے تھے۔ گاؤں سے کڑکڑاتی مرغیوں، بانگ دیتے مرغوں، بھونکتے کتوں اور ان بچوں کی آوازیں آرہی تھیں جو ایک دوسرے کو پکار رہے تھے۔ ان سب میں ایک نیا گیت تھا، بہار کا گیت جس میں

بہار کے سورج کی گرمی اور پگھلتی ہوئی برف کی سردی بیک وقت مدغم ہو گئی تھی۔ اس کا دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنے خالی اور سنسان کمرے میں واپس جائے۔ اس تھرکتی ہوئی چمک میں، بہار کی ان‌میل آوازوں میں کتنی بےترتیب حرکت تھی۔ ایک آواز نے اس سے پوچھا:

''کیا تم زندہ رہنا اور محبت کرنا نہیں چاہتیں؟..''

آخرکار جب وہ واپس ہوئی تو وہ تھکی لیکن خوش تھی، اس کے ہاتھوں اور پیروں میں ایک خوشگوار درد تھا اور اس کا سر ہلکا چکرا رہا تھا۔ وہ پادری کی بیوی سے ملنے جانا چاہتی تھی لیکن نہیں گئی، اس کا تھکا ھارا سر تکیہ کا متلاشی تھا۔ وہ بستر میں گھس گئی اور اپنے کو تیزی سے آنے والی نیند کے سپرد کر دیا کہ اچانک گرجا کی گھنٹیوں نے الارم بجانا شروع کر دیا۔

اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں — سناٹا اور اندھیرا تھا۔ لیکن آنکھیں بند کرتے ھی پھر اس کو مہیب ھنگامہ گھیر لیتا جس سے اس کے سر میں انتہائی سخت درد ہونے لگا۔

''رکو ... میں نہیں چاھتی...'' اس نے شکایت‌آمیز لہجے میں کہا اور اپنے بھاری پپوٹے اٹھانے کی کوشش کی۔ ھنگامہ اور تیز ھوگیا جس سے پورا گھر، پورا گاؤں اور پگھلتی ہوئی برف کے میدان بھر گئے۔

''ارے۔ مجھے آرام کرنے دو ...''

''یہ کچھ بھی نہیں...'' پھر آواز آئی۔ ''کسانوں کو اپنا کام کرنے دو اور تم اپنا کام کرو۔ عورتیں اور کسان سب ایک ھیں — اندھیرا...''

اس نے بہت کوشش کرکے بڑی مشکل سے اپنی بھاری پلکیں اٹھائیں اور اچانک تاریکی اور سناٹا چھا گیا۔ صرف کھڑکی کا چوکھٹا اپنی مدھم اور سیاھی مائل روشنی کی وجہ سے ذرا ذرا دکھائی دے رہا تھا۔

اس سے اسے تکلیف ہوئی اور سیسے کی ایسی بھاری پلکیں آھستہ آھستہ جلتی دکھتی آنکھوں پر ڈھک گئیں اور پھر وہ غیریقینی سرخ خونیں ھنگامہ ناقابل‌برداشت حد تک بڑھ گیا۔

''ارے، اچھا، کوئی پرواہ نہیں۔ ''

اس نے اب جدوجہد ختم کر دی اور اپنے کو لابدی حالات کے سپرد کر دیا۔

کمرہ لوگوں سے بھر گیا ۔ ان میں فیدوسیوشکا بھی تھی ۔ وہ گالینا کے اوپر جھک کر اس کی کھال کی چٹکی لیکر کھینچنے لگی ۔

''فیدوسیوشکا... تمھیں یاد ہے... ہم سمندر کی تہہ کیسے گئے تھے؟ اور وہ باڑہ، وہ جھونپڑی، تم اور میں اور ہمارے اوپر ہر چیز نیلی اور ٹھنڈی تھی...،،

''پریشان مت کرو !،، ...،،

اور نیکیفور لوکیچ کی گردن پر چربی کی تہیں لٹک آئیں ۔

ایک دبلی پتلی، زرد لڑکی نے اپنا سر بستر پر ڈال دیا اور اپنے ہونٹ چلائے بغیر پوچھا :

''کیا تمھیں اس سے محبت ہے؟،،

گالینا نے جواب نہیں دیا ۔

''تم اس سے کیوں محبت کرتی ہو ؟،،

پھر جواب نہیں دیا ۔

''کیونکہ وہ مختلف قسم کا آدمی ہے؟،،

''نہیں ۔ ،،

''کیونکہ وہ دن میں اڑتالیس گھنٹے کام کرتا ہے؟،،

''نہیں ۔ ،،

''کیونکہ کسان اس سے ڈرتے ہیں؟،،

''نہیں ۔ ،،

''کیونکہ اس کے داڑھی مونچھ اور بھینگی، سیاہ آنکھیں ہیں؟،،

''نہیں ۔ ،،

خاموشی ۔

اس نے حیرت سے دیکھا ۔ نیکیفور لوکیچ اور چربی کی تہیں غائب ہوگئی تھیں، دبلی پتلی نازک لڑکی آنسوؤں میں گھل گئی تھی ۔ عورتیں رو رہی تھیں ۔ اس نے واسیلی کی آواز سنی ۔

''وہ لوگ آگئے ۔ ،،

''خدا اور مقدس کنواری کا لاکھ لاکھ شکر ،، فیدوسیوشکا نے کہا ۔

''میری بیچاری ...،،

فضا میں ایک بڈھی عورت کا اجنبی چہرہ نظر آیا، پہلے دھندلا اور نا صاف، پھر زیادہ صاف ۔ چہرہ جس پر جھریاں تھیں، منہ اندر دھنسا

ہوا تھا اور پپوٹے سرخ تھے۔ بڈھا چہرہ آگے جھک کر اپنی دودھیا آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔

گالینا بہت ڈر گئی، اس کا پورا جسم لرزے کے دورے سے کانپنے لگا اور پھر وھی کان پھوڑ دینےوالا ھنگامہ ہوا اور یہاں تک بڑھا کہ اس کے سر میں سخت درد ھونے لگا۔

بڈھی عورت نے اس کو اپنی دودھیا آنکھوں سے دیکھا اور اپنی انگلیوں سے کھیلتی رھی۔

کچھ لفظ بڑبڑائے جنھوں نے دوسری آوازوں کو ڈبو دیا۔ ان میں سے کچھ سمجھ میں آئے اور کچھ نہ آئے۔

"... سمندر میں، بحر ذخار میں، ایک پرانے بلوط کا ٹھنٹھ ھے..."

کانسی کی گھنٹیاں بجتی رھیں — ڈنگ، ڈنگ، ڈانگ...

بڈھی عورت کی متواتر بڑبڑاھٹ ٹھیک درد پر ضربیں لگا رھی تھی۔

"... اور ٹھنٹھ پر ایک گرجا ھے... اس گرجا کے پاس ایک پادری صلیب لئے کھڑا ھے۔ اور ایسا معلوم ھوتا ھے جیسے کہ سمندر میں، بحر ذخار میں بلوط کا ٹھنٹھ نہیں ھے۔ بلوط کے ٹھنٹھ پر گرجا نہیں ھے اور نہ تو پادری ھی صلیب لئے کھڑا ھے..."

یہ سرسراتی، بڑبڑاتی آواز بڑی دیر تک جاری رھی جس سے نیند آگئی اور وہ گرجدار ھنگامہ رفتہ رفتہ کم ھو گیا۔

"... تا کہ خدا کی خادمہ..."

اس نے ابھی یہ الفاظ ختم نہیں کئے تھے کہ عورتوں کے ھنگامہ پرور، بےتکے اور بھن بھناتے کورس نے اس کے دماغ کو نا قابل برداشت طور پر جھنجھنا دیا اور لڑکی کی نیند توڑ دی۔

"گالینا!"

پھر اس یکساں بڑبڑاھٹ نے بڑھتا ہوا ھنگامہ کم کر دیا۔

"... تا کہ خدا کی خادمہ، گالینا کو بیماری نہ ستا سکے، میں دھائی دیتی ھوں۔ میں جھاڑ پھونک سے اس کے انتہائی دکھتے ھوئے پیٹ، گورے اعضاء اور لال آنتوں سے درد کھینچے لیتی ھوں تا کہ خدا کی خادمہ..."

اور پھر عورتوں کی آواز کا کورس بیمار لڑکی کے سر میں جا کر جھنجھنایا جو یہ لفظ کہہ رھا تھا:

"گالینا!"

"... تاکہ خدا کی خادمہ گالینا، اپنی ہڈیاں نہ کھرچے، تاکہ اس کا جسم خشک ہوکر پھوٹ نہ جائے اور اس میں سے نہ نکلے ..."

پھر بےدم کر دینےوالی جھرجھری نہیں آئی، وہ کھوسٹ بڑھیا اور عورتیں بھی نہیں تھیں۔ پوسٹ‌کارڈ دھندلا سا دیوار پر دکھائی دے رہا تھا اور کہیں بہت دور بہت ہی مشکل سے محسوس ہونےوالا مدھم ہنگامہ سنائی دے رہا تھا۔

دن تھا یا رات؟

غالباً شام تھی اور اسی وجہ سے جانے پہچانے چہرے کھڑکی کے شیشے سے لگے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک جانی پہچانی بنی ہوئی شال اور شال میں ہلتا ہوا سر جو دوستانہ اور پراخلاق انداز میں ہل رہا تھا...

"نہیں، پہچاننے اور یاد کرنے سے تکلیف ہوتی ہے۔"

اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور دور کا ہنگامہ کبھی بڑھتا اور کبھی گھٹتا ہوا آخرکار بالکل ختم ہو گیا اور اس کی جگہ پر اس کے دماغ میں ایسی تکلیف دہ باتیں آنے لگیں جن سے اس کا سر پھٹنے لگا۔ شاید یہی باتیں اس کے چاروں طرف ہو رہی تھیں، یہی زندگی کا دوسرا پہلو تھا جو عام طور پر نظر آنےوالی روزمرہ کی زندگی کے پیچھے ہمہ وقت مکمل ہوتا جا رہا تھا، الفاظ واعمال کے پیچھے، کسانوں کے پیچھے، بچوں کے پیچھے، پادری کے خاندان کے پیچھے...

اس نے اپنے پپوٹے ذرا سے کھولے — وہی پوسٹ‌کارڈ، وہی سیاہ کھڑکی، میز پر کتاب سے ڈھکی ہوئی روشنی اور رفتہ رفتہ ان سبکو ایک سر نے چھپا دیا — ڈاکٹر کا سر۔ اس کی آنکھیں بلا پلک جھپکائے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"اماں!.."

یہ ایک بیمار دل کی پکار تھی، ایک بیمار، تنہا دل کی لیکن اس کے ہونٹوں کو بلاآواز حرکت ہو رہی تھی۔ وہاں اماں نہ تھی۔ اماں بہت دنوں سے نہ تھی۔ اس کو معلوم تھا۔

ڈاکٹر اس کو بڑی دیر تک دیکھتا رہا۔ وہ ناراضگی یا رنج سے بلا اس کو دیکھے اپنے خیالات میں غرق تھا۔

گالینا نے لاچار ہوکر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور فرماں‌برداری کے ساتھ اپنے کو تاریک اور پرسکون آرام کے سپرد کر دیا۔ جب

اس نے اپنی آنکھیں پھر ذرا کھولیں تو اس وقت ڈاکٹر کا سر وہاں نہ تھا بلکہ فیدوسیوشکا کا سر تھا اور وہی کتاب سے ڈھکی ہوئی روشنی میز پر تھی۔

فیدوسیوشکا اونگھتی رہی اور پھر اچانک آگے جھک پڑی اور دیوار پر اس کے سائے نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ اس نے اپنے سر کو پھر جھٹکا دیا اور خاموشی سے بیٹھ کر پھر اونگھنے لگی...

گالینا اس کو دیکھتی رہی... اور ہنس پڑی۔ کھڑکی سے روشنی آ رہی تھی اور ڈھکا ہوا لیمپ میز پر سرخ معلوم ہو رہا تھا — کیا صبح ہو گئی تھی؟

وہ فیدوسیوشکا کو پکارنا چاہتی تھی لیکن اس میں اتنی طاقت نہ تھی، وہ نقاہت سے مسکراتی ہوئی پھر گہری اور پرسکون نیند سو گئی۔

وہ یہ محسوس کرکے جاگ اٹھی کہ کوئی بڑی بے باکی سے اس کے پپوٹے گدگدا رہا ہے۔ اس کی پلکیں تھرتھرائیں۔ اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں لیکن سنہرے سورج کی نوک دار کرنوں نے خوشی اور شوخی کے ساتھ اس کو دیکھنے سے باز رکھا۔

”فیدوسیوشکا، کیا یہ تم ہو؟“

پورا کمرہ شفاف دھوپ میں نہایا ہوا تھا۔

فیدوسیوشکا دوڑ کر اس کے پاس آئی اور اس کا کمبل ٹھیک کیا۔

”ارے میری پیاری، بے چاری بیمار! شکر ہے خدا اور مقدس کنواری کا... دیکھو، یہ پی لو، ڈاکٹر کا حکم ہے... واسیلی میرے پاس آیا اور اس نے بتایا کہ استانی بے ہوش ہو گئی ہیں۔ پھر وہ پادری کی بیوی کے پاس گیا۔ وہ یہاں دوڑتی ہوئی آئی اور دیکھا کہ تم چقندر کی طرح سرخ ہو رہی ہو۔ وہ بجلی کی طرح بھاگی، میرے بچے ہیں، اس نے کہا 'اور ممکن ہے کہ ان کو بھی بیماری لگ جائے'۔ اس نے اپنے مزدور کو گھوڑے لیکر سیدھے ڈاکٹر کے پاس بھیجا۔ کسی کو پتہ نہ تھا کہ وہ کب واپس آئے گا۔ ممکن تھا کہ ڈاکٹر وہاں نہ ہو اور تم انتظار کے دوران مر جاؤ۔ اس لئے کسانوں نے سیکیتکا کو ایریےیخا کے پاس گوریاینووہ بھیجا۔ سیکیتکا وہی شخص ہے جو تمھیں اسٹیشن سے لایا تھا۔ وہ وہاں گیا اور بہت جلد واپس آیا۔ خدا اس کو بڑی زندگی دے، ایریےیخا نے تمہارے اوپر ایک جادو پڑھا، ورنہ تمھیں دن کی روشنی پھر کبھی دیکھنی نہ

نصیب ہوتی۔ کمرے میں عورتوں کا مجمع تھا۔ سب کو تمہاری حالت پر افسوس تھا۔ پادری کی بیوی کھڑکی کے پاس آتی رہی اور وہاں اپنا چہرہ رکھکر روتی رہی۔ وہ اندر آنے سے ڈرتی تھی۔ ڈاکٹر پاگلوں کی طرح آیا اور سب کو بھگا دیا۔ ایرے یخا اور سب عورتوں کو، صرف مجھے اکیلا تمہارے پاس چھوڑا۔ اور کیسا اس نے میرا پنڈ پکڑا ہے، لعنت ہو اس پر، بیس مرتبہ تو میرے ہاتھ دھلوائے، پریشان کر مارا، کمبخت نے... میرے خیال میں وہ خود ایک پوری رات تمہارے پاس بیٹھا رہا۔ وہ دوائیں لے آیا۔ ارے وہ رہیں بوتلیں!.. اور پادری کی بیوی نے تم کو تازے گوشت کی یخنی بھیجی، بڑی تیز اور سرخ!.. لیکن تم نے ایک قطرہ بھی نہیں پی۔ ارے۔ میں کتنی بیوقوف ہوں۔ بس باتیں ہی کئے جا رہی ہوں۔ اگر کہیں ڈاکٹر آجائے تو میری بوٹی بوٹی کر ڈالے گا۔"

گالینا بڑی نرم دلی سے مسکرائی۔ اس کے دل میں ایک جذبہ تھا — سب سے محبت کا — فیدوسیوشکا، کسان، عورتوں اور پادری کی بیوی سے...

"اور ڈاکٹر سے؟.."

لیکن سب سے زیادہ اس کو چمکدار اور خوشکن روشنی سے محبت تھی، روشنی جس نے تمام کمرے کو گرم اور چمک دار سنہری دھوپ سے بھر دیا تھا۔

جس وقت وہ باہر جانے کے قابل ہوئی اس وقت برف یاد رفتہ ہو چکی تھی۔ جس طرف وہ دیکھتی تھی افق تک، نیلے آسمان تک بے انتہا ہریالی پھیلی تھی۔ باغوں کے سبز دھند میں نیکیفور لوکیچ کے گاؤں تھے اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہاں رنج، غریبی اور بھوک پھیلی ہوئی ہے۔

دو ہفتے سے بارش ہو رہی تھی۔ پھر ہر چیز کیچڑ کے ناقابل گذر سمندر میں ڈوب گئی تھی لیکن اب حالت اتنی خراب نہ تھی۔ برچ کے درخت جو سر جھکا جھکا کر ہوا میں سرسرا رہے تھے ننگے نہ تھے۔ اب ان میں نئی ہری ہری کونپلیں تھیں۔

"ٹھیک ہے، زمین کو اچھی طرح پانی پی لینے دو، خدا کا شکر ہے" کسان اپنی ٹوپیاں اتار کر اور صلیب کے نشان اپنے اوپر دنا بنا کر کہہ رہے تھے۔

سبق پڑھانے یا لنچ کے دوران گالینا اکثر کھڑکیوں کو دیکھتی جن پر پانی کی تیز دھاریں بہتی ہوتیں۔ اس کو ہر وقت کسی بات کا انتظار رہتا۔ وہ خود نہیں جانتی تھی کہ آیا اس کو نیلے آسمان پر سورج نکلنے کا انتظار تھا یا کھیتوں کی ہریالی پر روشنی پھیلنے اور دور کے منظر کے دکھائی دینے کا یا ممکن ہے اس کو کسی کے آنے کا ہر وقت انتظار ہو۔

لیکن کون؟ کوئی آنےوالا نہ تھا۔

آخرکار ہوا نے اپنا کام کیا، بادلوں کو خشک کرکے دور بھگا دیا، انھوں نے پانی کی پھوھاریں چھوڑنا بند کر دیں اور تیزی سے بھاگے۔ نیلے آسمان کے بڑے بڑے ٹکڑے کھلنے لگے اور آخرکار خشک، صاف آسمان ہر جگہ نیلا نظر آنے لگا۔

اور پھر یکایک نہ جانے کہاں سے چڑیوں کے ایک زبردست غول کی سمع‌خراش چہچہاہٹ گونج اٹھی۔ وہ ہر جگہ اڑنے لگیں، ایک لمحے کے لئے جھاڑیوں میں پھدکتیں اور تیزی سے سیٹیاں بجاتیں جیسے وہ ایک لمحہ بھی ضایع کرنا نہ چاہتی ہوں۔

تازہ دھلی ہوئی ہریالی چکاچوند پیدا کر رہی تھی اور پورا دیہات گرم سورج کی تعریف و ثنا ثنا کر رہا تھا۔

کھڑکی سے اس نے دیکھا کہ کتنی جلدی کیچڑ کا ایک ڈھیر سوکھ گیا اور سفید بطخیں پھر کنویں کے پاس آکر سنتریوں کی طرح کھڑی ہو گئیں۔

لنچ کے بعد دو گھوڑوں کی گاڑی سڑک کے سرے پر دکھائی دی۔ لمبا کوٹ پہنے کوچوان اپنا کوڑا ہلا رہا تھا لیکن اس کے پیچھے بیٹھے ہوئے مسافر کو پہچاننا نا ممکن تھا۔

کتے زور زور سے بھونکتے ہوئے صحنوں میں آگئے۔ گاڑی کے پہئے آہستہ آہستہ بھاری کیچڑ کو متھ رہے تھے۔

کیا وہ گاؤں سے گذر رہے ہیں؟ یا کسی طرف مڑینگے؟

شاید وہ ضلع کا ماہر زراعت ہو یا بیمہ ایجنٹ یا مویشی ڈاکٹر یا شاید سینے کی مشین بیچنےوالا ہو جو آسان شرائط پر اپنی مشینیں بیچتا ہے۔ اگر وہ کوئی اجنبی بھی ہے تب بھی اسے گاؤں میں رکنا چاہئے، اس کو مکانوں اور باڑوں کے پاس‌والے راستوں پر چلنا چاہئے جو اب سخت ہو چکے ہیں کیونکہ وہ گاؤں میں کوئی نئی چیز لایا

ہے جس سے ایک نئی چہل پہل پیدا ہوگی۔ گالینا کو نیا چہرہ دیکھنے کی خواہش اس سے پہلے کبھی اتنی نہیں ہوئی تھی۔

گاڑی زیادہ قریب آتی گئی۔ اب وہ مسافر کو دیکھ سکتی تھی۔ سیاہ ہیٹ اور نقاب میں ایک خاتون تھی۔ اس نے اپنا ہیٹ ٹھیک کرنے کے لئے ہاتھ اٹھایا جس میں کالا دستانہ تھا۔

گاڑی کیچڑ کے بڑے بڑے تودوں کو کاٹتی ہوئی سڑک سے اسکول کی طرف مڑ گئی۔

''ارے... یہاں آ رہی ہے!..'' گالینا نے ایک ہلکی سی آہ بھر کر بڑی خوشی کے ساتھ اپنے آپ سے کہا۔

گھوڑے جن کی دمیں اوپر بندھی ہوئی تھیں اسکول کی برساتی میں رک گئے۔ گالینا آنےوالی کا خیرمقدم کرنے گئی۔ خاتون نے اپنی انگلیاں ہلکے سے اپنی کنپٹیوں پر لگانے کے بعد کہا:

''میرا کنوارپن کا نام انگارووا ہے... بڑی کیچڑ ہے... آپ کی ماں ہیں؟ میرے خیال میں آپ کی ماں مر چکی ہیں؟.. یہی اسکول ہے؟''

بھاری نقاب کے اندر سے متحرک چہرہ تو نہیں دکھائی دے رہا تھا لیکن بےچین آنکھوں کی ہلکی سی چمک متاثر کن تھی۔

''میرے کمرے میں آئیے'' متحیر استانی نے کہا۔

''نہیں، نہیں، نہیں...'' عورت نے پریشان ہوکر اپنے بچاؤ کے لئے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔

بڑے ہیجان‌وپریشانی کے عالم میں منہ بناتے ہوئے اس نے گالینا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر دیکھا۔ لڑکی کو سانس لینا مشکل ہو گیا اور اس نے اپنے شانے جھٹکے۔

''اسکول کے اندر چلیں'' آنےوالی نے کہا۔

دونوں درجے میں داخل ہوگئیں۔ خاتون نے دیوار پر لٹکی ہوئی جانوروں، چڑیوں اور مچھلیوں کا جائزہ لیا، نصف کروں کے نقشے پر سرسری نظر ڈالی اور تختۂسیاہ کو گھمانے کی کوشش کی۔

''کیا بچے آپ کی بات مانتے ہیں؟''

گالینا نے اپنے شانے جھٹک دئے۔

''اتنی ہی جتنی دوسروں کی۔''

''ارے،نہیں۔ وہ آپ کی بات مانتے ہیں۔ وہ بلا کوشش کے آپ

کی بات مانتے ھیں ... آپ کسی سزا کی اجازت نہیں دیتیں ... کوئی سزا نہیں ۔ اور وہ آپ کے ھاتھ میں بالکل موم ھیں ...''

''آپ کو کیا معلوم؟''

''میں جانتی ھوں، میں جانتی ھوں!..'' اس نے کہا اور اس کی آواز روھانسی ھوگئی ۔ ''آئیے، آپ کے کمرے میں چلیں ... جلدی، مہربانی کرکے... آپ کے کمرے میں چلیں ...''

دونوں کمرے میں داخل ھوئیں ۔ انگارووا میز کے پاس بیٹھ گئی اور نصف مڑتے ھوئے اپنی نقاب اٹھا دی اور پھر اپنے دستانے اتارنے شروع کئے ۔

''مجھے صاف صاف بتائیے... ارے یہ پوسٹ کارڈ... کتنے اچھے ھیں... یہ اچھے ھیں کیونکہ یہ ٹیڑھے میڑھے اور بےترتیب ھیں...'' وہ بلا مڑے ھوئے اب بھی اپنے دستانے اتار رھی تھی ۔ ''کیا آپ مجھے ایمانداری سے بتا سکتی ھیں؟'' وہ اچانک گھومی اور گالینا کو دیکھنے لگی ۔ ''کیا آپ میرے شوھر سے محبت کرتی ھیں؟''

گالینا اپنی مہمان کے پاس سے ایک قدم پیچھے ھٹ گئی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کو گھورنے لگی، اس جنوب کی رھنےوالی کے حسین، گہرے رنگ کے چہرے کو ، اس کی نازک، ترشی ھوئی ناک اور خوبصورت بادامی آنکھوں کو جو نفیس، خمدار ، سیاہ چتونوں کے نیچے مہربانی اور محبت سے لبریز نظر آ رھی تھیں ۔

''میں نے آپ کو زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا ھے ۔ ''

دوسری عورت نے اپنے ھونٹوں کی تھرتھراھٹ روکتے ھوئے جواب دیا :

''میں کورسویارووا ھوں... جو ڈاکٹر آپ کو دیکھنے آتا ھے... اس کی بیوی ھوں... ضلع ڈاکٹر ...''

ان بےحد دلکش بادامی آنکھوں میں ایسا درد، ایسی اداسی تھی کہ گالینا اپنے ھونٹ کاٹنے لگی ۔

''لیکن سنئے... آپ کو یہ خیال کیسے ھوا؟.. میں بہت کم ڈاکٹر سے ملتی ھوں... محض اتفاق سے... چند باتیں سرسری طور پر ...''

دوسری عورت نے زور کی سسکی بھری اور سسکیوں کو روکنے کے لئے تھرتھراتے ھوئے ھونٹوں پر قابو پانے کی کوشش میں پھوٹ پڑی ۔

''یہ سچ ہے... میں یقین کرتی ہوں... آپ سچ کہہ رہی ہیں۔ لیکن وہ، وہ آپ سے محبت کرتے ہیں۔ ''

گالینا شرم سے سرخ ہو گئی۔

''میں نے ان کو کوئی موقع نہیں دیا... میری سمجھ میں نہیں آتا...''

''نہیں، نہیں، مجھے آپ کے اوپر شبہ نہیں ہے... انہوں نے مجھ سے کچھ نہیں کہا ہے... شاید وہ خود بھی نہیں جانتے... وہ ایماندار اور صاف گو ہیں۔ جو بات بھی وہ کہتے ہیں سچ ہوتی ہے۔ ہمارے تعلقات لاجواب ہیں... وہ مجھ سے ہر بات کہہ دیتے ہیں، ہر بات، اپنا ہر قدم، ہر شخص کے متعلق جس سے وہ ملتے جلتے ہیں... آپ کے ایک بھائی ہے اور اس کی وجہ سے آپ اس کورده میں کام کر رہی ہیں۔ چھٹیوں میں بھی پڑھاتی ہیں... آپ بچوں کے متعلق بڑی واقفیت رکھتی ہیں اور وہ بلا کسی سزا کے آپ کا حکم مانتے ہیں...''

''ارے، میں نے تو ان سے کبھی اس کے متعلق کچھ نہیں کہا۔ ''

مہمان نے گالینا کی طرف بڑی یاس آمیز نگاہوں سے دیکھا۔

''یہی... یہی تو ثبوت ہے... ان کو خود بھی شبہ نہیں ہے... وہ بہت ایماندار ہیں۔ آپ کے متعلق ہر بات جانتے ہیں، ہر بات... غیر شعوری طور پر انہوں نے ہر بات معلوم کر لی ہے... کہتے ہیں کہ آپ خوبصورت ہیں...''

اس نے لڑکی کی طرف غور سے دیکھا اور اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

''یہ سچ ہے... وہ ٹھیک کہتے ہیں... لیکن میرا... اس میں میرا کیا قصور ہے؟ میں نے کیا غلطی کی ہے؟.. وہ مجھ سے محبت کرتے تھے، بہت محبت کرتے تھے!.. اور بچہ... ہمارے ایک لڑکا ہے... وہ ہمارے لئے سب کچھ ہے... لیکن میں دیکھتی ہوں کہ ان کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ پہلے کی طرح پرخلوص اور ایماندار ہیں... کچھ بھی نہیں چھپاتے، پھر بھی میں دیکھتی اور محسوس کرتی ہوں کہ ان میں تبدیلی ہو رہی ہے۔ ان کے دل کی ذرا سی تبدیلی کا بھی مجھے پتہ چل جاتا ہے... میں ہر بات سن لیتی ہوں، ہر چیز محسوس کر لیتی ہوں... اوہ، میرے خدا!.. جب کوئی محبت کرتا ہے، بہت ہی گہری محبت، اسی وقت وہ اپنے محبوب کی ہر بات کو محسوس کر سکتا ہے... میں اور... وہ... ہم...''

اس کا پورا جسم خاموش سسکیوں سے کانپ رہا تھا اور وہ تھرتھراتے ہوئے ہونٹ مضبوطی سے بھینچے ہوئے تھی۔

گالینا نے ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی پھٹی پھٹی گھورتی ہوئی آنکھیں عورت کی طرف سے نہیں ہٹائی تھیں۔ اس نے پوری طرح ضبط کرنے کی کوشش کی۔ روز روشن تھا، سورج چمک رہاتھا.. وہ صبح اٹھی تھی، چائے، بچے، غل غپاڑہ، ہنگامہ، سبق، لنچ اور تمام روزمرہ کی باتیں۔ اس کو محسوس ہو رہا تھا کہ اس وقت جو کچھ ہو رہا تھا وہ گذر جائیگا اور معمول میں جو خلل پڑ گیا ہے وہ پھر اپنے ڈھرے پر واپس آ جائیگا۔

نہیں، یہ گذر نہ جائیگا۔ میز کے پاس ایک جوان عورت بیٹھی تھی، اس کا نقاب اٹھا تھا ایک ایسی عورت جس کی آنکھیں حسین، پراعتماد اور بھوری تھیں، جس کی پلکیں آنسو پاک کر رہی تھیں، ایک عورت جس کا چہرہ خوبصورت، زرد اور غیرمعمولی طور پر دلکش تھا۔

کورسویارووا اب کچھ پر سکون ہو چکی تھی۔

''میرے متعلق برا خیال نہ کرنا، میں پاگل یا بےوقوف نہیں ہوں... پھر بھی... میرے خدا... میں خود اپنے کو نہیں سمجھتی... آپ اس وحشت‌ناک احساس کو سمجھتی ہیں: تمھیں کسی سے پیار ہو، جنون‌انگیز محبت... تم اپنی پوری زندگی نچھاور کر چکی ہو، کچھ بھی باقی نہ رہ گیا ہو... اور تم سے محبت کی جائے، بے حد محبت کی جائے، خالص محبت اور تمھیں بھی اس کا پتہ ہو اور اچانک تم یہ محسوس کرو...'' اس کی آواز دھیمی ہوکر سرگوشی سی ہو گئی ''کوئی چیز تمہاری محبت کو کھوکھلا کر رہی ہے... ذرہ ذرہ کرکے... وہ ڈھے رہی ہے اور تم کچھ نہیں کر سکتی ہو، کچھ بھی نہیں، اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہو اور ایک انگلی تک نہیں ہلا سکتیں... اور یہ دہشت قریب‌تر آتی جاتی ہے، برداشت کرنا مشکل ہو جاتا ہے... بس یہی بات کچلے ڈالتی ہے...''

وہ بڑی بڑی گول آنکھوں سے جن میں دہشت بھری تھی گھور رہی تھی اور سازش کرنےوالوں کی طرح سرگوشی میں کہہ رہی تھی۔

''میری بات سنئے، میں ان کی ہر سانس پر نگاہ رکھتی ہوں، میں ان کے لئے چھوٹے سے چھوٹا کام کرتی ہوں۔ ان کو خود وقت نہیں ملتا۔

وہ ہمیشہ ادھر ادھر آتے جاتے رہتے ہیں ۔ وہ خود رسالے نہیں پڑھ سکتے، میں تین چار رسالے پڑھکر ان کو بتاتی ہوں ۔ میں نے بیماریوں، طبی اصطلاحات اور خاص خاص دریافتوں کے متعلق بہت کچھ پڑھا ہے ۔ میں طبی رسالے پڑھکر ان کے لئے دلچسپ مضامین پر نشان لگاتی ہوں ... میں نے اپنے کو بالکل ان کے لئے وقف کر دیا ہے... کیا میں ملزم ہوں؟.. مجھے ذرا بھی الزام نہیں دیا جا سکتا... وہ مجھے پیار کرتے ہیں ... اور بچے پر بھی الزام نہیں ہے،، اچانک وہ مسکرائی ۔ ''اور آپ کو بھی ملزم نہیں ٹھہرایا جا سکتا... آپ سچ کہتی ہیں... وہ بھی یہی کہتے تھے... میں جانتی ہوں ... ،،

گالینا اس کو اسی طرح گول گول پریشان دیدوں سے تک رہی تھی اور محسوس کر رہی تھی کہ یہ ایسی سرحد ہے جس پر کوئی قدم نہیں رکھ سکتا ۔

پھر اس نے اپنا سر نیچا کرکے اطمینان کی سانس لی ۔

''اس کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا، عام طور پر سبھی کے ساتھ یہ واقعہ پیش آتا ہے لیکن یہ واقعہ میرے ساتھ کبھی نہ پیش آئےگا...،، اس نے سوچا ۔

''پریشان نہ ہوییے،، اس نے کہا ۔ ''پانی پیجئے، یہ رہا گلاس ۔ آپ مبالغے سے کام لے رہی ہیں ۔ نکانور سرگئیوچ سے میری ملاقات بہت ہی کم، مختصر اور اتفاق سے ہوتی ہے ۔ وہ بھی جب مریضوں کو دیکھنے آتے ہیں ۔ اب میں ایسا کچھ کرونگی کہ ہم ایک دوسرے سے بالکل نہ مل سکیں، بس یہ ٹھیک ہے ۔ ،،

دوسری عورت نے جس کے ہونٹ کانپ رہے تھے خوف زدہ ہوکر اپنے ہاتھ اس طرح بڑھائے جیسے اپنا بچاؤ کر رہی ہو ۔

''نہیں، نہیں، نہیں... یہ نہیں... اس کے سوا سب کچھ... میں کچھ نہیں کرونگی... یا تو وہ صرف میرے ہی رہینگے... مکمل طور پر یا ہم علحدہ ہو جائیں گے...،،

اب اس کی آنکھیں خشک تھیں اور اس کا چہرہ سخت اور سرد پڑ گیا تھا ۔

''کبھی نہیں ۔ ،،

گاڑی، بھاری پن سے آہستہ آہستہ چلتی رہی تھی ۔ وہ اپنے پہیوں سے کیچڑ متھ رہی تھی، آخرکار دور سڑک کے نیلے سرے پر جا کر وہ غائب ہوگئی ۔

گالینا اپنی کنپٹیاں ہاتھوں سے دبا کر کھڑی ہو گئی۔
''یہ ذرا نامناسب بات تھی... اس عورت نے ایسا کیوں کیا؟.. کیا مجھے ملزم ٹھہرایا جا سکتا ہے؟..''
لمبی لمبی پلکوں‌والی بھوری آنکھیں اور عقابی ناک آئینے سے جھانک رہی تھیں...
''ہاں، تم قابل‌الزام ہو۔''
''لیکن میں نے اپنے قول و فعل سے اس کو کسی طرح کا موقع نہیں دیا۔''
''مجرم۔''
وہ اپنی آنکھیں نیچی کئے ذرا دیر تک کھڑی رہی۔
''میں جانتی ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔''

اس کو ہمیشہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ڈھرے پر لگی ہوئی معمولی زندگی کو بدلنا بہت مشکل ہے جیسے اچانک ہر بات کو روکنا دشوار ہوتا ہے لیکن جب اس نے اسکول چھوڑنے کا نوٹس دے دیا تو ہر چیز آسان اور سیدھی ہو گئی — بس اس کو اپنی چیزیں باندھنا اور گاڑی میں بیٹھنا رہ گیا۔

گالینا اپنے خالی کمرے میں فرش پر ایک ٹوکری کے سامنے بیٹھی کپڑے، کتابیں اور پوسٹ‌کارڈ رکھ رہی تھی۔ ننگی دیواریں خالی اور اداس معلوم ہو رہی تھیں۔

امتحان کی مصروفیت کا زمانہ جب کہ اس کو اور شاگردوں دونوں کو سخت‌ترین محنت کرنی پڑی تھی گذر چکا تھا۔ مقامی بورڈ کا چیرمین امتحان لینے آیا تھا — ایک بناٹھنا مقامی امیروں کے طبقے کا نوجوان، یونیورسٹی کا بلا پہنے۔ وہ دانت بھیچ کر باتیں کرتا، اپنے ناخن صاف کرتا رہتا اور اس کی آنکھیں آدھی مندی رہتیں۔

ہاں ہر بات ایسی آسان تھی جیسے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جانا ہو۔ اس کو اس رات کے فضول خیالات یاد آئے جب اس نے اپنے کو بیوہ... سات بچوں کی ماں خیال کیا تھا... اور مسکرائی۔

وہ عورت جس نے اس کو ایک روبل کی رشوت دینے کی کوشش کی تھی اور وہ عورت جو اپنے بیٹے کو لیکر آئی تھی جس کے گندی بیماری تھی کہیں دور اس کے ذہن میں منڈلا رہی تھیں، دھندلی سی اور اس کے دل میں ان کے خلاف کوئی کینہ نہ تھا۔

واسیلی کمرے میں کئی مرتبہ آچکا تھا۔ وہ کمرے میں کھڑا ہوکر اپنے پیر بدلتا اور ٹھنڈی سانسیں بھرکر باھر چلا جاتا۔

ایک ابابیل کمرے میں اڑ رھی تھی۔ تیزی سے اس نے کمرے کے دو چکر لگائے اور پھر چھت کے ایک کونے میں لٹک گئی۔ اس نے اپنے تیز پر سمیٹ لئے اور زور زور سے سانس لیکر اپنا سر ادھر ادھر گھمانے لگی۔ پھر زور سے چیخی اور تیزی سے کھڑکی سے تیر کی طرح باھر اڑ گئی۔ کھڑکی سے ابتدائی موسم گرما کی خوشکن ھریالی نظر آ رھی تھی۔ مرغ بڑے جوش سے بانگیں دے رھے تھے اور مرغیاں کڑکڑا رھی تھیں۔ دور گاؤں کے باھر ایک خالی گاڑی کھڑکھڑاتی ھوئی آرھی تھی۔

اور یہاں وہ اکیلی بیٹھی اپنا سامان باندھ رھی تھی۔ اسی طرح جیسے وہ اب تک اکیلی رھی تھی۔ ایک لمحے کے لئے کسی چیز نے اس کے دل کو دبوچ لیا۔

ابابیل پھر کمرے میں آگئی، ذرا دیر تک دیوار میں لٹکی رھی اور پھر اڑ گئی۔ اور پھر وھی خوشگوار دن، مرغیوں کی کڑکڑاھٹ اور دور کا نیلا جنگل۔ گوریاں بڑے زور میں چہچہا رھی تھیں اور پھر معلوم نہیں کیوں ھر بات آسان اور پرمسرت ھو گئی۔

فیدوسیوشکا اس کی مدد کرنے آگئی اور ھر چیز بےتکےپن سے ٹوکری کے کونوں میں گھسیڑنے لگی۔

”نہیں، فیدوسیوشکا، یہ مت کرو، یہ چیز وھاں ٹھیک نہیں رھیگی۔“

فیدوسیوشکا نے چھوٹی چھوٹی چیزیں مانگنا شروع کیں، کوئی خالی منجن کا بکس، خالی دوا کی بوتل، پرانا رومال یا کوئی چیتھڑا۔

حالانکہ ان چیزوں کی کوئی اھمیت نہ تھی لیکن یہ خیال کرنا کوئی اچھی بات نہ تھی کہ اس کی آنکھیں ھر جگہ لگی ھوئی ھیں اور اب وہ اور کچھ مانگنےوالی ھے۔

دوسری عورتیں بھی کمرے میں جمع ھو گئیں۔ حالانکہ انھوں نے کوئی چیز مانگی نہیں لیکن وہ اس کو دیکھتی رھیں، وہ انتظار کر رھی تھیں کہ وہ کوئی تحفہ دیگی۔

دو دن بعد جانا تھا۔ واسیلی نے گاڑی بلائی تھی۔ ابھی سورج جھونپڑیوں کی قطار کے اوپر بلندھی ھوا تھا کہ بچوں کے شور کی آواز

اس کی کھڑکی کے نیچے گونجنے لگی۔ بچے گوریوں کی طرح ہوتے ہیں، وہ ہر موقع پر تیزی سے جمع ہو جاتے ہیں۔

واسیلی نے سامان باہر لے جانا شروع کیا۔ فیدوسیوشکا آئی۔ اب مانگنے کے لئے کچھ باقی نہیں رہ گیا تھا — لیکن کوئی بات نہیں۔ وہ راستے کے لئے کچھ سموسے لائی تھی۔

باہر سڑک پر، اسکول کی برساتی کے قریب کچھ غل سا ہوا، زور کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''تم میری گاڑی کیوں پکڑے ہو؟''

''چھوڑو اسے، تمہیں کس نے بلایا تھا؟''

''چھوڑو!..''

''میں تمہاری آنکھیں تمہاری گدی میں ٹھونس دونگا۔''

''میں نے جس کو مار دیا وہ دوسرے ہی دن ختم ہو گیا۔''

واسیلی کی آواز بیچ میں سنائی دی:

''ایپات، تم اپنی ٹانگ کیوں بیچ میں اڑا رہے ہو؟ تم کو کسی نے نہیں بلایا تھا۔ بس، لوٹ جاؤ۔''

گالینا نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ واسیلی نے گالینا کو اسٹیشن لے جانے کےلئے جس گاڑی‌بان کو بلایا تھا اس کے اور ایپات کے درمیان اس کی ٹوکری ہتھیا لینے کے لئے کشمکش ہو رہی تھی، ہر ایک ٹوکری میں بندھی ہوئی رسیوں کو جھپٹ لینا چاہتا تھا اور مختلف سمتوں کو گھسیٹنے کی کوشش میں ٹوکری زمین پر اچھل کود رہی تھی۔ مرد اور عورتوں کا ایک مجمع ان لوگوں کے گرد ہو گیا تھا اور لوگ ابھی آ رہے تھے۔

متحیر ہوکر گالینا برساتی میں پہنچی۔ وہاں ایک گاڑی کے بجائے دو گاڑیاں موجود تھیں۔

''کیا معاملہ ہے؟''

ایک لمبے تڑنگے جوان نے، جو ایک دن اس کی توہین کر چکا تھا، لیکن اس نے شکایت نہیں کی تھی کیونکہ اس سے کوئی فائدہ نہ تھا، واسیلی اور گاڑیبان کے ہاتھ سے جھٹکا دیکر ٹوکری چھین لی اور ان دونوں کو اپنے کوڑے سے کتوں کی طرح دور رکھتے ہوئے ٹوکری کو گھسیٹ کر اپنی گاڑی تک لے گیا۔

''اس کے کیا معنی ہیں؟ تم کیا کر رہے ہو؟''

آدمی رک گیا، وہ ٹوکری کا ایک کونہ پکڑے اس کو کینہ پرور نگاھوں سے دیکھ رہا تھا۔

''گالینا الیکساندروونا، ان کو بھونکنے سے منع کیجئے،، اس نے کہا۔ ''یہ کتوں کی طرح بھونک کر مجھے اپنا کام نہیں کرنے دیتے۔،،

''تم نے ٹوکری چھوئی کیوں؟.. اسے واسیلی کو دےدو۔،،

''اس کو کرایہ پر نہیں بلایا گیا ھے،، مجمع نے غل مچایا۔

''وہ بلا کہے یہ کام کر رہا ھے۔،،

''ایپاتکا، تم پاگل ھو گئے ھو، اس آدمی کو کرایہ پر بلایا گیا تھا اور تم مخواہ کے لئے ھنگامہ کر رھے ھو...،،

ایپاتکا غصے سے مڑا، اس کی کینہ پرور آنکھوں میں سیاہ چمک تھی۔ اس نے ابھی رسی کی سخت گرفت اپنی مٹھی سے نہیں چھوڑی تھی۔

''تم دوسروں کا سر کیوں الاپ رھے ھو؟ تم نے کیا لیا ھے؟،، اس نے گاڑیبان کی طرف مڑتے ھوئے کہا جس کے خوبصورت داڑھی تھی۔

''کیا لیا ھے؟،، گاڑیبان نے اس کا مذاق اڑاتے ھوئے دھرایا۔ ''میں نے چالیس ورسٹ کے پانچ روبل مانگے ھیں۔ لوٹ رہا ھوں نا ان کو! واپس آنے پر مجھے ایک دن تو گھوڑے کو آرام دینا پڑیگا۔،،

''اور میں ایک کوپک بھی نہیں مانگتا!،، جوان نے اپنے کوڑے کی ڈنڈی سینہ پر مار کر کہا۔ ''میں بھلا ان سے کچھ لے سکتا ھوں!،،

''نہیں، یہ ٹھیک نہ ھوگا۔،،

''انھوں نے ھمارے لئے مفید کام کئے ھیں۔،،

''ھم نے ان کے متعلق کبھی ایک بھی برا لفظ نہیں سنا۔،،

''اس کو بھی ان کے لئے کچھ کرنے دو۔،،

اس طرح گویا جھگڑا طے ھو گیا۔ نوجوان نے اس کی ٹوکری غصے کے ساتھ زور سے اپنی گاڑی پر ڈالی اور اس کو باندھنا شروع کر دیا۔ اس کی کہنیاں باھر نکلی ھوئی تھیں۔

گالینا پریشان کھڑی تھی۔ وہ یہ کہنا نہیں چاھتی تھی کہ ایپات کے ساتھ سفر کرنے سے اسے ڈر لگتا ھے کیونکہ نوجوان کی تمام حرکتوں میں بڑا اعتماد تھا۔

''اے، کانےکاھل۔ لا، مجھے باقی چیزیں بھی دے تاکہ میں پیچھے رکھ دوں۔،،

جوان نے اس کے لئے بیٹھنے کی جگہ بنا دی - اس نے رسی کے نیچے سوکھی گھاس بھر دی تاکہ رگڑ نہ لگے -

"سنو، میں یہ نہیں چاھتی کہ کوئی مجھے مفت پہنچائے - ھم نے دوسرے آدمی کو بلایا تھا، تم کیوں آگئے!"

"اس سے جھگڑنے سے کیا فائدہ" واسیلی نے کہا - "یہ بالکل جاھل ہے - میرے خیال میں آپ کو اس کے ساتھ جانا ھوگا اور تم ایوسے یچ، بہتر ھوگا کہ اپنا گھوڑا کھول دو - ایپاتکا کا گھوڑا اچھا رھےگا - وہ جلدی پہنچ جائیگا اور مفت کام بھی کرنا چاھتا ہے -"

"ایپاتکا کا گھوڑا اچھا ہے - وہ ٹھیک سے پہنچا دیگا" مجمع نے حمایت کی -

"اچھا تو ایپاتکا ھی کو لے جانے دو -"

ایپاتکا کی گاڑی میں اس کا سامان باندھا جا رھا تھا لیکن گالینا اب بھی مذبذب کھڑی تھی - اس کو پھر وہ سخت کسک محسوس ھوئی - وہ مجمع میں اکیلی تھی - کسی چیز نے اس کو احتجاج کرنے سے روکا -

"ھاں، ایوسے یچ، یہ لو، تم کو زحمت دی -"

ایوسے یچ نے آدھا روبل اپنے منہ میں چپکایا اور اپنے گلچھے میں دبا لیا اور گاڑی پر سوار ھو کر کھڑکھڑاتا ھوا سڑک پر چل دیا -

گاڑی پر ھر چیز ٹھیک سے رکھ دی گئی - روانگی کا وقت آگیا - اس کو پھر افسوس ھوا - اس نے درجہ پر آخری نظر ڈالنی چاھی اور اس چھوٹے خالی کمرے پر بھی جس نے خاموشی سے اس کا خیر مقدم کیا تھا، اس کے خیالوں، خوابوں، امیدوں، غموں اور تنہائیوں کو اپنایا تھا اور بےچاری لڑکی کے ان آنسوؤں کو بھی جن کے متعلق اگر واسیلی نہ ھوتا تو کوئی بھی نہ جانتا -

"خدا حافظ، واسیلی - خدا تم کو دنیا کی ھر اچھی چیز عطا فرمائے، تمہارا ھر ھر چیز کے لئے شکریہ - بہت بہت شکریہ" اور اس نے واسیلی کے کھردرے گھٹے پڑے ھوئے ھاتھ لے کر بڑے خلوص سے دبائے -

واسیلی سوں سوں کرکے اپنی ایک آنکھ سے دوسری طرف دیکھنے لگا -

"آپ کو نہ جانا چاھئے - آپ یہاں بالکل ٹھیک سے رہ سکتی تھیں -

دنیا بھر میں مارے مارے پھرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ لوگ دوسری جگہوں کی طرح یہاں بھی شادی کر لیتے ہیں۔"

"خدا حافظ، واسیلی۔"

وہ سڑک پر آ گئی۔ اب گاڑی پر بیٹھنے کا وقت آ گیا تھا۔ عورتوں اور مردوں کا وہ مجمع جو عام طور پر ہر چیز سے بےنیاز رہتا ہے وہاں اب بھی تھا۔ لڑکیاں سورج مکھی کے بیج کھا رہی تھیں، عورتیں اپنے بچوں کو گود میں لئے کھڑی تھیں۔ بچے جو اس کے شاگرد تھے ادھر ادھر دوڑ رہے تھے، ایک دوسرے کا پیچھا کر رہے تھے اور پکار رہے تھے۔

اس نے گاڑی کی طرف دیکھا کہ ہر چیز رکھی جا چکی ہے یا نہیں۔ اس نے دیکھا کہ اس کے لئے کہیں بیٹھنے کی جگہ نہیں ہے۔ تمام خالی جگہ تھیلوں، پروں اور چیتھڑوں سے بھری ہے جن میں کوئی چیز لپٹی ہوئی ہے۔

"یہ سب کیا ہے، یہ تو میری چیزیں نہیں ہیں؟ ان کا یہاں کیا کام؟"

ایک زردرو عورت اس کے پاس آئی اور اپنا مضبوط ہاتھ گاڑی کے ہتھے پر رکھ کر کہنے لگی:

"یہ سموسے اور دوسری چیزیں ہیں جو ہم نے راستے میں تمہارے کھانے کے لئے تیار کی ہیں۔ ان کو مزے میں کھانا۔ خدا تم کو خوشیاں نصیب کرے۔"

"اور یہ میری طرف سے ہے" ایک اور عورت نے کہا جس کے شانے پر بچہ لٹک رہا تھا۔ "تم نے میرے وانیا کو پڑھنا لکھنا سکھایا۔ خدا تم کو تندرست رکھے۔"

"کوئی بات نہیں۔ یہ کھانا" ایک اور عورت نے کہا جس کی گود میں بچہ تھا۔ یہ وہ عورت تھی جس نے اس کو برا بھلا کہا تھا جب وہ اس کے لڑکے کا داخلہ نہ کر سکی تھی۔ "راستہ کافی لمبا ہے اور تم کو تھوڑے بہت کھانے کی ضرورت ہوگی۔ ہر شخص جس کے پاس کچھ تھا وہ لایا ہے۔ اگر تم یہاں رہتیں تو میرے واسیا کو پڑھنا لکھنا سکھاتیں۔"

گالینا ان مردوں، عورتوں اور اپنے شاگردوں کو جو گاڑی کے چاروں طرف جمع تھے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

ایک چھوٹی زردرو لڑکی جس کے خاندان میں آتشک کی بیماری تھی گالینا کے گھورنے پر شرما کر اس کو دیکھنے لگی اور ھکلا کر کہنے لگی:

''چچا ف... ف... فیدول کے پاس ایک پاگل ب... ب... بطخ...''

اس کے پتلے پتلے ہونٹ کانپ رہے تھے اور آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

''مجھے افسوس ہے کہ تم جارھی ہو...''

''کیا یہ وھی لوگ ھیں؟'' گالینا نے اپنے آپ سے پوچھا۔ ''یہ سب کہاں سے آئے ھیں؟ یہ کون ھیں؟ میں نے ان کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا...''

ان کے درمیان جو اجنبیت کی ھلکی سی دیوار تھی وہ ھٹ گئی تھی، وہ سب اس کے چاروں طرف جمع ھو کر ایک ساتھ بول رہے تھے۔ عورتیں رومال کے کناروں سے اپنی آنکھیں پونچھ رھی تھیں۔

''خدا تمہاری ھر مراد پوری کرے...''

اسکو پل بھر کے لئے دھندلا سا خیال آیا:

''نیکیفور لوکیچ سے بھی اسی طرح باتیں کرتے ھیں یہ لوگ...''

لیکن فوراً یہ خیال جاتا رہا۔

''سفر اچھا کٹے...''

''سلامت رھو...''

اس پر ایک خوشکن خوف طاری ھو گیا۔ اس نے پھر محسوس کیا کہ یہ ایک نا معلوم جذبہ تھا اور چھوٹی لڑکی کو پکڑ کر اس کے ھونٹ چوم لئے۔

عورتیں باری باری آتیں اور اپنے ھونٹوں کے کونے انگوٹھوں اور انگلیوں سے پونچھکر اس کو چومتی گئیں۔ لڑکیوں نے بھی اس کو چوما اور لڑکوں نے رخصت کرتے ھوئے اپنے ھاتھ اس کی طرف بڑھا دئے۔

وہ مشکل سے ان اترے ھوئے چہروں میں امتیاز کر پاتی تھی۔ آخرکار وہ گاڑی پر بیٹھ گئی اور یکےبعددیگرے تمام عورتوں نے اس کی گود میں چیزیں رکھنا شروع کیں — کیک، سموسے اور گاجر کے سموسے۔

''پیاری، ھماری دعائیں تمہارے ساتھ ھیں۔''

گالینا کو اپنے اوپر شرم آ رھی تھی۔ وہ اپنے تھر تھراتے ھونٹوں کو قابو میں رکھ کر سب کا شکریہ ادا کر رھی تھی۔

''شکریہ - شکریہ، میرے عزیز دوستو... ارے - مجھے کیا ہو گیا ہے...''

''اور دیکھو ایپات - ذرا خیال رکھنا اور اچھی طرح پہنچا دینا... یہ اچھا گھوڑا ہے - اچھی طرح پہنچا دیگا''، ان مردوں نے کہا جو گاڑی کے سامنے جمع تھے - ایپات سامنے گاڑی پر بیٹھا تھا -

''پانی پلانے کے لئے 'موکری کوت' پر رکنا - ''

''دیکھو ٹیلے پر کہیں دلدل میں نہ دھنس جانا - داھنے ھاتھ رھنا - ''

''جانتا ہوں''، ایپات نے حقارت آمیز اعتماد کے ساتھ کہا اور لگاموں کے سرے سنبھال لئے -

''خدا حافظ...''

''رکو! رکو! رکو!''

عورتوں نے گاڑی روک لی اور مڑ کر دیکھا - ایک چھوٹی لڑکی دوڑتی ہوئی آئی اور اس کے پیچھے ایک بڑھیا تھی - بڑھیا گاڑی کے پاس پہنچی اور اپنے پتلے سینک جیسے ھاتھ گاڑی کے ڈنڈے پر رکھ کر بوڑھی، دھندلی اور دودھیا آنکھوں سے گالینا کو دیکھنے لگی -

چھوٹی لڑکی نے مشکل سے اپنا پھولتا ہوا سانس روک کر کہا:

''میں اس کو لے آئی - ''

یہ دودھیا آنکھیں گالینا کے ذہن میں بسی ہوئی تھیں لیکن اس کو کسی طرح یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس نے کہاں یہ آنکھیں دیکھی تھیں - بڑھیا نے جو اب بھی اس کو اپنی آشنا اور پر سکون آنکھوں سے گھور رہی تھی کہا:

''بچی، کیا تم اچھی نہیں ہو؟''

اس نے یہ آواز کہیں سنی تھی -

عورتیں چلا کر کہنے لگیں:

''نانی، کوئی منتر افسروں کے خلاف پڑھ دو، افسروں کے خلاف، افسر ان کو بھگائے دے رہے ہیں... کوئی ایسا منتر جس کی وجہ سے ان کو افسروں سے نبٹنے میں آسانی ہو...''

پھر اس کو یاد آ گیا: رات، وہ جلتی ہوئی پراسرار جھنکار، تاریکی میں نظر آتے اور غائب ہوتے ہوئے پوسٹ کارڈ، کتاب سے ڈھکی ہوئی روشنی اور بڑھیا کی یکساں سرگوشی -

''نانی، میں بالکل اچھی ہوں۔ ''
''یہ کوئی بات نہیں ہے، کوئی بات نہیں'' عورتیں چلائیں۔
''نانی، افسروں کے خلاف ایک منتر پڑھ دو، ایک منتر۔ افسر ان کو بھگائے دے رہے ہیں... کوئی بات نہیں، نانی۔ منتر ان کے لئے مفید ہوگا...''

کسی طرح پیچھا چھڑانے کے لئے گالینا منتر سننے کو بھی تیار تھی لیکن اپنے شاگردوں کے سامنے اسے شرم آتی تھی۔ سب عورتیں گاڑی کے ڈنڈے سے چمٹی ہوئی تھیں اور سرد چپکے چپکے ہنس رہے تھے۔
''عورتیں اٹھائینگی...''
''واقعی، افسر اسے نہیں رکھیں گے۔ جب کوئی معقول شخص ملتا ہے تو اسے بھگا دیتے ہیں...''
''میں خود اپنی مرضی سے جا رہی ہوں... میں نے نوٹس دی تھی...''
''ہم جانتے ہیں جب وہ نوٹس دینے کو کہتے ہیں تو دینی پڑتی ہے...''
''کوئی پرواہ نہیں۔ پڑھو۔ اس سے کوئی نقصان نہ ہوگا...''
''تم کچھ پگھل نہ جاؤگی...''

گالینا کو بڑھیا کی سرگوشی سنائی دینے لگی۔ دودھیا آنکھیں اسی پر لگی ہوئی تھیں اور دبلا پتلا جھری دار ہاتھ صلیب کے بڑے بڑے نشان بنا رہا تھا۔
''... پہلی مرتبہ میں خدائی دور میں... التجا کرتی ہوں اور جھاڑتی ہوں... چراگاہوں کے درمیان، سڑکوں کے درمیان ایک ایسا حمام ہے جس کے کونے نہیں ہیں...''

وہ کیا کرے۔ اس بڑھیا کے ہاتھ کو الگ جھٹک کر ایپات سے گاڑی ہانکنے کے لئے کہنا بری بات ہوتی۔
''... تاکہ اس کو رنج و افسوس ہو اور رحم آئے، جشن کے موقعوں پر، بات چیت میں اور نرم بستر پر اس کی حفاظت کرے...''

بڑھیا نے اپنا ہاتھ گاڑی پر سے ہٹالیا اور اب بھی پہلے کی طرح اپنی بوڑھی، دودھیا آنکھوں سے گھورتے ہوئے اس نے صلیب کا نشان بنایا۔
''آمین، پیاری۔ خدا تم کو...''

ایپات نے اس مرتبہ فیصلہ کن انداز میں گھوڑے کے چابک لگائی ۔ پہیئے کھڑکھڑائے ۔ گالینا نے آخری نظر اسکول پر ڈالی — واسیلی برساتی میں کھڑا تھا ۔ بعد کو وہ لوگوں سے اس کے متعلق بھی بیان کریگا جس طرح اس نے اس لڑکی کے متعلق جو رنج و غم سے مر گئی تھی اور ان لوگوں کے متعلق بیان کیا تھا جو افسروں کے قدموں پر گر کر گڑگڑائے تھے اور اپنے بچے کے منہ میں تکیہ ٹھونس دیا تھا ۔

پرانی عمارت، باغ اور برچ کے درخت، غرض سب کچھ بہت عزیز معلوم ہونے لگا تھا ۔

مجمع اب بھی اسکول کے پاس کھڑا تھا ۔ بچے غل مچاتے اور سیٹیاں بجاتے گاڑی کے پیچھے دوڑ رہے تھے اور جانی پہچانی جھونپڑیاں دونوں طرف گذرتی جا رہی تھیں ۔

''کیا تم ان لوگوں کے پاس یہاں واپس نہیں آؤگی جن کو تمہاری ضرورت ہے؟''

اور ایک آواز نے کہا :

''نہیں... وہ زندہ رہنا چاہتی ہے!''

کسی نے پیچھے سے ان کو زور سے پکارا ۔ گاڑی رک گئی ۔ پادری کی بیوی دوڑتی ہوئی آئی ۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا ۔ گالینا گاڑی سے اتر پڑی ۔ مجمع بھی وہاں آ گیا ۔

''میرا خیال تھا کہ میں تم سے نہ مل سکونگی'' پادری کی بیوی نے ذرا ہانپتے ہوئے کہا ۔ ''میں نے سنا کہ کل تم ہم سے گھر پر ملنے گئی تھیں لیکن ہم لوگ موجود نہ تھے — پادری دمیتری اور میں باغ چلے گئے تھے ۔ وہ ابھی باغ ہی میں ہیں ۔ انھوں نے تم کو سلام کہا ہے ۔''

''ان کو کافی دیر ہو گئی تھی'' کسی ہمدرد آواز نے مجمع میں سے کہا ۔

''خدا اور مقدس ماں تم پر رحمت کرے ۔''

پادری کی بیوی نے گالینا پر جو خاموش کھڑی تھی کئی مرتبہ صلیب کے نشان بنائے اور پھر اس کو زور سے لپٹا لیا ۔

''تم میری ماں کے برابر ہو'' گالینا نے اس کو لپٹاتے اور اپنے آنسو روکتے ہوئے کہا جو اس کی آنکھوں میں پھر امنڈ رہے تھے ۔

''یہ کیا ہے؟''

''ٹھیک ہے۔ تمھیں اس کی ضرورت ہوگی۔ سفر میں پورا دن لگ جائیگا،، اس نے گالینا کو اپنی جگہ پر بٹھا دیا اور اس کو ایک کاغذ کا تھیلا دے دیا۔

وہ پھر روانہ ہوئے۔ گاؤں سے مڑ کر کھیتوں میں جاتے ہوئے اس کو سڑک کے سرے پر اسکول دھملا سا دکھائی دیا، عورتیں گود میں بچے لئے ابھی تک کھڑی تھیں اور پادری کی بیوی سفید رومال ہلا رہی تھی جو مشکل سے نظر آ رہا تھا۔

پھر وہ ایک نشیب میں اتر گئے جہاں دلدلوں میں گھاس کے درمیان جابجا پانی چمک رہا تھا۔ وہ یہاں سے اوپروالی ڈھال پر جا رہے تھے کہ پادری دمیتری ایک کھلی بگھی میں دکھائی دیا۔ وہ چوراہے پر رک کر اترا۔ ایپات نے بھی گاڑی روکی اور طوعاً و کرھاً جھک کر اپنی ٹوپی اتار لی۔

''یہ میری خوش‌قسمتی ہے،، پادری نے کہا۔ ''میں گھر پر کچھ بھول آیا تھا اس کے لئے واپس جا رہا ہوں۔،،

اس نے صاف آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے ایسے لہجے میں باتیں کرنا شروع کیں جو اس دوآوازے کی طرح نہ تھا جس کی گالینا عادی تھی۔ اس کی آواز کافی مدھم تھی۔

''تم جا رہی ہو؟! ہو نہ ہو۔ ہم یہاں اکیلے رہ جائیں گے، اکیلے...،،

وہ اب گانےوالا یا مذہبی اسکول کا طالب علم نہ تھا، صرف گاؤں کا پادری تھا۔ اس وقت اس کا قد بھی چھوٹا معلوم ہو رہا تھا۔

''ہاں، ہم بالکل اکیلے ہو جائیں گے۔،،

اس نے اپنے بڑے بڑے ہاتھوں کے درمیان اس کا چھوٹا ہاتھ زور سے دبایا۔

''اچھا، خدا تم کو... خوشی عطا فرمائے۔ واقعی... تم کو...،، اس نے گالینا کا ہاتھ اپنے ہونٹوں تک اٹھا کر چوم لیا۔

گالینا شرم سے سرخ ہو گئی۔ ایپات اپنے کوڑے سے جوتے کی گرد جھاڑنے لگا۔

پادری دمیتری اپنی بگھی میں بیٹھ گیا، مڑ کر اسے دیکھا اور پھر گاؤں کی طرف چل دیا۔

ایپات نے بھی گاڑی ہانک دی لیکن برابر مڑمڑ کر پیچھے دیکھتا

رہا پھر وہ اپنے پورے قد سے کوچ بکس میں کھڑا ہو کر پیچھے دیکھنے لگا اور ہنس کر بیٹھ گیا۔

"چڑھائی کے اس پار پادری باغ کی طرف مڑ گیا۔ وہ صرف یہ بہانہ کر رہا تھا کہ وہ گاؤں جا رہا ہے۔ وہ آپ سے جھینپ رہا تھا۔ اب وہ باغ کی طرف جا رہا ہے۔ چل دے، جنور!..."

"وہ اپنی بیوی سے ڈرتا ہے، بےحد"، اس نے گالینا کی طرف گھومتے ہوئے زور سے ہنس کر کہا۔

بےتکا، لمبے پیروں والا گھوڑا بموں کے درمیان ایک طرف دب کر چل رہا تھا اور حلقے کے اندر سے گھوم کر ایپات کو دیکھتا جاتا تھا۔ ایپات نے ہرطرح کی چال چلی۔ اس کو کوڑے سے موڑنے کی کوشش کی۔ لیکن اس نے کوڑے سے اس کو ایک طرف یا دوسری طرف گھمانے کی جتنی بھی کوشش کی سب بیکار ہوئی۔ گھوڑا حلقے کے اندر سے مڑ کر اس کو اپنی بڑی بڑی سیاہ اور ضدی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ وہ دم زور سے مارتا اور کوڑے کی ضرب کی توقع کرتے ہوئے رک جاتا، پھر وہ دم مار کر یک‌رخا چلنے لگتا۔ ایپات چاہے جتنا لگامیں گھسیٹتا لیکن وہ مڑ کر اس کو برابر دیکھتا رہتا جس سے ایپات کو سخت غصہ آ جاتا اور جب تب وہ جانور کو بری طرح پیٹ دیتا پھر بھی وہ برابر مڑ کر مالک کو دیکھتا رہتا اور انتظار کرتا کہ اس کے غصے کا دورہ کم ہو جائے۔

گالینا نے رومال نکال کر اپنے ہونٹ صاف کئے اور ان کو زور زور سے ملا — اس کو یاد آ گیا کہ اس نے فینیا کو چوما تھا جس کا چہرہ زرد تھا اور اس کے خاندان میں آتشک کا مرض تھا۔ اس نے دوسری عورتوں کو بھی چوما تھا — پھر اس نے اپنے ہونٹ اور گال رومال سے صاف کئے۔

مچھروں کی ہلکی ہلکی بھن‌بھناہٹ نیلے جنگل میں یا کہیں اور پیچھے سنائی دے رہی تھی جو ذرا دیر تک رہی پھر غائب ہو گئی۔ کبھی کبھی پہئے کھڑکھڑاتے اور سڑک پر جڑوں سے ٹکرا کر اچھل پڑتے۔

چاروں طرف نئی جھاڑیوں کے ہرے بھرے قطعات تھے جہاں درخت کاٹ کر گرا دئے گئے تھے، دور جنگل کی اچھوتی دیوار دکھائی دے رہی تھی۔

''فینیا کی ماں نے بھی مجھے راستے کے لئے کیک دئے تھے۔ وہ کہاں ہیں۔ اب تو ان کو دوسرے کیکوں میں شناخت نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے تو تمام پھنسیاں ہیں اور اس کے پپوٹے بھی پکے ہوئے تھے...''

سڑک کے دونوں طرف بلیوبل کے پھول اپنے سر ہلا رہے تھے اور اپنی گھنٹیاں مدھم، پراسرار انداز میں بجا رہے تھے۔

''اور دوسرے بھی... کوئی کیا کہہ سکتا ہے کہ کون بیمار ہے اور کون نہیں ہے؟ کبھی کبھی تو ان کو خود بھی نہیں معلوم ہوتا...''

ایک نوعمر درخت پر جو کسی نہ کسی طرح بچ گیا تھا ایک چڑیا بڑی خوشی سے چہک رہی تھی۔

لڑکی نے پہلا بنڈل احتیاط کے ساتھ اوپر سے اٹھایا تاکہ ایپات نہ دیکھ سکے اور اس کے کیک اور سموسے سڑک پر انڈیل دئے۔ یکےبعددیگرے اس نے سب سے پیچھا چھڑایا اور صرف وہ بنڈل رہنے دیا جو پادری کی بیوی لائی تھی۔

پھر ایک دھیمی جھنکار ہوا کے ساتھ آئی، ذرا دیر رہی اور غائب ہو گئی اور یہ بات صاف ہوگئی کہ یہ بلیوبل کے پھولوں کی جھنکار نہ تھی۔

''ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں ان کو بھلانا چاہتی ہوں۔ وہ میرے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔ یہ بری بات ہے۔ میرے خیال کے مطابق کوئی بات نہیں ہوئی... میں ایپات کے ساتھ چلی جا رہی ہوں اور مجھے اس سے ذرا بھی ڈر نہیں لگ رہا ہے... بےچارہ پادری... اور اس کی بیوی، بےچاری۔ وہ اچھی عورت ہے لیکن ہر شخص بھانپ سکتا ہے کہ وہ پادری کی بیوی ہے... ان سب کو چھوڑ کر جانا کس قدر افسوسناک ہے۔ کوئی بھی ان کو نہیں سمجھتا اور میں بھی ان کو نہیں سمجھتی۔ ارے، اگر میں لکھنےوالی ہوتی... لیکن یہ ایسی باتیں ہیں جو لکھی نہیں جا سکتیں، کہانی کی طرح سنائی نہیں جاسکتی ہیں۔ آدمی کو یہاں رہنا پڑیگا... ارے کتنی گھنٹیاں بج رہی ہیں!.. کوئی آ رہا ہے!..''

اب یہ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ گاڑی کے حلقے سے بندھی ہوئی پیتل کی گھنٹی بج رہی تھی۔ کبھی تو آواز بالکل نزدیک آجاتی اور کبھی وہ دور نیلگوں فضا میں جا کر صبح کی تازگی سے گھل مل جاتی۔

''کوئی جوڑی میں آ رہا ہے،، ایپات نے مڑے بغیر کہا ۔
آوازیں جنگل میں پہنچکر مدھم لیکن زیادہ خوشگوار ہوگئیں ۔ جنگل کے اوپر سورج کافی بلند ہو چکا تھا اور شاخوں اور گھاس پر سنہرے دھبوں کی بارش کر رہا تھا ۔
''اے، میری بلبل... میری جان... اے، اے، ننھی چڑیا...،،
ایپات نے گھوڑے کو پیٹنا بند کر دیا تھا اور اب اس کی خوشامد کر رہا تھا اور کبھی کبھی اپنا کوڑا بھی سڑکا دیتا تھا ۔ لیکن اس سے بھی لمبے پیروں والا گھوڑا رام نہ ہوا ۔ اب بھی یک رخا بلکہ بموں کے درمیان تقریباً ترچھا چلتا رہا اور ایپات کو ٹکٹکی لگائے اپنی بڑی سیاہ آنکھوں سے گھورتا رہا ۔
''ارے... میرے گلاب جامن...،،
گالینا اپنی سوکھی گھاس کی نشست پر یکساں جھول رہی تھی ۔ اس کے چہرے پر برابر نیلے سائے اور دھوپ کے سنہرے دھبے گذر رہے تھے ۔ نیند سے بےقابو ہوکر اس نے آنکھیں بند کر لیں ۔
جنگل رفتہ رفتہ گھنٹیوں کی جھنکار اور بنفشے کے پھولوں کی خوشبو سے بھرتا گیا ۔ سڑک کے دونوں طرف لال تنےوالے صنوبر کے درخت چلے گئے تھے ۔
چڑیوں کی آوازیں بالکل آدمیوں کی طرح معلوم ہوتی تھیں ۔ ہمہ وقت ایک ہی طرح کی... یہاں ۔ یہاں ۔ یہاں ... وہ یہاں ہے .... ایک اور آواز برابر دھرائی جا رہی تھی: چہ... چہ... چہ... چہ چہ... دوسری آوازیں اپنی من مانی تانیں اڑا رہی تھیں لیکن لے ہمیشہ ایک ہی ہوتی تھی ۔ غالباً وہ گیت کا آخری حصہ بھول گئی تھیں اور گیت کو باربار شروع سے دھرا رہی تھیں ۔
گالینا نے محسوس کیا کہ اس کا سر جھوم جھوم کر سینے پر آ رہتا ہے ۔
''یہ بری بات ہے، بہت ہی خراب...،، لیکن وہ ضدی نیند کو نہ بھگا سکی ۔
''ہا ۔ ہا ۔ ہا! وہ یہاں ہے، وہ یہاں ہے!،، ایک خوفناک آواز نے چیخ کر کہا اور جو ہنگامہ جنگل میں برابر تھا یکایک اس کے سر پر ٹوٹ پڑا ۔
اس کا دل بےقابو ہوکر خوف سے دھڑکنے لگا اور وہ اچھل پڑی ۔

ایپات گاڑی کے پاس کھڑا دانت نکال رہا تھا۔ گھوڑا اب پیچھے نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ خاموش کھڑا تھا۔ اس کی کھال پر جھرجھری کے آثار تھے اور کان گرے ہوئے تھے۔

''میرے خدا، میں اس کے ساتھ یہاں تنہا ہوں۔'' گالینا نے سوچا۔

''تم کیا... چاہتے... ہو، ایپات؟'' اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ اس کے پیچھے اور سر پر گھنٹیاں کان پھوڑے دے رہی تھیں۔

اس نے پیچھے دیکھا۔ گاڑی کے ڈنڈے کے اوپر سے ایک جتے ہوئے گھوڑے کا سر حلقے میں نظر آرہا تھا اور اس کے برابر دوسرا گھوڑا اپنے پھیلے ہوئے اگلے پیر سے تھوتھن رگڑ رہا تھا۔ دونوں ہانپ رہے تھے اور ان کے نتھنے جلدی جلدی پھول رہے تھے۔

ڈاکٹر اس کی گاڑی کی طرف آرہا تھا۔

''صبح بخیر۔ مجھے ڈر تھا کہ میں آپ تک نہیں پہنچ پاؤنگا...''

گالینا نے جلدی سے اپنی اسکرٹ اور اپنے بال ٹھیک کئے اور نیند دور کرنے کے لئے اپنے منہ پر ہاتھ پھیرا۔

''نوجوان خاتون گاڑی میں جھول کر سو گئیں'' ایپات نے بتیسی نکال کر کہا۔

''اتر آئیے، ہم لوگ تھوڑا سا پیدل چلیں گے'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''بہر حال، گھوڑے یہاں تیز نہیں چل سکتے۔'' اور وہ اس طرح بڑھا جیسے اترنے میں اس کی مدد کرنا چاہتا ہو۔

گالینا نے ڈاکٹر کو مدد کرنے کا موقع نہیں دیا اور تیزی کے ساتھ گاڑی سے کود پڑی۔

کوچبان ڈاکٹر کی گاڑی کے اندر کچھ ٹٹول رہا تھا، وہ اپنی گود میں سموسے اور کیک بھرے ہوئے آیا۔

''معلوم ہوتا ہے بڑے ہچکولے لگے، یہ سب سڑک پر پڑے ہوئے تھے۔''

''ارے، یہ تو ہمارے ہیں، ہمارے'' ایپات ناراض ہو کر چلایا۔ ''پورے گاؤں نے نوجوان خاتون کے لئے ناشتہ تیار کیا تھا۔ یہ گاڑی کے سوراخ میں سے گر پڑے ہونگے۔ صرف پادری کی بیوی کا لایا ہوا بنڈل یہاں رہ گیا ہے... یہ مجھ کو دو۔''

گالینا سرخ انگارہ ہو گئی۔

''یہ کیسے ہوا... نہیں، ایپات، اب مجھ کو ان کی ضرورت نہیں، یہ سب مٹی میں بھر گئے ہیں... نہیں... ست...،،

''کوئی بات نہیں، میں مٹی جھاڑ دوں گا۔ ،،

ایپات نے بڑے انہماک سے سموسوں اور کیکوں کی گرد پھونکنا شروع کی اور گاڑی میں ڈھیر لگانے لگا۔ ان سموسوں اور کیکوں سے ایپات کے تھوک کے ساتھ ڈھیروں گرد اڑنے لگی۔

''میں کہہ رہی ہوں، مجھے یہ نہ چاہئیں،، گالینا نے کہا۔

''صرف وہ جھاڑ دو جو لپٹے ہوئے ہیں،، ڈاکٹر نے کہا۔ ''باقی بہت گندے ہو چکے ہیں۔ ،،

''نہیں، کسی کی بھی فکر نہ کرو۔ ،،

''اچھا تو پھر مجھ کو دے دو۔ میں نے ان کو پایا تھا۔ ڈاکٹر نے مجھ کو برا بھلا بھی کہا کیونکہ میں باربار ان کو اٹھانے کے لئے رکتا تھا۔ ،،

''ہونہہ، ان کو دے دو ... بس میٹھی چیز دیکھتے ہی تمہارے منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ ہم لائے تھے اور کھاؤگے تم۔ ،،

''جھگڑا نہ کرو، آپس میں بانٹ لو۔ آؤ، گالینا الیکساندروونا۔ ،،

وہ درختوں کے درمیان سڑک کے کنارے چلنے لگے۔ ان کے پیچھے ایپات کی گاڑی سڑک پر پھیلی ہوئی جڑوں کے اوپر سے گذرتی اور چرچراتی ہوئی آہستہ آہستہ چل رہی تھی، اس کے پیچھے ڈاکٹر کی گاڑی اور گھوڑوں کی جوڑی بھی اس طرح سست رفتاری سے چل رہی تھی۔ ساز کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔

ایپات اور کوچوان پیچھے پیچھے آ رہے تھے اور ان کے قدموں سے جنگل کی سہکتی دھول کا بادل اٹھ رہا تھا۔ وہ سموسے کھا رہے تھے اور باتیں کرتے جا رہے تھے۔

جھاڑیوں کی پتیوں پر رنگا رنگ شبنم کے قطرے چمک رہے تھے۔ ایک سمولہ اپنی دم اچھالتا ان کے آگے آگے اڑ رہا تھا۔

''مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ آپ جا رہی ہیں۔ تین ہفتے سے آپ سے ملاقات ہی نہیں ہوئی،، ڈاکٹر نے کہا، اپنی گرد آلود ٹوپی اتاری اور اب وہ بالکل مختلف معلوم ہونے لگا۔ اس کی سفید اور صاف‌وشفاف پیشانی نے جس پر ایک سیاہ لٹ لٹکی ہوئی تھی اس کے سنگولیائی چہرے کو نرم بنا دیا تھا۔ ''جب مجھے معلوم ہوا تو میں نے سب کچھ

چھوڑ دیا، مریضوں کے یہاں جانا، اسپتال اور ہر چیز — گھوڑے لئے اور آپ کے پیچھے بھاگا۔''

اس کے اتنا کہتے ہی گالینا نے محسوس کیا کہ اس نے سب کچھ کہہ دیا ہے۔

''شاید، جب میں سو رہی تھی... میرا منہ کھلا تھا...''، گالینا نے سوچا۔

جب وہ اس بات کے امکانات پر غور کر رہی تھی تو اس نے اپنے ذہن میں دور جاتی ہوئی ایک کھلی گاڑی کا نقشہ کھینچا، اس میں ایک عورت تھی جس کے چہرے پر نقاب تھا۔ گاڑی کے پہئے آہستہ بڑی اداسی سے بھاری، سیاہ کیچڑ کو متھ رہے تھے۔

''کاشکہ یہ نہ ہوتا جو اب ہو رہا ہے...''، اس نے پریشانی کے عالم میں سوچا۔

وہ سر جھکائے اور ہونٹ زور سے بھینچے اپنے سیاہ جوتوں کو دیکھتی چلی جا رہی تھی جو باری باری اس کے لباس کے نیچے سے دکھائی دیتے تھے اور جنگل کی گھاس کے لمبے ڈنٹھلوں کو دبا دیتے تھے۔

ممولہ اب بھی ان کے آگے آگے اپنی دم اچھالتا اور ان کو آگے چلنے کی ترغیب دیتا ہوا اڑ رہا تھا — جنگل میں آگے کوئی چشمہ ضرور ہوگا۔

''کتنی خوبصورت صبح ہے!''، ڈاکٹر نے اپنی ٹوپی ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اور شہد کی مکھیاں!..''

شہد کی مکھیاں چاروں طرف جمع ہوکر بھن‌بھنا رہی تھیں، جن ٹکڑوں میں دھوپ تھی وہاں پہنچکر وہ سنہری ہو جاتی تھیں۔

''بہت ہی خوبصورت! جانتے ہیں جب میں اس گاؤں میں رہنے لگی تو پہلی مرتبہ میں نے یہ سب چیزیں دیکھیں۔ میں جانتی ہوں یہ تمام چیزیں شہروں میں بھی ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ میں دیہاتی بنگلوں میں بھی رہی ہوں اور گرمیوں میں جاگیرداروں کی ریاستوں میں بھی گئی ہوں...''

''کس لئے؟''

''پڑھانے کے لئے... یہ سب چیزیں وہاں بھی تھیں اور میں نے دیکھی تھیں — گاؤں، کھیت اور جنگل... لیکن یہاں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے زندگی میں میں نے پہلی مرتبہ...''

''یہ سچ ہے۔ اور یہ بات صرف مناظر فطرت کے لئے ہی نہیں بلکہ کسانوں کے لئے بھی کہی جا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر اس خادم کو لے لیجئے۔ ڈاکٹر کی حیثیت سے یہاں آنے سے پہلے میرے ذہن میں ہر چیز الٹی پلٹی تھی — گاؤں اور کسان سب۔''

''ہمارے خیالات میں مطابقت ہے...'' گالینا نے افسوس کے ساتھ سوچا۔

اس نے چپکے سے آہ سرد بھری لیکن اس سے اس کو سکون سا ہوا جیسے اس کو انتظار کی زحمت سے چھٹکارا مل گیا ہو۔

''میں یہاں اس طرح آئی جیسے جیل جا رہی ہوں، جلاوطن کی جا رہی ہوں اور اب یہاں سے جانا بہت تکلیف‌دہ اور مشکل معلوم ہو رہا ہے — کوئی ایسی چیز ہے جو مجھ کو گاؤں اور کسان مردوں اور عورتوں کی طرف کھینچتی ہے۔''

''میں آپ کو بتاؤں۔ پرانے زمانہ میں نرودنیکی* گاؤں میں کسانوں کے پاس جاتے تھے اور اپنے نظریات و مقاصد پیش کرتے تھے۔ آپ جانتی ہیں، یہ لوگ ابتدائی زمانے کے عیسائیوں کی طرح دیندار ہوتے تھے — وہ شہر میں آسانی سے اچھی نوکریاں پا سکتے تھے لیکن خوشی سے بھوک اور غربت کی زندگی برداشت کرتے تھے۔ مختصر الفاظ میں وہ سادھو ہوتے تھے اور نایاب تخم کی طرح سیاہ مٹی میں مل جاتے تھے۔ بہر حال، ہم اور آپ یہاں پیسے کمانے آئے ہیں، محض اپنی اجرت کے لئے، لیکن فرق یہ ہے کہ ہم تنہا نہیں ہیں، ہم اجتماع کے ساتھ مضبوط جتھوں میں آتے ہیں اور سیاہ زمین کو کھودتے گوڑتے ہیں۔ اپنا کام کم و بیش ایمانداری سے کرتے ہیں اور اگر ہمارے عقل ہوتی ہے تو ہم کسان کو ہل کے پھل کی طرح زمین سے اوپر کھینچ لیتے ہیں۔ انفرادی طور پر ہم ویسے ہی بیکار ہیں جیسے تنہا سپاہی لیکن اجتماعی طور پر ہم ہر رکاوٹ ختم کر سکتے ہیں بشرطیکہ ہم متحد رہیں۔''

جنگل ہرا بھرا، پرسکون اور سنسان سا تھا اور اس کی تنہائی کے لئے ایک مکمل پس‌منظر فراہم کرتا تھا۔ ان کے پیچھے ساز کی گھنٹیوں کی جھنکار اور کوچوانوں کی باتوں کی دھیمی آواز آ رہی تھی۔

---

* نرودنیکی — پچھلی صدی کے چھٹے اور ساتویں عشرے کے پڑھے لکھے انقلابی خیالات کے لوگ جو ''عوام کے پاس جا کر'' کسانوں کو زارشاہی کے خلاف بغاوت کے لئے اکساتے تھے۔

''آپ نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ 'کسان، کی طرح کی کوئی چیز نہیں ہوتی ہے - صرف جمع کے صیغے میں کسان ہوتے ہیں - ''

''ہاں، ہاں - جب تک اس کے گلے میں پھندا پڑا ہے وہ 'کسان، ہے لیکن ایک مرتبہ دلدل سے نکلنے کے بعد وہ نیکیفور لوکیچ ہو جاتا ہے - ان سب کا یہی حال ہے، ان میں سے ہر ایک میں نیکیفور لوکیچ چھپا بیٹھا ہے - لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں ہوتا - وہ سب اس دلدل سے نہیں نکل سکتے، صرف چند فرد نکل بھاگتے ہیں - اسی لئے تمام کسانوں میں یکسانیت سی ہوتی ہے - ''

''انھوں نے افسروں کے خلاف میرے اوپر ایک منتر پڑھوایا،، گالینا نے ہنستے ہوئے کہا اور اسے یاد آیا کہ کیسے رات کو کسی نے اس سے یہ سوالات کئے تھے :

''کیا میں ڈاکٹر سے محبت کرتی ہوں؟..''

وہ چلتے گئے، کبھی کبھی ایک دوسرے سے ٹکرا بھی جاتے - وہ اپنے درمیان قربت بھی محسوس کرتے اور فاصلہ بھی جیسے وہ ایک دوسرے سے ابھی ملے ہوں - اس دوران میں وہ گاؤں، موسیقی (ڈاکٹر وائلن اچھا بجاتا تھا) اور ادب وغیرہ کے متعلق باتیں کرتے رہے جیسے وہاں جنگل نہیں تھا، شہد کی مکھیاں نہیں بھن بھنا رہی تھیں، جیسے کوچوانوں کی گپوں اور ساز کی گھنٹیوں کی وقتاً فوقتاً جھنکار کا کوئی وجود نہ تھا، جیسے وہ کسی زندہ‌دل اور خوش لباس مجمع کے درمیان کسی تھیٹر میں چہل قدمی کر رہے تھے -

لال صنوبر کے درخت، شاہ بلوط اور ہیزل کی جھاڑیاں سب پیچھے رہ گئیں کیونکہ سڑک درختوں سے گھری ہوئی ایک نشیبی جگہ میں پہنچ گئی تھی جہاں درختوں کی سیاہ چوٹیاں ان کے نیچے معلوم ہوتی تھیں - اس نشیبی جگہ کے دوروالے سرے پر سڑک کا ایک ایسا پیچدار موڑ تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ سڑک جنگل کی ایک ٹھوس دیوار تک جا کر ختم ہوگئی ہے - ڈاکٹر اور گالینا خاموشی سے اس نشیبی جگہ کے ٹیلے پر کھڑے ہو گئے جیسے وہ کسی مقررہ سرحد پر پہنچ گئے ہوں -

''تو یہ حد ہے... اور پھر؟ اور پھر میں ایپات کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھونگی- پھر اسٹیشن آئیگا، پھر ٹرین اور شہر - پھر... پھر؟،، گالینا سوچنے لگی-

ڈاکٹر کچھ کہنے جا رہا تھا لیکن کچھ سوچ کر خاموش رہا اور دونوں جنگل کے سناٹے میں سننے لگے۔ ایک ھدھد کے لکڑی کریدنے کی آواز، پہیوں کی چرچراھٹ اور چڑھتے ہوئے دن میں رال کی مہک، نیچے جھاڑیوں اور گھاس میں پانی چمک رہا تھا۔

"گالینا الکساندرونا... یہاں ہم... ہاں... تو... ہمیں ایک دوسرے سے رخصت ہونا چاہئے... میں چاہتا ہوں ... صرف ایک لفظ... میں کہنا چاہتا ہوں..."

ڈاکٹر کو اپنے اوپر غصہ تھا، اس نے تیوریاں چڑھا لیں۔

"میں آپ سے محبت کرتا ہوں۔"

حالانکہ یہ بات صاف تھی کہ اس کو یہی کہنا چاہئے تھا لیکن وہ اس خیال کی فوری جدت پر متحیر رہ گئی اور اس کے دل میں ایک کسک سی ہوئی۔ اسے محسوس ہوا جیسے دل کی دھڑکن ذرا دیر کے لئے دھک سے بند ہو گئی۔ اس نے اپنی آنکھیں نہیں اٹھائیں، اس نے دل کی گہرائیوں کے اندر اس خوف اور حیرت کے گڈمڈ اور ملے جلے جذبات کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی جن میں خوشی کا جذبہ بھی شامل تھا لیکن وہ اس کا اعتراف کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔

اس نے سختی سے اپنی بھویں چڑھا لیں اور ان کے درمیان شکنیں پڑ گئیں۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا... آپ کیسے..." اس نے بات شروع کی۔

ان کے پیچھے گاڑی رک گئی تھی اور ساز کی گھنٹیوں کی جھنکار اور پہیوں کی کمانیوں کی کھڑکھڑاھٹ بند ہو گئی تھی۔ گالینا اور ڈاکٹر دونوں نشیبی قطعے کی خنکی میں ڈھال کی طرف چل رہے تھے جہاں لٹھوں کا پل تھا، پانی دونوں طرف چمک رہا تھا۔

ڈاکٹر نے اس کی طرف نہیں دیکھا لیکن پرسکون اور اداس لہجے میں کہا:

"میرے بیوی بچے نہیں ہیں۔"

وہ اپنے اوپر قابو پانے کے لئے رک گیا۔ وہاں سڑی ہوئی پتیوں کی بو آرہی تھی اور کوئی کیڑا بھن بھنا رہا تھا۔ بھن... بھن... بھن...

"میری بیوی آپ سے مل کر آئی — مجھے پتہ نہ تھا کہ وہ آپ کے پاس گئی ہے۔ اور کہنے لگی: 'نکانور، میں جانتی ہوں کہ اب تم

مجھ سے محبت نہیں کرتے۔ بہت دنوں سے یہ جانتی ہوں۔ ، اور میں نے اس سے کہا : 'تم کیسی باتیں کرتی ہو۔ میں نے کبھی اپنے کسی قول‌وفعل سے تمھیں شکایت کا موقع دیا ہے؟ تم مجھے پہلے کی طرح اب بھی پیاری ہو۔ ہمارے ایک بچہ بھی ہے'۔ لیکن اس نے اصرار کیا : 'نہیں، نہیں، نہیں... میں یہ ظاھری بناوٹ نہیں چاہتی، میں چاھتی ہوں کہ تم مجھ سے پہلے کی طرح محبت کرو اور تم نہیں کر سکتے، مجھے تمھاری ضرورت نہیں ہے۔ ، وہ زرد پڑ گئی تھی اور میں نے اس سے کہا : 'موسیا، رکو۔ ، لیکن وہ چلی گئی۔ اس کا چہرہ سخت اور سرد تھا۔ اس نے میری طرف اس طرح دیکھا جیسے میں کوئی اجنبی ہوں اور کہنے لگی: 'مجھے انصاف اور توازن کی ضرورت ہے، میں نے تم کو ہر چیز دے دی، ہر چیز — اپنی دوشیزگی، اپنی جوانی، اپنا تن‌من، اپنی پوری زندگی، اپنا دماغ — میرے پاس کچھ بھی نہیں رہ گیا، ایک ایک قطرہ نچوڑ گیا۔ تمھاری زندگی از سر نو ہوگی، تم خوش ہوگے لیکن میرے لئے اب کوئی خوشی کی صورت نہیں، سب کچھ ختم ہوگیا۔ میں مرجھا کر بوڑھی ہو جاؤنگی۔ اچھا تو میں اپنے بیٹے کے ساتھ جارھی ہوں اور اب تم مجھے کبھی نہ دیکھوگے۔ یہ مت خیال کرنا کہ یہ بدلہ یا حسد ہے یا میں تم کو تکلیف پہنچانا چاھتی ہوں۔ نہیں، میں صرف زندگی کا توازن قائم رکھنے کے لئے یہ کر رھی ہوں۔ ورنہ زندگی عذاب ہو جائےگی...، اور پھر وہ چلی گئی۔ ''

ڈاکٹر یہاں پہنچ کر چپ ہوگیا اور اپنے پیروں کی طرف دیکھتا ڈھال پر چڑھتا رھا۔ ان کے اوپر جنگل ان کا راستہ روکے کھڑا تھا۔

''میں جانتا ہوں کہ وہ آھنی ارادے کی عورت ہے اور میں اب اپنے بچے کو کبھی نہ دیکھ سکونگا۔ اگر وہ کسی دوسرے کردار کی عورت ہوتی تو ہم بھی اسی طرح گذر بسر کرتے رہتے جس طرح آجکل ھزاروں انسان کرتے ھیں۔ میں نے اس کی پرمسرت زندگی تباہ کرنےوالی کوئی بات نہیں کی۔ اب میں اپنے بچے کو کبھی نہ دیکھونگا۔ شاید یہ رنج کی مساوی تقسیم ہے۔ میں کیا کروں؟ اس کو ڈھونڈھوں، جد و جہد کروں اور بچہ اس سے لے لوں؟ نہیں میں ایسا نہ کرونگا۔ میں نے اس کی مسرت اور زندگی ختم کر دی۔ مگر میں موردالزام نہیں

ہوں، آپ کا کیا خیال ہے؟ یہ سچ ہے لیکن اس کو بھی الزام نہیں دیا جا سکتا۔ کون ملزم ہے؟،،

''چچا ف... فی... فیدو... ل... کے ایک ب... بطخ تھی...،،

گالینا اپنا سر جھکائے چلتی رہی۔ وہ اب بھی اپنے سیاہ جوتے دیکھ رہی تھی جو اس کے لباس کے نیچے سے باری باری نکل کر سامنے آجا رہے تھے۔ اس کے چاروں طرف کا جنگل کچلی ہوئی گھاس کی بھینی بھینی سہک سے بھرا ہوا تھا، ھدھد لکڑی پر کھٹ کھٹ چونچ مار رہا تھا اور جنگلی گیتوں کی رانی اوریول کے نغمے گونج رہے تھے لیکن گالینا کی بے تعلق اور خاموش زندگی کی ناقابل گذر دیوار نے چاروں طرف کی ہر چیز اس سے الگ کر دی تھی، اب ہر چیز دورافتادہ معلوم ہوتی تھی۔

''ج... جن... جنگلی ب... بط... بطح...،،

وہ ڈاکٹر سے کہنا چاہتی تھی:

''تم نے اس سے بھی یہی کہا تھا کہ تم اس سے محبت کرتے ہو۔ تم اسی طرح پریشان بھی تھے۔ تم کو مسرت حاصل ہوئی۔ پھر تمھارے بیٹا ہوا پھر... تمھارے خیالات میں مطابقت پیدا ہونے لگی... لیکن ہمارے خیالات میں بھی مطابقت ہے...،،

لیکن اس کے بجائے اس نے کہا:

''کوئی زندگی کو نہیں کچل سکتا، دوسروں کی خوشی کو نہیں کچل سکتا۔ ،،

ڈاکٹر کی تیوری چڑھ گئی۔

''آپ یہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ یہ سب گذری ہوئی باتیں ہیں۔ یہ اسی طرح ہے، جیسے کوئی مر گیا ہو اور ہر شخص اس کی جگہ پر کرنے سے ڈر رہا ہو۔ ،،

وہ رکی اور اس نے بلا آنکھ اٹھائے کہا:

''خدا حافظ!،،

وہ آگے بڑھ گئی لیکن وہ خاموش کھڑا رہا۔ ساز کی گھنٹیاں اب بھی خاموش تھیں اور صرف ایک گاڑی کی چرچراہٹ سنائی دے رہی تھی۔

اس کے سامنے جنگل ایک ناقابل گذر دیوار کی طرح کھڑا تھا۔ سڑک اس نشیبی جگہ سے اوپر جا کر بائیں کو اس دیوار کے اطراف میں

اچانک مڑ گئی تھی۔ ھیزل کی جھاڑیوں نے نشیبی جگہ اور لٹھوں کے پل کو چھپانا شروع کر دیا اور دوسری طرف کا جنگل بیگانہ اور ویران معلوم ھونے لگا۔

اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا، ڈاکٹر اب بھی سڑک پر ٹوپی اتارے کھڑا تھا اس کے پیچھے اس کے گھوڑوں کی جوڑی پٹے پہنے آگے جھکی ھوئی تھی تاکہ گاڑی سنبھلی رھے۔ لمبی ٹانگوں والا گھوڑا ایک طرف ھوکر گاڑی کو کسی کھانچے سے نکالنا چاھتا تھا۔ ایپات گاڑی کے برابر اپنا کوڑا گھماتا اور سموسے کھاتا چل رھا تھا۔ اس نے ان سب چیزوں پر آخری نگاہ ڈالی۔

جنگل الفاظ سے بھر گیا، آنسوؤں اور رنج سے یا ممکن ھے مسرت سے بوجھل الفاظ سے:

''یہ اس کے ساتھ پیش آیا، اس عورت کے ساتھ... عام طور پر یہ سب کے ساتھ ھوتا ھے۔ لیکن میرے حالات ھی دوسرے ھیں، بالکل مختلف...''

اس نے مشکل سے اپنے خشک ھونٹوں کو جنبش دی اور کہا:

''نکانور سرگئی‌وچ، مہربانی کرکے میرے ساتھ... اسٹیشن تک چلئے۔ میں جنگل میں تنہا ھوں...''

۱۹۱۷ء

برفانی موت

(۱)

بکھرے ہوئے بھورے بادل سہمی ہوئی چڑیوں کے منتشر جھنڈ کی طرح سمندر پر کافی نیچے ادھر ادھر پھیلے ہوئے تھے۔ تیز، طوفانی سمندری ہوائیں ان کو ایک جگہ گھنگھور گھٹاؤں میں جمع کرتیں، کبھی ان سے کھلواڑ کرکے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتیں، پھر ان کو طرح طرح کے روپ دے کر ادھر ادھر اڑا دیتیں۔

ہوا زیادہ طوفانی ہوتی گئی اور اس نے پانی کو متھ کر سفید جھاگ میں بدل دیا۔ سرمئی سمندر کی لہریں بپھر اٹھیں اور جھاگ کے حلقوں کو توڑکر ہلکے ہلکے کراہتی ہوئی دور تاریکی میں غائب ہوگئیں۔ ہوا منتشر لہروں پر غصے سے چنگھاڑتی ہوئی گذر رہی تھی اور دور دور تک نمکین پانی کے چھینٹے پھینک رہی تھی۔ سمندر کے بل کھاتے ہوئے ساحل پر ایک ٹیڑھی میڑھی بلند دیوار کھڑی تھی، یہ تھا برفپوش پہاڑوں کا ایک عظیم‌الشان سلسلہ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی خوفناک جنگ میں سورج دیوتا نے اس کو نیچے پھینک دیا ہے۔

پرانے، گھنے جنگل کا ایک ڈھلوان سلسلہ قریب کی بلندیوں سے سمندر کے کنارے تک چلا گیا تھا۔ ہوا صنوبر کے پرانے درختوں کے لال تنوں سے چنگھاڑتی گذر رہی تھی اور شاندار درختوں کی نوکیلی چوٹیاں جھکولے کھا کھا کر اپنی مرجھائی ہوئی شاخوں سے برف جھاڑ رہی تھیں۔ ان اداس، یکساں آوازوں کی ہم‌آہنگی سے کسی چھپے ہوئے خطرے کا غم آمیز اظہار ہوتا تھا اور بے‌جان فضا پر موت کی

سی اداسی طاری تھی۔ اس سنسان سر زمین پر ماضی نے کوئی نشان نہیں چھوڑا تھا اور پرانا جنگل اپنے گہرے رنگ کے درختوں کی چوٹیاں خاموشی اور متانت سے اس طرح ہلا رہا تھا جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہو۔ ابھی تک اس کا ایک درخت بھی لکڑی کے کسی لالچی تاجر کی کلہاڑی کا شکار نہیں ہوا تھا۔ جھاڑیوں کے گڈھوں میں دلدل اور کیچڑ بھرا تھا۔ جہاں جہاں صدیوں پرانے صنوبر کے درختوں کی جگہ جھاڑیوں نے لے لی تھی وہاں ٹنڈرا حد نگاہ تک پھیلا ہوا تھا۔ ایک ویران، بنجر اور لامتناہی خطہ جس میں سردی، تاریکی اور دھند طاری تھیں۔

سیکڑوں میل تک دھوئیں کا ایک مرغولہ یا آبادی نہیں دکھائی دیتی تھی اور انسان کا کہیں نام نشان تک نہ تھا۔ بس ہوا سے برف کے بگولے بنتے رہتے اور سفید صحرا پر ایک ویرانی اور تاریکی چھائی رہتی۔

سال میں ایک مرتبہ من‌چلا انسان اس جنگلی ساحل کی بے‌جان اور اداس فضا میں بھی خلل ڈالنے پہنچ جاتا۔ جب سخت ترین پالے کی وجہ سے دلدل اور ٹنڈرا میں قابل گذر راستے بن جاتے، جب آرکٹک میں برف کی چٹانوں کے ٹیڑھے‌میڑھے خطوط سمندر کے دھند سے نکل کر بے تحاشا آگے بڑھتے معلوم ہونے لگتے، اس وقت دریائے میزین کے کنارے سے اور ساحلی آبادیوں سے ایک انوکھا جلوس روانہ ہوتا، وہ ٹنڈرا اور پرانے جنگل کے دامنوں سے گذرتا۔ برف کی موٹی اور منجمد تہہ پر پھسلنے‌والے لوہے کے تختے کھڑکھڑاتے ہوئے چلتے، چوڑی چوڑی سینگوں‌والے چھوٹے رینڈیر تختوں پر رکھی ہوئی لمبی سیاہ کشتیوں میں جتے ہوئے ایک قطار میں منجمد برف پر بڑی احتیاط سے چلتے، ان کے برابر انسانوں کی بے‌ہنگم سفید شکلیں بھاری لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے چلتی نظر آتیں۔

ان بن‌بلائے مہمانوں پر جو اپنے خیمے جنگل کے کنارے دور تک لگا دیتے تھے پرانے درخت غصے سے سرخ ہوجاتے۔

(۲)

وہ آدمی جس کو لوگ سروکا (غوغائی چڑیا) کہتے تھے برف کے ایک تودے پر اپنا ماہی‌گیری کا خمدار برچھا لئے کھڑا دور گھور

رہا تھا۔ تقریباً افق کے پاس پہلے بہت ہی دھندلے پہاڑی ٹیلے دکھائی دیتے، پھر وہ برف کی چٹانوں کے بےڈھنگے خطوط اختیار کر لیتے۔ سروکا بالکل بےحس‌وحرکت کھڑا تھا جیسے وہ کسی چیز کے سخت انتظار میں محو ہو۔ اچھے شکار کی ہر علامت موجود تھی۔ ایک چڑیا ہوا کے رخ پر ساحل کی طرف اڑتی ہوئی آئی تھی اور زور سے چیخی تھی۔ ہوا نے خود بھی اپنا رخ شمال مغرب کی طرف موڑ دیا تھا۔ زمین تک کہر پھیلا ہوا تھا اور صنوبر کی چوٹیوں پر جاکر اٹک گیا تھا۔ جنگل آوازوں سے گونج رہا تھا۔ ہاں، شکار اچھا ہونا چاہئے۔ وہ شکار کی تلاش میں دور گھور رہا تھا لیکن کہر پانی کی سطح تک پہنچ گیا اور اب کچھ نہیں دکھائی دے رہا تھا۔

دن ختم ہو رہا تھا۔ ہوا صنوبر کے درختوں سے ٹکرا کر چنگھاڑ رہی تھی اور برف کے سخت ذروں کو بگولوں میں چکر دے کر ستون سے بنا رہی تھی۔ چاروں طرف سے جاڑے کی شام کا بھورا اور بےجان دھندلکا سمٹ کر ویران ساحل پر چھا رہا تھا۔ جابجا برف کے بڑے بڑے تودوں کے پیچھے سے بھدی سفید شکلیں اپنے خمدار برچھے لئے چلتی پھرتی اور دور دھند میں گھورتی نظر آتیں۔ سمندر بڑی اداسی سے گھڑگھڑا رہا تھا۔ ساحل سے دور ایک برف کی چٹان آ رہی تھی۔ بدھئیت سفید ڈھیر۔

سروکا نے ساحل پر سرسری نظر ڈالی — قریب‌والے برف کے تودے کے پیچھے ایک شخص کھڑا تھا جس کا نام ورونا (کوا) تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی خمدار برچھا تھا اور وہ بھی سمندر کو گھور رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر سروکا کا دل بیٹھ گیا۔ ورونا تندرست آدمی تھا۔ وہ اپنی ہرن کی کھال کا مضبوط جیکٹ (پارکا) اور کولھوں تک آنےوالے نئے بوٹ پہنے تھا اور برچھے پر جھکا سمندر کو گھور رہا تھا — صاف ظاہر تھا کہ وہ پریشان نہیں ہے۔ اسے اچھے شکار کی توقع تھی۔ ورونا نئی کشتی بنوا سکےگا اور کارو بار بھی ہمیشہ سے زیادہ اچھا ہوگا۔ اگر شکار بھی اچھا نہ ہوا تو اس کے لئے پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔

بہر حال ورونا اپنے کو شکار میں ہلکان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کام کے لئے آدمی مزدوری پر لے لئے تھے۔ سروکا کو بھی ورونا

8*

مزدوری پر لایا تھا اور چونکہ ورونا نے اس کو گرم کپڑے دئے تھے اس لئے اس کو اپنا آدھا شکار ورونا کے سپرد کرنا تھا۔

ہوا زناٹے سے چلنے لگی۔ اس نے کہر کو کاٹ چھانٹ کر رکھ دیا اور بےجان دھند کے لہراتے ہوئے کمبل کو افق تک اڑا لے گئی۔ سروکا چاق‌وچوبند ہو گیا۔ اس کو ورونا، اس کی نئی پارکا اور اپنی بددلی بھول گئی اور یہ بات بھی یاد نہ رہی کہ اس کو اپنا آدھا شکار ورونا کو دینا ہوگا۔ اس نے اپنی تیز آنکھیں دور کے شفاف منظر پر گڑو دیں۔

حد نگاہ تک ایک اتھل پتھل، بھدا سا برف کا میدان ساحل کی طرف بڑھ رہا تھا، ایک میدان جو دور افق کی بھوری اور سرد دھند تک چلا گیا تھا۔ بڑے بڑے نیلے تودے برف کی سفید چٹانوں کے اوپر ابھرتے اور پھر گرجدار آواز کے ساتھ پاش پاش ہو جاتے۔ یہ برف کا میدان بڑی بوجھل رفتار سے بڑھ رہا تھا، اس کے اوپر ایک ہنگامہ سا تھا جو لہروں کی گرج سے بالکل مختلف تھا اور ایک آندھی کی ہلکی گھڑگھڑاہٹ کی طرح خدا جانے کہاں سے گونج رہا تھا۔

سروکا نے چند منڈلاتی ہوئی چڑیاں دیکھیں، چھوٹے چھوٹے سیاہ دھبے جو مشکل سے نظر آتے تھے۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ شکار! اس‌نے چمڑے کی رسی کا گنڈلا بنا لیا، برچھا دیکھا، اپنا ٹیڑھا ڈنڈا اٹھایا اور تیار ہوکر انتظار کرنے لگا کہ برف کی چٹان ساحل تک کب پہنچتی ہے۔

اس نے چاروں طرف دیکھا اور اس کو یک دم احساس ہوا کہ دن تقریباً ختم ہو چکا ہے کیونکہ اس دورافتادہ ساحل پر دن زیادہ دیر نہیں رہتا۔ سورج اپنی ٹھنڈی کرنیں تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک افق پر ڈالتا ہے اور پھر بڑی جلدی سے اس جگہ کے قریب ہی ڈوب جاتا ہے جہاں سے نکلا تھا۔

ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرن کہر کی ایک دراڑ سے جھانکی، اس نے برف کے تودوں کو رنگارنگ چنگاریوں کی شکل میں بدل دیا، سخت برف پر اس کا عکس پڑا اور ذرا دیر کے لئے اس کی مدھم روشنی گھڑگھڑاتے سمندر، غیر دلچسپ اور برف سے ڈھکے ہوئے ساحل اور اس پر کھڑی ہوئی سیکڑوں انسانی شکلوں پر پڑی۔

ساحلی پہاڑیوں کے جا بجا چمکتے ہوئے برفانی تودوں پر سیاہ دھبے سے نظر آ رہے تھے۔ یہ دھوئیں سے سیاہ جھونپڑیاں تھیں جن کو شکاری استعمال کرتے تھے۔

پھر ہوا چنگھاڑنے لگی، کہر چھا گیا اور اس نے ڈوبتے ہوئے سورج پر نقاب ڈال دی جس کی وجہ سے چاروں طرف پھر ایک افسردہ اور بےجان ماحول طاری ہو گیا۔

(۳)

جوار کی پہلی لہر ساحل پر پہنچ کر برفانی چٹانوں کے دامن سے لپٹ گئی۔ وہ لہریں جو ابھی تک بڑا شور کر رہی تھیں بھاری برف کی چٹان سے دب کر خاموش ہو گئیں۔ برف کا میدان ایک گرج کے ساتھ ساحل کے قریب آرہا تھا جس کی گونج جنگل کی گہرائیوں تک پہنچ رہی تھی۔ زبردست سنسناہٹ اور گھڑگھڑاہٹ کے ساتھ برفانی چٹانوں کے ٹوٹنے کا تڑاقا ہوا، جیسے کوئی بڑا دیو ادھر ادھر بھاگ رہا ہو۔ برفانی چٹان آکر ساحل کی برف سے مل گئی، اس کا اگلا کنارا پیچھے کی برف کے دباؤ سے بڑھ کر ساحل کی دیوار تک آ گیا اور سفید باریک برف کی بوچھار کرتی ہوئی چٹان پہاڑیوں کے ایک پراسرار سلسلے کی طرح ساحل پر ڈھیر ہو گئی۔ تمام آوازیں سلکر ایک پرشور گرج بن گئیں۔ برفانی دھول کے بادل اٹھے اور ہوا نے ان کو ہرطرف پھیلا دیا۔ ساحل کی دیوار نے برفانی چٹان کی حرکت کو روک کر اس میں زبردست اور تباہ کن طاقت پیدا کر دی : چند منٹ میں نئے برفانی پہاڑوں کے ٹیڑھے میڑھے خطوط پورے ساحل پر پھر ابھرنے لگے۔

جیسے ھی برف نے ساحل کو چوما سیکڑوں شکاری آگے کی طرف جھپٹے۔

سروکا ان لوگوں میں آگے آگے تھا جو برف پر پہلے کودے تھے۔ وہ ایک تودے سے دوسرے تودے پر کودتا، گرتا اور پھسلتا، تودوں پر ہوا کی لائی ہوئی پولی برف میں کمر کمر تک ڈوبتا آگے کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ اس کے پیچھے برف کی بڑی بڑی چٹانیں ٹوٹ رہی تھیں۔ اس کی پوری ہستی پر محض ایک خیال چھایا ہوا تھا جس میں وائلن کے کسے ہوئے تار کا سا تناؤ تھا، ایسا خیال جس کو اس کے

دل کی ہر دھڑکن دھرا رہی تھی : ''وہاں وقت سے پہنچا دے - اے، آسمانی خدا... اے، مقدس کنواری ...،، اس کے بھاری بوٹوں سے برف کے فوارے سے اڑ رہے تھے - ہوا اس کے کانوں میں سیٹیاں بجا رہی تھی اور اس کے چہرے میں برفیلی سوئیاں چبھ رہی تھیں - اس کی داڑھی اور سونچھوں پر سخت پالے کا ایک غلاف سا چڑھ گیا تھا - لیکن اس کو کسی بات کا ہوش نہ تھا - وہ دوڑا چلا جا رہا تھا -

رات آ گئی اور دور دھند میں ساحل کے خطوط مدھم پڑ گئے - سروکا پل بھر کے لئے رکا اور سانس روک کر غور سے سننے لگا - اس کے چاروں طرف چنگھاڑتی ہوا کے سوا کچھ اور نہ تھا - لامحدود برف کا میدان شام کے بڑھتے اندھیرے میں ضم ہو گیا تھا - وہ کوئی دو میل دوڑ کر تھک گیا - ''ارے میرے خدا - میں وہاں نہیں پہنچ پاؤنگا... میں ان کو نہ پا سکونگا!،، اس نے ناامید ہو کر سوچا - ''مجھے واپس جانا چاہئے، جوار کا رخ بدل جائے گا!،،

اس خیال ہی سے اس کو جھرجھری آ گئی کہ وہ خالی لوٹے گا - دھوئیں سے بھری ہوئی جھونپڑی، خاندان اور بچے انتظار کر رہے ہونگے... وہ گر پڑا اور برف پر اپنے کان لگا دئے - کہیں داھنی طرف سے بچے کے سسکنے جیسی آواز آ رہی تھی - ایک لمحے میں اس کی ساری تھکن دور ہو گئی - وہ اس سمت بھاگا اور برف پر پٹ لیٹ گیا - اس کے سامنے ایک تاریک غار منہ پھاڑے کھڑا تھا - اسے اس کا چکر لگا کر جانا تھا - آخرکار سروکا نے جو بالکل پسینے سے تر تھا، تیزی سے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں کچھ سیاہ متحرک چیزوں کے مدھم خطوط دیکھے -

سروکا چھلانگ مار کر وہاں پہنچ گیا - سیل مچھلیوں کا ایک پورا خاندان برف پر ساکن لیٹا ہوا تھا - آدمی کی چاپ پاتے ہی ان میں جان آ گئی - وہ اپنے اگلے پیروں پر ابھریں، اپنے بےڈھنگے سر اٹھائے اور اپنے بھاری جسم بےتکے پن سے گھسیٹنے لگیں - وہ برف پر رھنے کے عادی نہ تھیں اور ان کو ایسی جگہ اپنے دشمن کی موجودگی سے پریشانی ہو رہی تھی -

قریب کے جانور کے پاس پہنچتے ہی سروکا نے اپنا برچھا اس کی آنکھوں کے درمیان مارا - سیل مچھلی نے اپنا سر برف پر پٹک دیا - ہوا میں برچھے کی سنسناہٹ ہوئی اور اس کی انی خمدار حصے تک سیل مچھلی

کی ناک کی ھڈی میں گھس گئی۔ اس کے چہرے پر خون کے قطرے پھیل گئے اور یہ بھاری جانور جس کے جسم کا کوئی دوسرا حصہ گولی سے بھی زخمی نہیں ہو سکتا برف پر چاروں خانے چت پڑا تھا۔ نپے تلے وار کرکے سروکا نے کئی اور سیل مچھلیاں ماریں۔

اس کا تجربہ‌کار ھاتھ جو جوش اور تھکن کی وجہ سے ذرا کانپ رہا تھا تیزی کے ساتھ مردہ جانوروں کی کھال اور چربی کی تہہ ادھیڑ رہا تھا۔ سروکا بڑی پھرتی سے کام کر رہا تھا اور ساتھ ھی یہ حساب بھی لگاتا جاتا تھا کہ کھالوں کے لئے اس کو کیا ملےگا۔ وہ خوش تھا اور کام کرتے کرتے خود بخود مسکراتا جاتا تھا۔ اگر وہ اس مرتبہ کی طرح ھر بار خوش‌قسمت رہا تو وہ اپنے خاندان کی حالت سدھار سکےگا۔

لیکن وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا، جوار کا رخ بہت جلد بدلنےوالا تھا۔ اس نے جلدی سے کھالیں اور چربی اکٹھا کی، ان کی گٹھری بنائی، اس کو چمڑے کے تسمے سے باندھا اور تسمہ اپنے کاندھے پر ڈال کر اس گٹھری کو برف پر گھسیٹتا ھوا چل پڑا۔ سو کلوگرام یا اس سے زیادہ کا وزن برف کی ناھموار اور ٹوٹی پھوٹی سطح پر گھسیٹنا آسان کام نہ تھا۔

برف کے بہاؤ کی وجہ سے سمندر پرشور تھا۔ رات کی تاریکی نے اس پر پردہ ڈال دیا تھا۔ سرد، ناقابل گذر تاریکی چاروں سمت سے اس کی طرف لپک رھی تھی اور برفانی میدان پر ایک موٹا کمبل سا پڑتا جا رہا تھا جس کے اوپر سرد ھوائیں برف کے تودوں کے درمیان چنگھاڑ رھی تھیں۔

سروکا ھوا اور ایسی علامتوں کے ذریعہ اپنے راستے پر چل رہا تھا جو آرکٹک ساحل ھی کے لوگ جانتے ھیں اور ناتجربہ‌کار نہیں دیکھ سکتے۔ وہ چاروں طرف کی تاریکی میں گھور کر دیکھتا اور کبھی کبھی اپنے سامنے برچھے سے برف کا اندازہ لگاتا جاتا۔ اس کے چہرے سے پسینہ ٹپک رہا تھا لیکن تھکن نہیں معلوم ھو رھی تھی۔ وہ خالی ھاتھ نہ تھا۔ اس کے سامنے صرف واپسی کا اھم سوال تھا۔

سروکا اچھی طرح جانتا تھا کہ گھر پہنچنے پر اس کو اپنا شکار قرض کی ادائیگی میں دے دینا ھوگا۔ سب کچھ شکار کے سامان کی قیمت

ادا کرنے کے لئے کولاک* ورونا کی نذر ہوجائےگا، پھر بھی بڑی خوشی سے وہ بھاری پلندہ گھسیٹتا رہا۔ اس کے چہرے سے پسینہ بہہ رہا تھا۔

''ساحل ابھی تک دکھائی نہیں دیتا،، اس کے ذہن میں یہ بات اچانک آئی۔

اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ گھپ اندھیری رات بڑی ہیبت‌ناک تھی۔ اچانک اس کا ماتھا ٹھنکا۔

''مجھے دیر نہ ہونی چاہئے۔ میں بہت دیر کا نکلا ہوں۔ وقت ختم ہو گیا ہے!،،

اس نے تسمہ دوسرے کاندھے پر ڈالا اور پہلے سے زیادہ تیز چلنے لگا۔ یہ خیال کہ اس کو دیر ہو جائیگی اور جوار واپس ہوتے وقت اس کو اپنے ساتھ سمندر میں کھینچ لےجائیگا اس کے دماغ کو بری طرح کرید رہا تھا۔ سروکا نے خوب تنے ہوئے تسمے کو پریشان ہوکر اور کھینچا، اس کو محسوس ہوا کہ بہت دیر ہوگئی ہے۔ اس کے گھٹنے جھکے جا رہے تھے اور وہ ٹھوکریں کھانے لگا تھا۔ اس کے آگے کئی جگہوں پر دو یا تین روشنیاں تاریکی کے اندر سے جھلملاتی نظر آرہی تھیں۔ غالباً ساحل قریب ہی تھا۔

سروکا نے آگے بڑھنے کے لئے اپنی آخری طاقت لگا دی۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ اس کی کنپٹیاں تپک رہی تھیں اور اس کا گلا خشک ہو گیا تھا۔ اس کو ٹھنڈی ہوا کے گھونٹ حلق سے اتارنے میں تکلیف ہو رہی تھی۔

وہ ذرا دیر کے لئے رکنا چاہتا تھا لیکن اس نے ضبط سے کام لیا اور دوڑتے دوڑتے چند مٹھی برف کھاکر اپنی رفتار زیادہ تیز کر دی۔ کسی چیز کی سرسراہٹ اور گھڑگھڑاہٹ معلوم ہونے لگی۔ آگے دھندلکے میں برفانی تودوں کا خاکہ معلوم ہو رہا تھا۔ برف تھرتھرا کر ٹوٹ رہی تھی۔

''اگر میں پلندہ چھوڑ دوں تو اب بھی پہنچ سکتا ہوں!،، ایک لمحے کے لئے یہ خیال اس کے ذہن میں کوندا۔

لیکن اس نے پلندہ چھوڑا نہیں۔ وہ بڑی کوشش سے پلندہ گھسیٹتا رہا...

---

* غریب کسانوں کا استحصال کرنے والا مالدار کسان۔

شکاریوں کی جھونپڑی برف میں ایک سیاہ دھبے کی طرح معلوم ہوتی تھی اور چھجے تک برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ ایک سوراخ کے ذریعے چھت سے دھوئیں کے سرغولے نکل رہے تھے جن کو ہوا جلدی سے منتشر کر دیتی تھی۔

جھونپڑی کے اندر کا دھندلکا صرف تھوڑی سی آگ سے چھنٹ رہا تھا جو ایک کونے میں پتھر کے ڈھیروں پر رکھی تھی اور اس کی پھیکی سرخ اور جھلملاتی ہوئی روشنی تاریک، بلا کھڑکیوں کی دیوار، دھوئیں سے سیاہ چھت جس پر سیاہی کے ھار لٹک رہے تھے اور اس گندے تختے پر پڑ رہی تھی جس پر شکاری سوتے تھے۔ تہہ بہ تہہ دھوئیں کی تیز بو سے ہوا بھری ہوئی تھی۔ بھاری بھرکم شکاری تختے پر پڑے تھے۔ تقریباً بیس یا اس سے زیادہ شکاری گڈمڈ لیٹے تھے۔ یہ سیکڑوں شکاریوں کی فوج کا ایک دستہ تھا جو ہر سال اپنی ضرورتوں اور شمال کی دشوارگذار زندگی سے مجبور ہوکر بحر سفید کے ویران ساحلوں پر آتے ھیں۔

یہاں وقت کاٹنا دشوار ہو رہا تھا۔ سمندر جو شکاریوں کے لئے کارآمد تھا ان کے خلاف مضرت‌رساں چالیں چل رہا تھا — چند گھنٹے تک وہ برف سے سفید رہا جس کی وجہ سے کثرت سے شکار ساحل پر آگیا۔ پھر اچانک تیز ہوا آئی اور برف کے میدان کو توڑتی پھوڑتی چلی گئی اور برف سیکڑوں بےڈھنگے ڈھیروں میں نظر آنے لگی۔ آرکٹک کی طویل راتوں اور مختصر بھورے دنوں میں ان آدمیوں کا کوئی مشغلہ نہ تھا کیونکہ ان کے دونوں محبوب مشغلے یعنی تمباکونوشی اور گانا یہاں ممنوع تھے۔

''سمندر کو صفائی اور عبادت سے محبت ہوتی ھے،، شکاریوں کا قول تھا۔ ''اگر آدمی تمباکونوشی کرے، گائے اور گالیاں بکے تو سمندر اسے کچھ نہ دیگا۔ ساحلی ہوا آکر اس کی کھال کھینچ لیگی اور سب سے بڑی بات تو یہ ھے کہ اس کو گھسیٹ کر سمندر میں پھینک دیگی۔،،

کونے میں سرخ آگ سے رال کے دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے۔ اس کے چاروں طرف کچھ اور شکاری بیٹھے تھے، کچھ زمین پر لیٹے قصے

کہانیاں اور طرح طرح کی پرانی باتیں اپنی بیکاری اور اکتاہٹ دور کرنے کے لئے سن رہے تھے۔

جھونپڑی کے باہر کسی کے بھاری قدموں کے نیچے برف چرچرائی... دروازہ یک دم کھلا۔ سرد ہوا آگ کے سرخ شعلوں سے کھیلنے لگی، اس نے دھوئیں کے چھوٹے چھوٹے بادل بنا دئے۔ ایک آدمی پارکا پہنے جھونپڑی میں داخل ہوا۔ اس کا چہرہ بھورے پالے سے اس طرح ڈھکا ہوا تھا جیسے اس پر سفید کائی جم گئی ہو۔ ہڈ کے اندر سے ایک سرد اور ناخوشگوار چہرہ نکلا۔

''سروکا واپس نہیں آیا،، اس نے مدھم آواز میں کہا۔ ''اس کو سمندر بہا لے گیا!،،

ہر شخص نے باتیں بند کر دیں۔ ہر شخص کی آنکھوں میں یہی نقشہ پھر گیا۔ کھلی ہوئی سرد جگہیں، برف اور تاروں بھرا آسمان اور برف پر ایک آدمی جو سردی سے اکڑتے اکڑتے اپنی جان بچانے کے لئے آخر تک لڑا ہوگا۔

''تم چپکے کیوں بیٹھے ہو؟،، ایک بڈھے نے غمآلود لہجے میں پوچھا۔ ''کشتی باہر نکالو!،،

آٹھ آدمی اپنی اپنی جیکٹیں پہننے لگے۔

بڈھا باہر گیا اور سمندر کو دیکھنے لگا۔ دور تک پالے میں شیشے جیسی سطح چمک رہی تھی اور اوپر، آسمان سے ستارے جھانک رہے تھے۔ ساحل کا پرانا جنگل دھند میں لپٹا سو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے برفانی مینار پہرہ دے رہے ہوں۔ رات کی سرد ہوا میں ایک مہیب سناٹا تھا۔

ایک منٹ بعد ایک چھوٹی سی کشتی ساحل سے اپنے پیچھے ایک چمکدار دھار چھوڑتی ہوئی روانہ ہوئی اور ستاروں کی کہرآلود روشنی میں غائب ہوگئی۔

(٥)

ہوا مدھم پڑگئی اور تھمی ہوئی لہریں برفانی چٹانوں کے ٹوٹے پھوٹے ٹکڑوں کو کسی بڑے جہاز کے تباہشدہ حصوں کی طرح ادھر ادھر لے جانے لگیں۔ آسمان کے نیلے گنبد پر جھلملاتے ہوئے چمکدار

ستارے پھیلے تھے اور بادل ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ برف کی طرح شفاف، سرد، طویل اور اداس شمالی رات گھڑگھڑاتے ہوئے سمندر پر طاری تھی۔ سمندر اب بھی غصے میں تھا، طوفان کے بعد ابھی اسے چین نہیں نصیب ہوا تھا۔

رفتہ رفتہ سمندر برف سے صاف ہو گیا۔ صرف یکادکا برف کے تودے ادھر ادھر تیر رہے تھے۔ دور افق کے نیلگوں پس‌منظر میں برف کے ان تودوں میں سے ایک پر کمزوری کے عالم میں ایک لمبا آدمی کھڑا تھا۔ اس کا دھندلا، سیاہ خاکہ نظر آ رہا تھا۔

یہ تھا سروکا۔

وہ بڑی مہارت کے ساتھ اپنے برچھے سے برف کے تودے کو کھے رہا تھا۔ لچکدار ڈنڈا جھاگ‌دار ٹھنڈے پانی پر زور سے پڑتا اور برف کا بے ڈھنگا تودہ آگے بڑھ جاتا۔ چاروں طرف لق و دق بحری ویرانہ پھیلا ہوا تھا۔

سروکا نے اپنا سر اٹھایا، اوپر ہلکے پالے کے دھند میں دب اکبر کے ستارے سونے کی طرح چمک رہے تھے — انھوں نے اسے راستہ بتایا۔ سروکا برف کے بھاری تودے کو آگے بڑھانے کے لئے اپنا برچھا خوب زوروں سے چلا رہا تھا اور ساتھ ہی اس کے دل میں برے برے خیالات بھی آ رہے تھے: وہ بہت دور سمندر میں بہہ آیا تھا، دو دن سے اس نے کچھ کھایا پیا نہ تھا۔ وہ اپنا برچھا زور سے پانی میں چلانے لگا۔ اس کو کمزوری محسوس ہو رہی۔ وہ پل بھر کے لئے رکا۔ منہ بھر کر برف کھائی اور چاروں طرف دیکھا۔ لق و دق بحری ویرانہ دھندلی نیلی روشنی میں پھیلا تھا، پھر وہ بھی غائب ہو گیا۔

سرد آسمان تاروں کی روشنی سے چمک رہا تھا اور بچے کھچے بادل سایوں کی طرح اس پر بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ لامحدود سمندر پرسکون تھا اور تارے اس میں لرزاں نظر آتے تھے۔

سروکا نے محسوس کیا کہ اس کا انجام برا ہونےوالا تھا۔ برفانی سمندر اس کو چاروں طرف سے گھیرے تھا، سفید پالا برابر پڑ رہا تھا اور اس کی سرد سوئیاں اس کے ٹھٹھرے ہوئے جسم میں چبھ رہی تھیں۔

اپنے اندر گرمی پیدا کرنے کے لئے سروکا نے اور زور سے کھینا شروع کیا۔ اس کے دماغ میں یکے بعد دیگرے پریشان خیالات آ رہے

تھے: ''اے خدا، میری مدد کر... میرے بچے چھوٹے چھوٹے ہیں... لاچار ہیں... کمزور ہیں... وہ ابھی کسی کام کے بھی نہیں ہیں... بیوی بھی نہیں...،، اس کا دماغ ان خیالات سے بھرا ہوا تھا کہ گھر پر کچھ نہیں ہے۔ اگر اس کا شکار اچھا ہوتا تو حالات ذرا بہتر ہو جاتے اور وہ ورونا کا قرض چکا سکتا۔ سروکا سب ٹھیک کر لیتا لیکن وہ گھر واپس بھی پہنچےگا؟ اس کو وہ لٹھوں کی بنی تاریک اور دھوئیں سے سیاہ کوٹھری یاد آئی۔ سروکا کو خیال آیا کہ وہ شکار سے واپس ہونے کے بعد کس طرح نہاتا تھا اور اپنے گناہآلود جسم کو گرم کرتا تھا۔ پھر اس کو یاد آیا کہ جب وہ لڑکا تھا تو کس طرح اپنے باپ کے ساتھ شکار پر جایا کرتا تھا۔ پرشور لہریں ساحل سے ٹکراتی تھیں اور بڑی بڑی برف کی چٹانیں سمندر میں تیرتی پھرتی تھیں... اس کو دلدلی راستے، وہ چڑیاں اور جنگلی جانور یاد آئے جن کا وہ شکار کیا کرتا تھا۔ اس کو اپنی غریبی یاد آئی اور جب اس نے اپنی پوری زندگی کا جائزہ لیا تو اس کی یادوں میں تلخی بھر گئی۔ وہ پھر اپنے برچھے سے کھینے لگا اور دل ہی دل میں حساب لگایا کہ اس کو ابھی اور کتنی دور جانا ہے۔ ''نہیں، میں کبھی نہیں جا سکونگا!،، اور پھر اس کو اپنے اوپر پھر افسوس ہوا۔ کیا اس کو اس طرح مرنا تھا؟

سروکا کو اس کا یقین نہ تھا۔ مدتوں سے اس کا سمندر سے سابقہ تھا۔ وہ ہفتوں بلکہ مہینوں سمندر سے گھرا رہا تھا جہاں سوائے برف اور آسمان کے کچھ بھی نہ تھا۔ دوسرے موقعوں پر بھی ایسا ہوا تھا کہ سمندر اسے دور بہا لے گیا تھا اور نہ تو اس کے پاس روٹی ہی نہ آگ اور نہ کوئی امداد کا دوسرا ذریعہ۔ وہ موت کے منہ تک پہنچ کر صاف بچ گیا تھا... دوسرے لوگ گھر واپس گئے ہونگے — گرم گھروں اور بچوں کے پاس... شکار بھی اچھا ہوا ہوگا... ساری کلفت دور ہو گئی ہوگی... لیکن اس کو ایک بےجان برف کا تودہ سمندر پر بہا لے جائیگا۔ اس کے بھی گھر تھا، بچے تھے، شکار بھی اچھا ہوا تھا لیکن وہ واپس نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کا دل دکھ رہا تھا، اس طرح مرنا قابل افسوس تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ ٹھٹھر جائیگا، اب اس میں طاقت نہیں رہ گئی تھی۔ ایک بڑا آنسو اس کی آنکھوں سے ڈھلک کر آہستہ آہستہ اس کے اداس چہرہ پر بہنے لگا اور اس کی برف

سے لتھڑی ہوئی سونچھوں پر پہنچ کر ایک جمے ہوئے شبنم کے قطرے کی طرح لٹک گیا۔ اس نے ناقابل‌فہم انداز میں سر اٹھا کر اپنی دھندلی آنکھوں سے دور آسمان کی طرف تکا جس پر سرد روشنی تھی جیسے اس کو امید ہو کہ وہاں سے کوئی جواب ملیگا۔ لیکن ٹھٹھری ہوئی دنیا پر رات نے خاموشی کی مہر لگا دی تھی۔

روشن آسمان کے گنبد کی روزمرہ، لابدی گردش اس چھوٹے ستارے کے گرد جاری رہی جو دب‌اکبر کی دم کے سرے پر ہوتا ہے۔

ایک پتلا، دھندلا، چھوٹا سا بادل روشن آسمان پر گذرا، ستارے اس کے پرآسیب پردے کے اندر سے چمک اٹھے، بادل کے اس پار شمالی روشنیاں خوب زور سے چمکیں اور آسمان ان کی چنچل اور جادوبھری روشنیوں سے پرنور ہو گیا۔

سروکا کی طاقت اب ختم ہو رہی تھی۔ اس کے لمبے برچھے کی جنبش کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے بازو سن ہو گئے تھے اور پیر بھی سو گئے تھے، اس کا بھاری سر نیچے جھکتا ہی جا رہا تھا۔ کاش کہ وہ ایک منٹ بیٹھ کر آرام کر سکتا۔ لیکن نہیں، وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جان‌لیوا پالا اس کی ہر جنبش کو تاک لگائے دیکھ رہا ہے اور جنبش کے بند ہوتے ہی پالا اس پر چھاپ بیٹھےگا اور اپنی سرد سانس اس کے روئیں روئیں میں سرایت کر دیگا۔ سروکا اب کچھ نہیں سوچ رہا تھا وہ صرف نیند سے بچنا چاہتا تھا۔ اب اس کے خیالات گنجلک ہو چلے تھے اور اس طرح ٹکڑے ہو ہوکر منتشر ہو رہے تھے جیسے بے جان کہر ہوا میں بکھر جاتا ہے۔ اس نے سمجھ لیا کہ اس کا آخری وقت آگیا اور پھر اس کو اپنے دورافتادہ گھر کی یاد آئی اور گذر گئی۔ سروکا نے سمجھ لیا کہ اب اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتا۔ لوگ وقت سے نہ پہنچ سکیں‌گے، اس کی آواز نہ سن سکیں‌گے۔

''میں ختم ہوگیا!.. ارے، تم لوگ کہاں ہو!..''

اس دیوانہ‌وار چیخ نے رات کے سناٹے کو چکناچور کر دیا۔ وہ سمندر کی پرسکون سطح پر پھیل کر بلند ہوتی چلی گئی اور ہلکے پالے کے دھند میں جا کر غائب ہو گئی۔ مدد کی یہ بےسود پکار صرف دورافتادہ برفانی دیوار سے جا کر ٹکرائی اور گونج اٹھی، ایک ننھا ستارہ اپنی جگہ سے اچھل کر آسمان کے پار دوڑتا چلا گیا اور پھر خاموشی چھا گئی۔

شمالی روشنیاں چمکتی رہیں ۔ آدھے آسمان پر ستارے خوب چمک رہے تھے لیکن دوسرے نصف حصے میں سخت اندھیرا چھایا تھا اور ستارے ڈوب چکے تھے ۔ اس اندھیرے سے سفید دھوئیں کا ایک گولا بلند ہوا جیسا کسی توپ کے دھانے سے نکلتا ہے ۔ وہ آسمان پر اس سفید چادر کی طرح پھیل کر تیزی سے دوڑنے لگا جس پر چمکدار ستاروں کا کام ہو اور پھر وہ نقطۂ عروج پر پہنچ کر غائب ہو گیا ۔ ہر مرتبہ جب یہ دھواں دھار بادل پھٹ کر آسمان پر پھیلتا تو یہ خیال ہوتا کہ اس کے ساتھ ایک دھماکا بھی ہونا چاہئے جو سوتے سمندر کو جھنجھوڑ دے ۔ لیکن فضا میں وہی اٹوٹ خاموشی رہی ۔ یہ تیزرفتار آتشیں چادریں برابر توپ کے دھانے سے پھوٹ‌پھوٹ کر نکلتی اور طرح طرح کے رنگ پھیلاتی رہیں ۔

سروکا پر نیند کا غلبہ شروع ہو گیا ۔ وہ کھڑے کھڑے تھک گیا اور اکڑوں بیٹھ گیا ۔ اس کے جسم میں ایک خوش گوار گرمی آ گئی ۔ اس نے ایک لمحہ کے لئے سوچا : ''شاید پالا کم ہو گیا ہے'' ۔ لیکن نیند نے اس کے خیالات کو ذرا دھندلا کر دیا ۔ یادوں کے بھنور میں پرانی بھولی بسری باتیں دھندلی دھندلی سی ابھرنے لگیں لیکن جلدھی گذری ہوئی زندگی کے لامحدود واقعات میں گم ہو گئیں ۔

اس کے سامنے ٹنڈرا میں رات کے سناٹے کی ایک تصویر آئی ۔ ایک تاریک رات میں تن‌تنہا، برف سے ڈھکی ہوئی اسکیمو کی ایک جھونپڑی میں طوفان کی چنگھاڑ صور اسرافیل کی طرح گونج رہی تھی ۔ خوفزدہ رینڈیر جھونپڑی کی دیوار کے پاس دبکے بیٹھے تھے ۔ جھونپڑی کے اندر خود سروکا، ایک سمایدؔ* اور اس کا خاندان تھا ۔ سروکا رینڈیر کی کھالوں کے ڈھیر پر بیٹھا تھا ۔ ایک چھوٹا پیپا اس کے ھاتھ میں تھا ۔ وہ سودا کرنا چاھتا تھا ۔ وہ سمایدوں سے رینڈیر خریدنا چاھتا تھا لیکن سماید رینڈیر نہیں بیچ رہے تھے ۔ رینڈیروں کے بغیر وہ ٹنڈرا میں ختم ہو جاتے ۔ سروکا نے سماید کو ایک گلاس شراب دی اور وہ چہک اٹھا، سروکا نے اس کو دوسرا گلاس دیا اور وہ سروکا کی باتیں زیادہ غور سے سننے لگا، اس نے تیسرا گلاس دیا اور سماید گانے لگا ۔ جس

---

* شمال میں ایک قومیت ۔

چیز پر اس کی نگاہ پڑی اس کے متعلق گانے لگا۔ اس نے شراب پی لی اور گانے لگا : ''آچ، وادکا، اچھی وادکا!،، آگ میں کچھ لکڑی ڈالی گئی اور وہ گانے لگا : ''آچ، آگ، گرم آگ!،، کوئی پلا بھونکا اور وہ گانے لگا : ''آچ، پلا، سفید پلا!،، سروکا کا دل ان پرانے گیتوں کو یاد کرکے بھر آیا۔

سروکا نے سماید کو اتنی شراب پلائی کہ وہ مست ہوگیا، اس نے اس کی بیوی کو بھی شراب پلا کر مست کر دیا اور پھر قلیل سی قیمت پر ان کے رینڈیر خرید لئے۔ صبح کو طوفان ختم ہوگیا اور وہ تمام رینڈیر اپنے یہاں ہنکا لایا لیکن اس نے تین رینڈیر سماید کو واپس کر دئے تاکہ وہ ٹنڈرا میں مر نہ جائے۔ سروکا رینڈیر ہنکا لایا اور سماید ٹنڈرا میں رہ گیا۔ سروکا کے ذہن سے سماید کی تصویر کسی طرح جا ہی نہیں رہی تھی۔ سماید سروکا کو اپنی نیم وا آنکھوں سے دیکھ رہا تھا جو شراب‌نوشی کی وجہ سے چندھی ہو گئی تھیں اور سروکا یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ رو رہا ہے یا گارہا ہے : ''رینڈیر، چھوٹے رینڈیر ... آچ، رینڈیر !..،، سروکا یہ منظر بھول جانا چاہتا تھا، اس کا سر گھوم رہا تھا، تمام خیالات گڈمڈ ہو رہے تھے۔ وہ ان خیالات سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا اور اپنے کو اس غنودگی کے سپرد کر دینا چاہتا تھا جس سے اس کے ذہن پر دھندسی چھا رہی تھی۔

اس کو جھرجھری آ گئی۔ ایک طویل توپ جیسے زناٹے نے خاموشی توڑ دی۔ دور، بہت دور، برف کا کوئی ڈھیر، پالے کے زور سے دب کر ٹوٹ گیا تھا۔ برف نے ایک گونج پیدا کی، جس کی بازگشت ہوئی اور پانی کی سطح پر پھیل گئی۔

ایک لمحے کے لئے وہ جاگ پڑا لیکن اس کو حیرت ہوئی کیونکہ اس کی آنکھیں نہیں کھل رہی تھیں۔ پپوٹے آپس میں چپک گئے تھے۔ رات کے اندھیرے میں دور مدھم روشنی کی طرح خطرے کا ایک ہلکا احساس اس پر طاری تھا۔ فضا میں پھر موت کی سی خاموشی چھا گئی اور پھر وہ اسی طرح اونگھنے لگا۔ وہ اپنے بھاری پپوٹے کھولنے کی کوشش کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ پھر غنودگی کی وجہ سے اس کے ذہن پر دھند سی چھا گئی اور بےجوڑ خیالات کا ایک لمبا جلوس اس طرح گذرنا شروع ہوا جیسے چاندنی رات میں ہلکے ہلکے بادل گذرتے ہیں۔ اس کو محسوس ہوا کہ بےجان سمندر میں زندگی آ گئی ہے اور

لق‌ودق بحری ویرانہ ہلکی ہلکی سانسیں لے رہا ہے اور اس کی سانس کی لطیف بھاپ اٹھ کر دور ستاروں تک پہنچ رہی ہے اور سمندر کی گہرائیوں میں کوئی ایسی بات ہو رہی ہے جس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ساری دنیا خاموش ہے اور سابقہ زندگی بالکل ختم ہو گئی ہے، اس پر اسرار خلا سے گھر گئی ہے جس میں ایک اور انجانی زندگی کی دھڑکنیں بھری ہوئی ہیں۔ وہ ایک، نرم، پرسکون ہوا، مشکل سے سنائی یا دکھائی دینے‌والی جھنکار اور ہلکے کہر کے خواب دیکھ رہا تھا جو سمندر کے اوپر منڈلا رہا ہو۔

اپنی سرسامی حالت میں سروکا نے سرد دھند کے اندر دو چمکدار لہریں دیکھیں جو اپنے پیچھے ایک ٹیڑھا میڑھا روشن راستہ چھوڑتی جا رہی تھیں اور ایک نیم شفاف اور بہت دھند لی کشتی بلا لہروں کو چھوئے اس کے اوپر چڑھی آ رہی تھی۔ برف کا تودہ کانپا اور ہلا، اس نے سمندر کی پرسکون سطح بھی ہلا دی۔ اس کے چاروں طرف روپہلے حلقے بنے اور بڑھتے گئے۔ لہراتی ہوئی سطح پر عکس ڈالنے‌والے ستارے بھی تھرتھرائے، اتھل پتھل ہوئے اور سنہرے دھبوں کی طرح تیرنے لگے۔ چاند جو ابھی ابھی طلوع ہوا تھا کچھ بے تکا سا لمبوترا ہو گیا، کانپا اور افق تک روشنی کی ایک لمبی لکیر بن گیا... شام کی دھند آہستہ سے سمندر پر چھا گئی اور سب کچھ چھپ گیا...

ایک ہلکی، چمکدار اور سرد دھند میں لپٹی ہوئی آرکٹک کی رات مزے میں پرسکون سمندر پر اونگھتی رہی۔ وہ شمال کے شاندار حسن سے درخشاں تھی۔ ہر طرف ستاروں بھری چادر پھیلی تھی جو شوخی سے اپنی رنگا رنگ روشنی چمکا رہی تھی۔ چمک‌دار ستارے آسمان کے سیاہ گنبد میں لٹکے ہوئے ادھر ادھر جھول رہے تھے۔ اوپر سے نیلی روشنی کی بارش ہو رہی تھی۔ موت کی سی جامد خاموشی سرد سمندر پر طاری تھی،اس رنگا رنگ حسن میں بھی لاابدی موت کی بے کیف سردمہری محسوس ہوتی تھی۔ پانی کی لاانتہا وسعتوں پر برف کی ایک ہلکی چادر جم گئی تھی اور ایک ہلکی نیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ دور منجمد حصے میں ایک انسانی خاکہ نظر آ رہا تھا جو پالے سے ڈھک گیا تھا اور ایک ویران برف کے تودے پر گڑمڑایا ہوا پڑا تھا۔

۱۸۸۹ء

انعام

(۱)

اسٹیمر بھاری اور موٹے موٹے رسوں سے بندھا کھڑا تھا۔ گودی میں وہ سیاہ اور بہت بڑا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے چھریرے مستول بہت اونچے اور خوبصورت تھے جن کی چوٹیاں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ نیچی اور دھوئیں سے سیاہ چمنی سے جو ہلکی سی پیچھے کی طرف جھکی ہوئی تھی بڑی خاموشی اور اداسی کے ساتھ دھوئیں کے ہلکے اور آڑے ترچھے مرغولے نکل رہے تھے۔ اسٹیمر کے اوپر ہوا تھرتھرا رہی تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی ان‌دیکھی لیکن زبردست طاقت اس کے کھلے ہوئے سیاہ دھانے سے ابل رہی ہے۔

جہاز کے کمروں کی گول‌سیاہ کھڑکیاں کسی اونگھتے ہوئے دیو کی آنکھوں کی طرح خاموشی اور سادگی سے گھور رہی تھیں۔ جہاز کے دیدبان پر کوئی نہ تھا، صرف تار کے کھمبے خاموش کھڑے تھے۔ زنجیریں سانپوں کی طرح لپٹی ہوئی پڑی تھیں، رسیوں کی کنڈلیاں بنی ہوئی تھیں، بادبان لپٹے ہوئے تھے اور عرشے بالکل خالی اور سنسان تھے — یہ تمام چیزیں اس آرام اور سکون کی غماز تھیں جو دن رات کام کرنے کے بعد نصیب ہوا تھا، ایسے کام کے بعد جو اس آہن‌وفولاد کے جسم میں تھرتھری ڈال دیتا تھا جس نے ہزاروں میل کا سفر کیا تھا اور بہت سے سردو گرم دن دیکھے تھے۔

اب بھی ایک جگہ ایسی تھی جہاں آرام عنقا تھا۔ اسٹیمر سے لے کر گودی تک چوڑے چوڑے تختے بچھے ہوئے تھے اور یکے‌بعددیگرے

گانٹھوں، بکسوں اور تھیلوں کے بوجھ سے لدے اور بےحد جھکے ہوئے ننگے پیر آدمیوں کا ایک سلسلہ پھٹی پرانی قمیصیں اور پتلونیں پہنے اس جہازی پل کے اوپر نیچے چیونٹیوں کی طرح آ جا رہا تھا۔ بوجھ کے نیچے سے پسینے کی بڑی بڑی بوندیں ٹپک‌ٹپک کر تختوں پر گر رہی تھیں۔ وہ اپنا اپنا بوجھ باڑے میں گرا کر ایک سکنڈ کے لئے کمر سیدھی کرتے، محنت سے سرخ چہروں کا پسینہ پونچھتے اور پھر اسٹیمر پر دوڑ کر واپس جاتے جہاں جہاز کا دروازہ ایک تاریک غار کی طرح منہ پھاڑے کھڑا تھا۔

ملاحوں کا جمعدار دروازہ میں کھڑا ہر بنڈل کو اپنی نوٹ‌بک میں درج کرتا جاتا تھا۔ اس کے برابر ایک آدمی کھڑا تھا جو بوجھ اٹھانےوالی مشین میں انجن کے بیرم گھما رہا تھا۔ زنجیریں شور مچاتی، کھڑکھڑاتی ایک زبردست بالا کپی سے جو عرشے پر دیوپیکر بازو کی طرح پھیلی ہوئی تھی سیاہ غار میں بڑی تیزی سے اترتی جاتیں۔ تاریک گہرائیوں سے ایک مدھم آواز جو دوری کی وجہ سے دھیمی ہو گئی تھی اس طرح آ رہی تھی جیسے زمین کے اندر سے آرہی ہو۔

''ر... ر... رکو!..''

بیرم کو ایک مرتبہ گھما کر ڈرائیور نے انجن روک دیا اور زنجیروں کی کھڑکھڑاہٹ اس طرح اچانک رک گئی جیسے ان کو کسی نے کاٹ دیا ہو۔ کئی آدمی دروازے پر جھکے ہوئے تھے، بہت دور نیچے چلتے ہوئے آدمی ان کو مشکل سے دکھائی دے رہے تھے جیسے وہ کسی بہت بڑی غار کی تہہ دیکھ رہے ہوں۔ نیم تاریکی میں انھوں نے دیکھا کہ نیچے کے لوگوں نے بالا کپی کا کانٹا پکڑا اور اس کو کئی پیپوں اور بکسوں میں اٹکا دیا جو رسی سے ایک ساتھ بندھے تھے۔

''کھینچو!'' نیچے سے آواز آئی۔

بیرم ایک مرتبہ آہستگی اور آسانی سے گھوما جیسے کوئی کھیل ہو اور باقاعدہ زنجیر کو لپیٹنے لگا۔ زنجیر اوپر چڑھتی گئی اور بےڈھنگے، بڑی توندوں والے پیپے اور بڑے بڑے بند بکس دروازے کے نچلے حصے سے ٹکراتے ہوئے دکھائی دئے۔ پورا بوجھ جب دن کی روشنی میں آ گیا اس وقت یہ پتہ چلا کہ کتنا بھاری بوجھ تھا۔ بالا کپی نے

آدھا چکر لگایا اور اب تمام پیپے اور بکس عرشے کے اوپر لٹکے ہوئے تھے۔

''نیچا کرو !..''

ذرا دیر کے لئے زنجیر نیچی ہوئی اور بکسوں اور پیپوں کا اونچا پہاڑ عرشے پر دھرا تھا۔ جہازی قلی دوڑ پڑے، بکسوں کو مقررہ جگہوں پر ٹکا دیا اور پیپوں کو لنڈھکانا شروع کیا۔ کچھ پلندے بڑی شان سے جھول رہے تھے اور اس طرح اوپر نیچے ہو رہے تھے جیسے اپنے کو تمام فضا کا مالک سمجھتے ہوں، کچھ بنڈل پل کے تختوں پر ایک جلوس میں گذر رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی لمحے ان آدمیوں کو دبا اور کچل کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے جو ان کے نیچے ڈگمگاتے قدموں سے چل رہے تھے لیکن یہ سارے بنڈل گودی پر سلامتی سے پہنچ گئے جہاں ان کو ایک بڑے ڈھیر میں ان کے ہم جنسوں کے پاس پھینک دیا گیا۔

پھر ''اوپر کھینچو''، ''نیچے لاؤ'' اور ''رکو'' کی چیخیں آنے لگیں۔ ان کے ساتھ زنجیروں کی جھنکار مل جل گئی تھی اور باربرداری کا انجن جھک‌جھک کر رہا تھا، بالا کپی آگے پیچھے گھوم رہی تھی اور عرشے پر گانٹھوں، بنڈلوں، بکسوں وغیرہ کا ڈھیر اس طرح بڑھتا جا رہا تھا جیسے ان کو ایک اتھاہ گہرے غار سے نکالا جا رہا ہو اور ان کا کبھی خاتمہ نہ ہونے‌والا ہو۔ اسٹیمر چاہے جتنا ہی بڑا کیوں نہ معلوم ہوتا ہو لیکن جہاز کے اندر سامان رکھنے کے ان گوداموں کے زبردست حجم کا اندازہ لگانا مشکل تھا جو پانی کی سطح سے نیچے تھے۔

سورج بلند ہوتا گیا۔ سائے عمارتوں کی طرف رینگنے لگے۔ وہ چھوٹے اور ٹھنگنے ہوتے جا رہے تھے۔ گرمی اب زیادہ ہو گئی۔ ایک ہلکی نازک لہر سمندر کی سطح کو ہلاتی ہوئی دور جا کر نیلے آسمان میں ضم ہو گئی جو اس سے ملنے کے لئے نیچے جھک آیا تھا۔ سفید سفید سمندری مرغابیاں کاغذ کے ٹکڑوں کی طرح معلوم ہو رہی تھیں اور آہستہ آہستہ ہلکورے لیتے اور چمکتے سمندر پر مچھیروں کی کشتیاں اکا دکا سیاہ دھاریاں جیسی دکھائی دے رہی تھیں۔ بجرے اور کشتیاں سب گودیوں میں گڈمڈ تھیں۔ ساحل پر اوندھی کشتیوں کے پھٹے پیندے آسمان کی طرف تھے۔ آوازوں کی چیخ پکار، زنجیروں کی جھنکار

9*

اور شور، دخانی انجنوں کی بھپ بھپ، اسٹیمروں کے بھونپوؤں کی متواتر ھانک پکار، آوازیں، گیت اور گالیاں سب آوازوں پر حاوی تھیں۔ چھوٹے شہر سے، جو ساحل پر پھیلا تھا گاڑی کے پہیوں کی گھڑگھڑاھٹ کی آواز آ رھی تھی۔ اس کے اوپر بلند پہاڑ اس طرح خاموش کھڑے تھے جیسے کسی گہری سوچ میں ھوں۔

جہازی قلیوں نے سب سامان اتار لیا تھا لیکن ان کو آرام کہاں نصیب ھو سکتا تھا، اب ان کو سامان لادنا تھا۔ لوھے کی سلاخوں، تختوں، اناج کے بوروں اور شراب کے پیپوں کے ڈھیر گودی میں پڑے اپنی باری کا انتظار کر رھے تھے۔ تھکے، پسینے میں شرابور آدمی پھر گودی سے جہاز پر دوڑنے لگے، پھر زنجیر کی جھنکار ھونے لگی، پھر زنجیر جہاز کے گوداموں کے کھلے جبڑوں میں گرنے اور اٹھنے لگی جو ھر چیز کو نگلتے چلے جا رھے تھے۔ بالا کپی گھوم رھی تھی اور ''رکو''، ''اوپر''، ''نیچے'' کی یکساں آوازیں پھر آنے لگی تھیں۔ سورج اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا اور اپنی خیرہ کن کرنیں چمکتے سمندر، اسٹیمروں، گودیوں، ساحل پر جابجا پھیلے ھوئے چھوٹے چھوٹے سفید مکانوں اور ان پہاڑوں پر برسا رھا تھا جن کی چوٹیاں نارسا رفعتوں کو خاموشی سے گھور رھی تھیں۔

(۲)

وہ تقریباً تین سال کی تھی۔ ننھی سی بچی جس کی آنکھیں نیلی اور بال سن جیسے تھے۔ وہ سوتی فراک اور ننھے منے زرد سلیپر پہنے تھی۔ گودی پر ادھر ادھر دوڑتی ھوئی صاف دھوپ میں وہ گلاب سی لگ رھی تھی۔ وہ بنڈلوں، بوروں اور پیپوں کے ڈھیروں پر چڑھ گئی، زمین پر پھیلے ھوئے کنکروں پتھروں سے کھیلتی رھی اور پھر آنکھیں الٹے ھاتھوں سے اس طرح ڈھک لیں جیسے دھوپ سے تکلیف ھو رھی ھو اور باریک، دلکش آواز میں پکار کر کہنے لگی:

''میں امی کے پاس جاؤنگی۔''

گودی پر کوئی بھی نہ تھا۔ اناج کے بورے، لوھے کے ڈھیر اور لٹھے سب بے حس و حرکت تھے، سمندر چمک رھا تھا۔

''میں امی کے پاس جاؤنگی۔''

پھر یہ باریک آواز عجیب انداز میں گودی اور اس پانی پر گونجی جو غنودگی کے عالم میں گودی سے ٹکرا رہا تھا اور وہاں سے اڑ کر ایک اوندھے بجرے کے سائے میں جا پہنچی جو ساحل پر پڑا تھا، جس کا پیندا بالکل سڑا ہوا تھا اور جس کے اندر سے واقعی بڑے شاندار خراٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ گھونگھریالے بالوں‌والا ایک سر بے حس و حرکت زمین پر پڑا تھا اور بظاہر وہ اس پہاڑ جیسے جسم سے الگ معلوم ہوتا تھا جو اونچا اٹھا ہوا تھا۔ چوڑا، بالوں بھرا سینہ خراٹوں کے ساتھ جھٹکے کھا کھا کر تھرا رہا تھا۔ ننگی، ٹیڑھی اور غیر معمولی موٹی گردن کی ابھری ہوئی نسیں برابر پھڑک رہی تھیں اور دو بدقطع اور بے‌ڈھنگی سٹھیاں پھیلے ہوئے بازوؤں کے سروں پر بوجھل اور خاموش پڑی تھیں۔

اس بے‌حس و حرکت جسم کے پاس ایک تاتار اس سے قطعی بے‌نیاز بیٹھا تھا۔ تاتار کے کان باہر نکلے ہوئے تھے اور اس کا چمکدار اور صاف منڈا ہوا سر داغوں سے لپا ہوا تھا۔ وہ آلتی‌پالتی مارے بیٹھا تھا اور آگے پیچھے ہل‌ہل کر ہلکے ہلکے گنگنا رہا تھا۔ اس کی غم‌انگیز اور یکساں سن مناھٹ یا تو کوئی گیت تھی یا مناجات۔ وہ تال سر کے ساتھ سوئی تاگے سے اپنا پتلون سی رہا تھا۔

اور دو شخص تاش کھیل رہے تھے۔ ایک لڑکا جس کا چہرہ جھائیں‌دار اور شراب کے نشے سے پھولا معلوم ہوتا تھا۔ اس کا سینہ چپٹا تھا۔ دوسرا ایک لمبا، بے‌ڈھنگے جسم کا پھٹیچر پہاڑی تھا جس کے سنولائے ہوئے چہرے سے لالچی آنکھیں جھانک رہی تھیں۔ اس کے خدوخال خوبصورت تھے لیکن ان سے عیاری اور حرص ٹپکتا تھا۔

”ادھر پیسے دو۔“

”کیا مطلب؟ اپنے تاش دکھاؤ۔“

”نقدی ادھر دینا۔ میں نے کہا نا کہ تم ہار گئے، پیسے دو۔“

پہاڑی کے عیار خدوخال نفرت سے جل اٹھے۔ اس کی عقاب جیسی ناک کے نفیس ترشے ہوئے نتھنے پھول گئے اور اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

”پیسے دو!..“ یہ الفاظ دانت کٹ کٹا کر کہے تھے جو اس کی مونچھوں کے نیچے سفید سفید چمک رہے تھے۔ اس کا سوکھاسہما اور لچکدار جسم دھمکی کے انداز میں آگے جھکا۔

لڑکے نے اس کو پانچ کوپک پھینک دئے۔
''حرامی!..''
وہ زمین پر بیٹھے اپنے بےحد گندے اور پھٹے پرانے تاش کھیل رہے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی چالوں کو بڑی حریصانہ نگاھوں سے دیکھتے۔ دھوپ کے دھبے بجرے کے سڑے پیندے کے اندر گھس کر چپکے سے زمین پر آ گئے تھے۔ تاتار کی غمناک آواز اور خراٹوں کی کان پھوڑ دینےوالی غراھٹ سنائی دے رہی تھی۔
''میں اسی کے پاس جاؤنگی۔''
تاتار نے منڈا ھوا سر اٹھایا۔ اس کے کان دو مختلف سمتوں میں لگے ھوئے تھے۔
''سنو، کوئی بچہ چیخ رہا ھے۔''
بےحس و حرکت جسم میں جنبش ھوئی، خراٹے بند ھو گئے، فضا میں عجیب سی خاموشی پھیل گئی اور خراٹوں کی جگہ گودی اور شہر سے آنےوالی آوازوں نے لے لی۔ پھر وہ زبردست منہ کھلا اور اس نے اتنی زبردست جماھی لی کہ سڑے ھوئے بجرے میں دھوپ کی وجہ سے جو دراڑیں پڑ گئی تھیں ان سے لکڑی کا برادہ جھڑنے لگا۔
''واسکا، کیا کچھ وادکا باقی ھے؟''
''تمھاری چال۔''
''ھاں میری، حکم کا غلام۔''
اسٹیمر سیٹی کی آواز سمندر سے آئی۔
''ھمارا تو نہیں ھے، ھے نا؟''
پہاڑی نے ھاتھ کو آنکھوں کی اوٹ بنا کر سمندر کی طرف دیکھا جو ایک چمکدار میدان کی طرح افق تک پھیلا ھوا تھا۔
''ھمارا نہیں ھے۔ ازوف کمپنی کا ھے۔''
''امی... امی کہاں ھیں۔''
پیمین کے دیوپیکر جسم نے ایک لوٹ لگائی۔
''یہ کوئی بچہ ھے؟ یہاں کیسے آیا؟.. کیسی خراب بات ھے، وادکا نہیں رھی۔''
''میں کہتا ھوں کہ کوئی بچہ رو رہا ھے۔''
''بچہ یہاں کیسے آتا؟''
تاتار نے دانت سے تاگا کاٹا، اپنی پتلون پہنی اور کھڑا ھو گیا۔

''چھوٹا بچہ پانی میں گر کر ڈوب جائیگا۔ تم دیکھ کیا رہے ہو؟ ''

وہ لڑکی کے پاس گیا اور اکڑوں بیٹھ کر زبان سے ٹک ٹک کرنے لگا۔

''ارے، کتنی بڑی لڑکی ہے، کیسی پیاری!..''

''اسی کے پاس جاؤنگی۔ ''

پیمین اور پہاڑی بھی ان کے پاس آ گئے اور واسکا بھی آ گیا لیکن وہ اپنی بےفکری دکھانے کے لئے گھورتا اور جماھیاں لیتا رہا اور اس طرح منہ بنایا جیسے اسے ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پیمین بھی بیٹھ گیا اور سوکھاسہما گندہ ھاتھ بڑھا کر کہنے لگا:

''ادھر آؤ، بیٹی، تمہارا نام کیا ہے؟''

زمین پر دھرا ھوا بھاری، بےڈھنگا جسم اور اس پر بڑا سا، بالدار سر، بھاری بھرکم آواز اور بڑے بڑے کالے ھاتھ ایسے ڈراؤنے تھے کہ لڑکی نے اپنی آنکھیں موند کر زور زور سے چیخنا شروع کیا۔ اس کی باریک آواز اتنی تیز تھی کہ پیمین اس کے پاس سے ہٹ گیا۔

''آہ، یہ شیطان کیسی میری جان کو آ گئی!''

''تمہاری جان کو آ گئی، خبطی؟ دیکھتے نہیں ھو کہ وہ کیسی سہم گئی ہے'' تاتار نے اپنے ساتھی کو ایک طرف ڈھکیلتے ھوئے کہا۔

''سور مونھے، وہ تم ھی سے تو ڈر رہی ہے۔ ''

گودی سے چوکیدار آ گئے۔

''یہ لڑکی کہاں سے آئی؟''

''ھمیں کیا معلوم — شہر سے آئی کہ جہاز سے۔ یا تو وہ کھو گئی ہے یا کوئی اسے بھول گیا ہے یا چھوڑ گیا ہے... اس کو اتنی سمجھ تو ہے نہیں کہ اپنا پتہ بتا سکے۔ ''

ننھی سنی بچی نے جب اپنے کو اجنبیوں سے گھرا پایا تو چہرہ ھاتھوں سے ڈھک لیا۔ اس کی ھتھیلیاں اوپر تھیں جیسے کوئی سہمی ھوئی چڑیا اپنے کو پروں سے ڈھک لیتی ہے۔ اس کا ننھا سنا سینہ ھانپ کانپ رہا تھا اور ھاتھوں کے نیچے سے صاف شفاف آنسو گر رہے تھے۔ وہ زور سے نہیں رو رہی تھی بلکہ صرف سسکیاں بھر بھر کر چپکے سے کہہ رہی تھی:

''امی... امی...''

"کتنی ننھی سی ہے..."

"اسی طرح تو لوگ بچوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ عورت اسٹیمر پر چلی گئی اور بچی کو چھوڑ گئی۔"

"شاید وہ بھول گئی ہو، اب غالباً سمندر پر پہنچ کر وہ بدحواس ہوئی ہو اور لوگ جہاز واپس لانے پر تیار نہ ہوئے ہوں۔"

"ہمیں اس کو پولیس کے پاس لے جاکر اطلاع کرنا چاہئے۔"

"پولیس کیوں؟" تاتار نے اس خیال سے گھبرا کر کہا۔ "تم خود پولیس کے پاس جاؤ۔ اس ننھی سی جان کو کیوں پولیس کے پاس لے جاؤ؟"

وہ بجرے کے اندر ذرا دیر کے لئے گھسا اور پھر خوشی خوشی ایک شکر کا ٹکڑا جو ہر طرف سے کترا ہوا تھا اپنی انگلیوں میں پکڑے ہوئے باھر آیا۔ بچی کسی طرح شکر لینے پر تیار نہیں ہوئی۔ وہ لمبی لمبی، دبی سی دل‌خراش سسکیاں لے کر روتی رہی۔

تاتار نے لڑکی کو گود میں لے لیا۔ اس کا پورا جسم پتی کی طرح کانپ رہا تھا۔ کمزور اور تھکی ہوئی بچی اس کے کندھے سے لگ گئی۔ ان دونوں سروں کو یکجا دیکھ کر عجیب کیفیت پیدا ہوتی تھی۔ ایک چھوٹا سا، گھونگھریالے، سنہرے بالوں والا سر اور دوسرا بڑا سا ڈراؤنا جو خوب تنی ہوئی سیاہ داغدار کھال سے منڈھا تھا اور کان باھر لٹک رہے تھے۔

"ارے بھائیو، لڑکی تو تاتار کے لئے چھوڑ گئے ہیں۔"

"اسی لئے کپتان کی بیوی پر اس کی آنکھ تھی۔"

"وہ ہر عورت کو لبھا سکتا ہے، خالی اس کا پتلون ہی پھٹا پرانا ہے۔"

"اس نے پتلون سی لیا ہے... گھنٹوں بیٹھا سن‌سناتا رہا ہے..."

"وہ عورتوں کے کام کا آدمی ہے۔ بچوں کو باپ مل رہا ہے... رات تک غالباً کوئی لڑکا بھی مل جائیگا۔"

"ھا، ھا، ھا... ھو، ھو، ھو..."

"تم جو چاھے بکو... مسخرہ‌پن کرو... ممکن ہے کہ اس کی ماں بازار یا شہر چلی گئی ہو... وہ آکر کہیگی: 'بچی کہاں ہے؟' اور میں کہونگا: 'یہاں آؤ، تمہاری بچی یہاں ہے'۔ اور وہ کہیگی: 'شکریہ، احمد، یہ لو ایک روبل، جاؤ، ہماری صحت کے لئے ایک جام

پیو - ننھی بچی پانی میں گر جاتی لیکن تم نے اس کو ڈوبنے سے بچا لیا...، اور میں جا کر جام چڑھاؤنگا - تم بکتے ھی رہ جاؤگے...،،

''یہ سور سونہا، بہت چالاک ھے،، جھبرے سروالا پیمین غرایا - ''تاتار وہ بھلے ھی ھو لیکن کبھی کبھی تو وہ عیسائیوں کی طرح سمجھداری کی بات کرنے لگتا ھے - کیا صرف تم نے تنہا اس کو دیکھا تھا؟ ھم سب نے اس کو ایک ساتھ دیکھا تھا اور ایک ساتھ جام بھی چڑھائیں گے - ،،

''ھاں، اور میں بھی اندھا نہیں ھوں،، واسکا نے اپنی سن‌سناتی ھوئی آواز میں کہا - ''میں سو نہیں رہا تھا - ،،

بچی خوف اور رونے کی وجہ سے تھک کر سو گئی تھی - تاتار نے اس کو بجرے کے نیچے چند چیتھڑوں پر لٹا دیا - سب لوگ بیٹھ کر اس کی ماں کی واپسی کا انتظار کرنے لگے لیکن وہ نہ آئی اور اس کے بجائے ایک اسٹیمر آگیا جس پر سے ان لوگوں کو سامان اتارنا تھا -

ایک مرتبہ پھر آھنجے چیخنے لگے، زنجیریں کھڑکھڑائیں اور تاریک جہازی گوداموں سے پلندے اور بکس نکلنے لگے - ''اوپر!،، ''نیچے!،، اور ''رکو!،، کی یکساں اور اکتا دینےوالی آوازیں پھر آنے لگیں -

انھوں نے شام تک اسٹیمر سے سارا سامان اتار لیا اور تاتار بجرے کی طرف بھاگا - وھاں سے باریک، غمناک سسکیوں کی آواز آ رھی تھی - بچی بیٹھی ھوئی آنسوؤں سے تربتر چہرہ ننھی سنی مٹھیوں سے پونچھ رھی تھی -

''بیٹی، رو کیوں رھی ھے؟ مت رو، آں، آں، مت رو، خدا کے کانوں کو اس سے تکلیف ھوتی ھے- ،،

تھکے ماندے، گندے، پسینے میں تر اور مضمحل پیمین اور پہاڑی بھی ان کے پاس آ گئے -

''تم نے یہ روگ پالا ھے، اب بتاؤ اس کا کروگے کیا؟،،

تاتار پریشانی کی حالت میں چپکا کھڑا تھا - بچی بڑی بے چارگی کے عالم میں سسک رھی تھی -

''ارے لمبے کان والے شیطان کے بچے... میں اس کی ٹانگ پکڑ کر پھینک دونگا... تمھیں اس کے ٹکڑے بھی نہ ملیں گے! اسے پولیس میں لے جاؤ ورنہ رات بھر یہاں چلائیگی،، -

''تم کس پر تاؤ دکھا رہے ہو؟ بھلا کہیں رات میں کوئی پولیس کے پاس جاتا ہے؟ یوں تو تم بھاری بھرکم احمق ہو لیکن سر تمہارا بہت چھوٹا ہے۔ اب تم ایک ساتھ وادکا پینا نہیں چاہتے۔''

تاتار اکڑوں بیٹھ گیا اور اپنی زبان سے دو مرتبہ کٹ کٹ کی۔

''اے بٹیا، اے، میری بڑی سی بٹیا!''

لڑکی سسکیاں لیتی اور صرف ایک لفظ کہتی رہی:

''امی... ا... می...''

واسکا روٹی، مچھلی، کھیرے، پانی اور وادکا لایا اور سب نے زمین پر ایک حلقے میں بیٹھکر رات کا کھانا شروع کیا۔ تاتار نے کچھ روٹی توڑکر بچی کو دی جو اس نے جلدی سے بلاچبائے نگل لی۔ جہازی قلی خاموشی سے کھاتے رہے۔ انھوں نے ڈٹ کر کھایا اور اپنے مضبوط دانتوں سے سخت اور سوکھی مچھلیاں نوچتے رہے۔ وادکا کی بوتل ختم ہوتے ہوتے ان کی زبانیں قینچی کی طرح چلنے لگیں اور ان کے مزاج میں نرمی آگئی۔ پیمین نے اپنا پھٹا پرانا اور چکٹا ہوا بھیڑ کی کھال کا کوٹ دے دیا جس پر تاتار نے بچی کو لٹا دیا۔ آدھی رات کو وہ پھر جگائے گئے اور صبح چار بجے تک کام کرتے رہے۔

دوسرے دن تاتار نے جگتے ہی شہر کی طرف دیکھا اور پھر گودی کی طرف جہاں جہاز آتے تھے۔ اس کو یہ امید تھی کہ بس کوئی آکر بچی کے متعلق پوچھےگا لیکن مسافر بھی جہاز سے اترے اور لوگ شہر سے بھی آئے، پھر بھی کسی نے اس بات کا ذکر تک نہ کیا کہ کوئی بچہ کھو گیا ہے۔

''آج شام کو اسے پولیس میں جانا چاہئے'' تاتار نے اپنے آپ سے کہا۔ لیکن ہوا یہ کہ وہ بچی کو پولیس میں نہیں لے گیا پھر بھی اس کو ہلکی سی امید تھی کہ کچھ نہ کچھ ہو کر رہیگا۔

دو دن گزرگئے۔ لڑکی اپنے نئے ماحول سے مانوس ہو گئی اور تمام دن اس کی آواز بجرے کے اطراف میں گونجنے لگی۔ اور جہازی قلی بھی اس سے مانوس ہو گئے خصوصاً بڑا، بھدا اور نرم دل پیمین۔ وہ اس کے لئے سفید روٹی اور وادکا کی بوتل میں دودھ لایا جس سے وادکا کی مہک آ رہی تھی اور جس کے پینے کے بعد بچی دیر تک بےخبر سوتی رہی۔ جب وہ خوش ہوتا تو بچی کو اپنے دیو جیسے جسم پر چڑھنے دیتا اور بچی بھی اس طرح چڑھتی جیسے پہاڑ پر چڑھ رہی ہو۔

واسکا اپنی بک بک میں کہتا کہ تاتار اپنے لئے حرم تیار کر رہا ہے اور پہاڑی بچی کی طرف ذرا بھی توجہ نہ کرتا جیسے وہ بالکل کوئی نکمی چیز ہو — بچی ان دونوں سے ڈرتی اور الگ الگ رہتی۔

(۳)

ڈوبتے سورج کی ترچھی کرنیں بجرے کے اندر پہنچ کر پیمین کے بھاری جسم کو روشن کر رہی تھیں جو پیٹ کے بل لیٹا ہوا ہاتھ سے سگریٹ بنا کر پی رہا تھا۔ تاتار آلتی پالتی مارے اس کے برابر بیٹھا تھا۔ واسکا اور پہاڑی ہمیشہ کی طرح تاشوں میں مست تھے۔ بچی کھچی سوکھی مچھلیاں، کھیرے کے چھلکے اور وادکا کی ایک خالی بوتل برابر پڑی تھی۔

''پانچواں سال ہے،، پیمین نے وسیع سمندر کو گھورتے ہوئے اس طرح کہا جیسے سوچ رہا ہو۔ ''اور میں پیچھا نہیں چھڑا پاتا... جیسے پھنس گیا ہوں اور میرے خاندان والے انتظار کر رہے ہیں...،،

وہ رکا اور اپنے پھیپھڑوں سے ہوا اتنے زور سے نکالی کہ لوہار کی دھونکنی یاد آ گئی خصوصاً اس وقت جب ہینڈل چلانا بند کر دیا جاتا ہے اور آہستہ آہستہ دھونکنی بیٹھ جاتی ہے۔

''اور میں یہاں صرف گرمیوں بھر کے لئے آیا تھا کہ کچھ فارم کا انتظام ہو جائے۔ اب مجھے لڑکے سے آراضی کا بٹوارہ کرنا ہوگا۔ غالباً لوگوں نے میرا انتظار کئے بغیر اس کی شادی کر دی ہوگی... یہ زندگی کیسی ہے، آدمی یا جانور کسی کے لئے بھی تو اچھی نہیں، نہ ٹھکانے کا کام اور نہ ٹھکانے سے آرام۔ وقت تو کوئی چیز ہی نہیں۔ اب تو ہل جوتنا اچھا رہےگا یا پنج آنگر لے کر کام کرنا... ا... و... ہ...،،

اس کی گھٹیا تمباکو کی سگریٹ تیزی سے چھوٹی پڑنے لگی، اس میں کبھی کبھی کوئی ننھی سی چنگاری بھڑک اٹھتی۔

''میں تیس روبل بچا کر گاؤں چلا جاؤنگا۔ وہاں غالباً لوگ مجھ سے ہاتھ دھو چکے ہیں... پانچ سال سے میری خبر نہیں ہے ان کو۔ سب لوگ حیرت میں رہ جائیں گے اور خوش ہوں گے اور پھر ہم بیٹھ کر سگریٹ پیئیں گے... میرا خاندان کافی بڑا ہے، لڑکے کی غالباً شادی

ہو چکی ہو، اب لڑکی کی شادی کرنے کا وقت ہے اور بچہ چار سال کا ہوگا کیونکہ جب میں آیا تھا میری بیوی امید سے تھی ... لیکن یہاں سے چھٹکارا پانا مشکل ہے...،،

اور پھر دھونکنیاں آہستہ آہستہ آواز کرتی ہوئی بیٹھ گئیں۔

''میں صرف گرمیوں میں گھر جاتا ہوں،، تاتار نے کہا جو بے توجہ ہی سے اپنے ساتھی کی بات سن رہا تھا۔ ''بیوی کھیت پر اکیلی کام کر سکتی ہے، دو گھوڑے اور تین گائیں ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ تین بھیڑیں خرید لیں۔،،

موٹا پیمین اٹھ کر بیٹھ گیا اور غصہ سے کہنے لگا:

''کافر، شیطان کہیں کے! اپنے کو دوست کہتے ہو؟ شراب نہیں پلا سکتے۔ کنجوس کہیں کے۔ بس پیسے ملتے ہی سیدھے ڈاک خانے پہنچتے ہو۔ سور کہیں کے۔ ایک مرتبہ بھی اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر شراب نہیں پی سکتے۔،،

''تم مجھ پر اس طرح کیوں غرا رہے ہو؟ شراب‌خانہ تو بس تمہارا گھر بن گیا ہے۔ مجھے ایسے گھر کی ضرورت نہیں۔ میں ایک مرتبہ پیتا ہوں اور باقی رقم گھر بھیج دیتا ہوں۔ گھر پر لوگ میرا انتظار کرتے ہونگے۔ ارے۔ کیسے تڑپتے ہونگے! چھوٹی بچی گھر پر میرا انتظار کرتی ہوگی۔،،

اس کی چھوٹی آنکھیں اور تنگ ہو کر لکیریں سی رہ گئیں اور اس کے چہرے پر جھریاں آگئیں۔ اس نے قریب کھیلتی ہوئی بچی کو دیکھا۔ وہ جہازی قلیوں کی نقل کر رہی تھی۔ وہ پیٹھ پر چیتھڑوں کا ایک بنڈل لئے تتلا تتلا کر وہ گالیاں دھرا رہی تھی جو دن بھر سنتی تھی۔ دن گزرتے گئے اب یہ لوگ اس کو پولیس میں لے جانے کا ذکر نہیں کرتے تھے اور یہ بھی بھول گئے تھے کہ ان کو کسی کے آنے اور انعام پانے کی امید تھی۔

''ارے کیا تم اس گھوڑے کا گوشت کھانے‌والے سے کچھ پانے کی امید رکھتے ہو؟،، واسکا نے تاش کا کھیل روکتے ہوئے کہا۔ ''تاتار سور، کافر کی طرح اکیلا اکیلا چڑھاتا ہے۔ ایک ادھا پی کر یہ سوچتا ہے کہ کہیں زیادہ تو نہیں پی گیا!.. کافر!..ایک نہلا... پیسے دو!،،

تاتار نے پیٹھ کھجائی، جماھی لی، سمندر کی طرف دیکھا اور پھر ایک کونے میں سونے کے لئے رینگ گیا۔ پیمین نے اپنے لئے ایک اور سگریٹ بنائی۔

(۴)

ھلکے ھلکے ھلکورے لیتا ھوا سمندر صبح کے سفید دھندلکے میں جو افق پر ابھی تک باقی تھا چھپ گیا تھا اور اوپر سورج سمندر کی چمکدار سطح کا جائزہ لیتا معلوم ھوتا تھا۔

حالانکہ سمندر پر کچھ بھی نہ تھا بس ایک پرسکون اور چمکدار پانی کی چادر پھیلی تھی، لیکن بےپایاں مسرت اور جوانی پوری فضا پر طاری تھی اور ایسا معلوم ھوتا تھا جیسے کوئی خاموشی، پرمسرت نغمہ لامحدود نیلے سمندر، سورج اور نئے دن کا خیرمقدم کرنے کے لئے آگے بڑھ رھا ھے۔

ایک عجیب آواز، ایک ایسی آواز جو پہلے سمجھ میں نہیں آ رھی تھی ساحل پر پھیل گئی۔ وہ بہت دور سے اس دھوئیں جیسے دھند کی سمت سے آئی تھی، ایک پراسرار آواز، گریزاں اور پرفریب، کسی ان کہی بات کی طرف اشارہ تھا کسی اسرار کی طرف۔ یہ آواز پھر ھوئی۔ اس مرتبہ زوردار تھی جس نے فضا پر زیادہ اثر کیا۔ اس کا سلسلہ دیر تک نہیں ٹوٹا، پھر فاصلے نے اس کو کمزور کر دیا لیکن کیتلی کی سنسناھٹ کی طرح برابر اور یکساں آواز آتی رھی جس سے یہ خیال پیدا ھوتا تھا کہ پراسرار دھند کے پیچھے ایسی جاندار ھستیاں تھیں جو صبح کی مسرتوں کو محسوس کرتی تھیں اور قریب آ کر اپنی موجودگی کا اظہار کر رھی تھیں۔

ساحل پر لوگ کہہ رھے تھے:

”ایگور، آ رھا ھے۔“

سفید دھند کے اندر سے ایک سیاہ دھبہ ظاھر ھوا اور یہ کہنا مشکل تھا کہ یہ کیا چیز ھے — کوئی چڑیا اور سمندر میں بہتا ھوا لٹھا یا محض فریب‌نظر۔ رفتہ رفتہ یہ دھبہ بڑھنے لگا اور بڑھ کر اس نے شکل اختیار کر لی۔ مستولوں کے پتلے پتلے خطوط دکھائی دئے، ایک ننھی سنی کھلونے جیسی سیاہ چمنی نظر آئی جو خوب زوروں میں دھواں اگل رھی تھی۔

سورج نے سمندر کی گہرائیوں کو نہلا کر خوبصورت بنا دیا تھا۔ وہ اپنی آب‌وتاب دکھا رہا تھا اور اس کی خیرہ کن کرنیں پانی میں غوطے لگا رہی تھیں۔ سورج، گرمی اور نئے دن کی خوشی نے دھند کو جلد ہی شکست دی۔

دھند کے بالکل غائب ہو جانے کے بعد پورا سمندر افق تک نظر آنے لگا جہاں وہ آسمان سے مل گیا تھا اور سمندر کے اوپر ایک بےڈھنگی بھاری آواز گونج اٹھی جس کا صبح کی تازگی سے کوئی تعلق نہ تھا اور اس میں ذرا سی بھی دلکشی اور جاذبیت نہ تھی۔ یہ بھدی اور بھرائی ہوئی آواز زور سے گرجی اور صبح کے نغمے کو چیرتی چلی گئی۔ وہ صرف ایک بات کا اعلان کر رہی تھی کہ دنیا میں تھکا دینےوالے بھاری اور متواتر کام کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ جن لوگوں کو یہ بات یاد دلائی گئی تھی وہ نکل کر ساحل پر آ گئے۔

تاتار سعہ اپنے منڈے سر اور باہر نکلے ہوئے کانوں کے موجود تھا اور واسکا کا شرابی چہرہ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ پہاڑی اور پیمین بھی موجود تھے۔ پیمین کا جھبرا اور بھاری جسم اس کی پھٹی قمیص اور پتلون سے جھانک رہا تھا۔ ایک ننھا، تیز، شوخ اور رنگین دھبا ساحل پر دوڑ رہا تھا اور ایک باریک تتلاتی ہوئی آواز بھدی آوازوں، بےتکی باتوں، گالیوں اور قہقہوں کے درمیان سنائی دے رہی تھی۔

اسٹیمر قریب آتا نہیں معلوم ہوتا تھا لیکن بڑھ کر بڑا ہو رہا تھا۔ وہ بڑھ کر موٹا اور بھاری ہو گیا اور آخر میں ایک دیو بن گیا۔ چمنی بھی پھول کر بڑی ہو گئی اور لہراتا ہوا سیاہ دھواں اگلنے لگی۔ مستول بھی پھول گئے اور بڑھ کر صاف نیلے آسمان تک پہنچ گئے۔ بریکٹوں سے لٹکی ہوئی سفید کشتیاں دکھائی دینے لگیں۔ کٹھرے کے قریب کھڑے ہوئے مجمع میں لوگ چھوٹے چھوٹے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ عرشے پر چل رہے تھے یا دیدبان پر خاموش کھڑے تھے۔ پہیہ رک گیا اور دیوپیکر جہاز ایک زبردست سفید لہر ساحل کی طرف ڈھکیلتا ہوا خاموشی سے آگے بڑھا۔

جہاز کے پہلوؤں سے لکڑی کے گیند اڑے اور ان کے پیچھے پتلی رسیاں چلیں، ان کو گودی پر لوگوں نے پکڑ لیا جو منتظر کھڑے تھے اور رسیوں کے سرے پانی میں جا گرے۔

دل‌خراش اور جنوں انگیز چیخوں نے اس خاموش اور پراشتیاق فضا کو توڑ دیا جو عموماً گودی پر طاری رہتی تھی اور جہاز کے لنگر باندھنے کے عام کام میں خلل انداز ہونے لگیں۔ ایک عورت جس کو ملاحوں نے اپنے مضبوط بازوؤں میں پکڑ رکھا تھا کشمکش کر رہی تھی کہ کسی طرح چھڑا کر جہاز سے کود پڑے اور اس کی چیخوں کا جواب ساحل سے ایک بچے کی تیز اور پرمسرت آواز دے رہی تھی:

''امی، امی...''

پہیہ الٹی طرف گھوما اور پانی کو متھ دیا۔ جہاز کا بڑا سیاہ جسم گھوما اور اس گودی کے برابر رک گیا جس کی طرف اس کو رسوں سے گھسیٹا گیا تھا۔

جہاز کا پل نیچے تک کھول دیا گیا اور وہ عورت ہنستی، روتی، آنسوؤں سے چہرہ متورم ساحل کی طرف جھپٹی۔ اس نے بچی کو پکڑ لیا جس کے منہ سے صرف ایک لفظ نکل رہا تھا:

''امی، امی۔''

ان کے گرد ایک مجمع ہو گیا۔

''اس کو بچی مل گئی!''

''یہ تو رنج سے پاگل ہو گئی تھی، جب اس نے دیکھا کہ بچی غائب ہے تو اس نے سمندر میں کودنے کی کوشش کی۔ اس کا خیال تھا کہ بچی ڈوب گئی۔ وہ بالکل سڑن ہو گئی تھی۔''

''ماں ہے ماں، تعجب کی کیا بات ہے۔''

قریب گندہ تاتار دانت نکالے کھڑا تھا۔

''یہ پورے ہفتے ہمارے پاس رہی۔ اس کو ہم نے کھلایا۔ اس پر بڑا افسوس... پولیس میں کیوں جاتا؟ پولیس میں جانے کی ضرورت نہ تھی... چھوٹی بچی پانی میں گر گئی تھی لیکن میں نے اس کو ڈوبنے نہیں دیا... تم اس کی ماں ہو؟ لڑکی مجھے اتنی سی ملی تھی۔ ہاں، اتنی سی...'' اور اس نے اپنا ایک ہاتھ زمین سے ذرا اوپر رکھا۔

''ماں، ہاں...''

ننھی بچی تتلا رہی تھی اور ماں اس کو پاگلوں کی طرح برابر پیار کئے جا رہی تھی۔

''امی، ہم ان لوگوں کو ساتھ لے جائیں گے۔ بڑے اچھے ہیں

یہ... امی، یہاں بہت سے پتھر ہیں اور پیم چاچا کا اتنا بڑا سر ہے... وہ بہت سے بکس اٹھا سکتے ہیں... امی!..''

وہ برابر تتلا رہی تھی اور اپنی بچکانی باتوں میں بےہودہ الفاظ ملاتی جا رہی تھی، وہ اپنی مضحکہ انگیز بچکانی زبان میں ان الفاظ کو اس طرح بول رہی تھی کہ وہ اور برے اور ناخوشگوار معلوم ہوتے تھے۔ چاروں طرف کھڑے ہوئے لوگ ہنس رہے تھے۔

''تم نے یہ سب باتیں بڑی جلدی سیکھ لیں...''

''بچے یہ سب سیکھ لیتے ہیں...''

''ان کو دعا اور عبادت نہیں آتی لیکن یہ سب سیکھ لیتے ہیں۔''

''ان باتوں کے لئے تو بید کی ضرورت ہے...''

ماں کا چہرہ دھلی چادر کی طرح سفید ہو گیا اور وہ بچی کو خوفزدہ نگاہوں سے گھورنے لگی۔

''ارے حرامزدہ۔ تھو...''

اس نے تاتار کے چہرہ پر تھوک دیا اور بچی کو اپنی گود میں لےکر جہاز پر واپس بھاگ گئی۔ مجمع میں بڑی زور کا قہقہہ پڑا۔

''انعام مل گیا، احمد؟''

''تمہارے اوپر ہماری شراب ادھار ہے، احمد، تم نے وعدہ کیا تھا۔''

''احمد اپنے انعام سے موٹا ہو جائیگا۔ وہ جنٹلمین بن جائیگا۔''

''صحیح طور پر عورتوں کے کام کا آدمی...''

''ذرا اچھی طرح دیکھنا۔ شاید تم کو اور کوئی لاوارث مل جائے، یہ کافی نفع کا کاروبار ہے۔''

''اے، خلاصیو!''

آھنجہ کھڑکھڑایا، زنجیروں کی جھنکار ہوئی اور وہ گودام میں اترتی چلی گئیں۔

''ر... رکو!''

کچھ مسافر اسٹیمر سے اترے اور کچھ بیٹھے۔

''اوپر! نیچے! ر... کو!''

اور سورج اب بھی پوری آب‌وتاب سے روشن اور پرسکون سمندر پر چمک رہاتھا۔ سمندر کی سطح پر ہلکی ہلکی سلوٹیں پڑ گئی تھیں اور وہ دور دور تک پھیلتا چلا گیا تھا۔

۱۹۰۳ء

طوفان

(۱)

''آہ! آہ! آہ!..،، اندریئکا کی تیز چیخیں سمندر کی پرسکون سطح کے اس پار پہنچ رہی تھیں۔ لڑکا کشتی میں پڑا تڑپ رہا تھا۔ ''دادا، اب نہیں کرونگا!،،

دادا کی بھویں بہت گھنی اور سفید تھیں۔ اس کا چہرہ جس پر دھوپ، ہوا اور نمکین پانی سے جھریاں پڑ گئی تھیں چمڑے کی طرح سوکھا تھا۔ وہ ایک ہاتھ سے لڑکے کی گدی پکڑے تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کو تارکول بھری رسی کے سرے سے بری طرح پیٹ رہا تھا۔ پھر اس نے اس کو کشتی کے نچلے حصے میں دھکیل دیا۔ اندریئکا کھڑا سسکیاں لے رہا تھا اور کشتی کے کنارے پر جھک کر بھیگے ہوئے جالوں کو گھسیٹ رہا تھا جو پانی کے اوپر تیر رہے تھے۔

چمچماتے ہوئے سمندر میں ہلکی ہلکی بلوریں لہریں مشکل سے دکھائی دیتی تھیں۔ سورج کافی بلند اور تیز ہو چکا تھا اور اس کی چمک آنکھوں کے لئے تکلیف دہ تھی۔ کشتی کے سیاہ ڈھانچے اور مستول تک آرپار پھیلی ہوئی رسیوں سے تارکول ٹپک رہا تھا، سرنگوں بادبان بھی گرد اور تارکول سے سیاہ ہو رہے تھے، فضا میں سکوت اور گھٹن تھی اور ان سب چیزوں نے مل جل کر ایک واضح اور سیاہ سا خاکہ بنا دیا تھا۔

خشکی کا کہیں پتہ نہ تھا۔

اندریئکا کے چہرے پر غصے سے بل پڑے ہوئے تھے لیکن وہ اب بھی پانی سے جال کھینچ رہا تھا اور پھندوں میں جو مچھلیاں پھنسی تھیں ان کو احتیاط سے نکال رہا تھا۔

رات کے دو بجے جب تارے پھیکے پڑنے لگے تھے تب اندریئکا دادا کے ساتھ ساحل سے چلا تھا۔ وہ ھلکی ہوائیں جو پوپھٹنے سے پہلے چلنا شروع ھوتی ھیں ان کی کشتی کو خاموشی سے سمندر میں لے گئی تھیں۔ جب پو پھٹی، آسمان اور پانی پر گلابی گلابی دھاریاں پھیل گئیں تو پرسکون اور خاموش سمندر افق تک دکھائی دینے لگا اور ھوا دھیمی پڑ گئی۔ ان کو پتواروں سے کام لینا پڑا۔ اندریئکا اور دادا باری باری کشتی کھے رہے تھے۔ پہلے تو اندریئکا آسانی اور آھستگی سے کھیتا رہا لیکن ایک گھنٹہ گذرا، دو گھنٹے گذرے اور اب وہ تھکنے لگا۔ جب وہ اپنا بدن پیچھے پھینک کر شفاف اور رنگا رنگ پانی میں پتوار ڈالتا تو اس کو ایسا معلوم ھوتا کہ پیٹھ اور بازوؤں میں شدیددرد کی وجہ سے اب اس کا بدن سیدھا نہ ھوگا۔ پھر بھی وہ برابر پتوار چلاتا رہا اور کشتی کچھوے کی چال سے آگے بڑھتی رھی۔ دادا برابر کشتی کے پچھلے حصے میں ساکت بیٹھا تھا لیکن آخرکار اس نے کہا:

''اندریئکا، بس کافی ھے!،،

اندریئکا خوشی خوشی ڈگمگاتی ھوئی کشتی کے پچھلے حصہ میں لڑکھڑاتا ھوا چلا گیا اور دادا بلا کچھ کہے پتوار لے کر کشتی کھینے لگا۔ اندریئکا نے سکان سنبھال لیا اور پتواروں سے نکلتے ھوئے پانی کے لمبے لمبے دھارے اور دادا کا مضبوط جسم دیکھنے لگا جو پتوار چلانے میں بڑی لے تال کے ساتھ حرکت کر رہا تھا۔ وہ اپنے چہرے سے پسینہ پونچھ کر آرام کرنے لگا۔

سورج کہیں سمندر کے پار سے بلند ھوا اور پانی کی پرسکون اور ھموار سطح سنور ھو گئی۔ چلچلاتی گرمی کا ایک نیا دن شروع ھو رہا تھا جس میں ھوا کا کہیں نام نشان تک نہ تھا۔

لکڑی کے بڑے بڑے گول کھمبے جن پر جھنڈیاں لگی تھیں جلد ھی پانی کی سطح پر تیرتے نظر آنے لگے۔ یہ مچھلیوں کے جال باندھنے کے کھمبے تھے۔ دونوں ان کھمبوں کے پاس گئے اور کشتی کے کنارے سے ایک رسی کے ذریعہ جو جال کے سرے پر بندھی

تھی جال کو اوپر گھسیٹنے لگے۔ جال کے ساتھ ساتھ کشتی بھی کھنچ رہی تھی۔ یہ جال پانی کے اندر سیکڑوں گز تک چلا گیا تھا۔ اندریئکا کشتی کے کنارے باھر کی طرف کافی لٹکا ھوا تھا اور شفاف پانی سے لطف حاصل کر رہا تھا۔ اس کو جب تب کسی چیز کی جھلک دکھائی دے جاتی تھی جو تڑپ تڑپ کر تیرتے ہوئے جال کو ایک طرف کھینچ رہی تھی۔ یہاں تک کہ ایک مچھلی جس کے گل پھڑے پھندے میں پھنسے ہوئے تھے پانی میں تڑپتی اور پھڑکتی ہوئی سطح پر آ گئی۔ اندریئکا نے اپنی انگلیاں مچھلی کے نچلے نرم اور گلابی گلپھڑے میں پیوست کر دیں اور اسکو جال سے نکال کر کشتی کی تہہ میں پھینک دیا جہاں تھوڑا سا پانی تھا۔ مچھلی درد، خوف اور یاس سے پاگل ہوکر پھڑک رہی تھی اور چاروں طرف پانی اچھال رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھ کہ وہ کس بلا میں پھنس گئی ہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح اس سخت قید سے چھٹکارا پانا چاھتی تھی جہاں وہ اپنے پھٹے اور خون آلود گل پھڑوں کی وجہ سے سانس بھی نہ لے سکتی تھی۔

سورج بلند ھوتا گیا اور جلتے آسمان تلے بےرونق سمندر پر دھوپ نے چکاچوند اور اسس پیدا کر دی۔ اندریئکا جال سے مچھلیاں نکال رہا تھا۔ وہ دھوپ سے پریشان ہو گیا تھا اور وقت گذاری کے لئے مچھلیوں سے باتیں کرتا جا رہا تھا۔

”اے۔ او میری ننھی سی ھیرنگ تو جلد ھی کھاری پانی کی ناند میں پہنچ جائیگی، وھاں تیری تڑپ پھڑک سب دور ھو جائیگی! آ کشتی میں آ، بڑی آئی پھڑکنے والی۔ اوہ، اس کارپ مچھلی کے کتنی چربی ہے۔ آخر تم اتنا چارہ کیوں بھرتی تھیں کہ تمہاری توند نکل آئی۔ آؤ، آؤ، نکلو۔ توندل، زیادہ ضد نہ کرو۔ بھلا مجھ سے بچ کر کہاں جاؤگی! نکلو نا..!،، اور اندریئکا نے ذرا مشکل سے ایک بڑی مچھلی نکالی اور اس کو دونوں ھاتھوں سے پکڑکر اوپر اٹھایا۔

”دادا، یہ دیکھو، اس کی کتنی بڑی توند ہے!،،

دادا ابھی جواب دینے کے لئے منہ بھی نہیں کھول پایا تھا کہ یہ بڑی مچھلی جو ابھی تک بالکل مردہ اور ساکت تھی اپنے کو تازہ ھوا میں پاکر پوری طاقت سے تڑپی اور لڑکے کے ھاتھ سے پھسل

10*

کر پانی میں غڑاپ سے جا رہی - اس کی دم ذرا چمکی اور وہ غائب ہو گئی -

اور پھر اندریئکا کی غمناک چیخیں سمندر کے پار تک گونجنے لگیں کیونکہ دادا کچھ کہے بغیر اپنی جگہ سے اٹھا، تارکول لگی ہوئی رسی کا سرا لے کر کئی مرتبہ لپیٹا اور لڑکے کو بری طرح پیٹنے لگا -

(۲)

اندریئکا کے ماں باپ نہ تھے - اپنی یاد بھر وہ ہمیشہ سے اگافون دادا کے اس چھوٹے سفید گھر میں رہتا آیا تھا جو بڑے بید کے درخت کے نیچے تھا - اس گھر کے ایک طرف سفید ریت اور نیلا سمندر تھا اور دوسری طرف حدنگاہ تک ویران استیپی - استیپی جہاں ایک درخت بھی نہیں نظر آتا تھا - صرف جھلسی ہوئی بڑی بڑی گھاس اور کانٹے دار جھاڑیاں پھیلی تھیں - اس میں موسم بہار کے سیلاب نے جابجا نالے اور گڈھے بنا دئے تھے -

یہ اس واقعہ سے بارہ سال پہلے کی بات ہے - اس وقت بھی اگافون دادا مع اپنے خاندان کے اس گھر میں رہتا تھا جس میں اسکی بیوی اور پانچ بچے تھے - پھر خناق کی وبا پھیلی اور دادا کے پانچوں بچے ایک ہفتے میں ختم ہو گئے -

جاڑے کی رات تھی، اگافون دادا اور اس کی بیوی اسی چھوٹے سفید گھر میں تنہا بیٹھے تھے - تاریک کھڑکیوں سے خوفناک آندھی ٹکرا رہی تھی - اگافون بیٹھا جالوں کی مرمت کر رہا تھا اور اداس اداس کچھ سوچتا جا رہا تھا، اس کی بیوی چولھے کے پاس کام کر رہی تھی - کسی نے کھڑکی کھٹ کھٹائی - اگافون دادا نے دروازہ کھول کر دیکھا تو ایک غربت زدہ بھکارن کھڑی کانپ رہی تھی - وہ برف سے ڈھکی ہوئی تھی - اس کا چہرہ سردی سے سفید اور وحشت زدہ تھا - چیتھڑوں میں لپٹا ہوا ایک ننھا بچہ گود میں تھا - وہ سردی سے نیلا ہو گیا تھا لیکن اب رو نہیں رہا تھا - عورت کے منہ سے ٹھیک بول بھی نہیں پھوٹتا تھا - اس کے ٹھٹھرے ہونٹوں میں جنبش ہوئی اور اس نے ہکلاتے ہوئے رات بھر کے لئے پناہ

مانگی۔ انھوں نے اس کو اندر بلا لیا اور اس کو کھانا کھلایا۔ جب بچہ ذرا گرم ھوا تو پورا گھر اس کی چیخوں سے گونج اٹھا اور اگافون کی بیوی، جو بچے کے پاس کھڑی تھی، اپنے بچوں کو یاد کرکے پیش بند سے آنسو پونچھنے لگی جن کو وہ سپرد خاک کر چکی تھی۔

عورت نے انھیں بتایا کہ وہ اوریل صوبے سے اپنے شوھر کی تلاش میں کوبان جا رھی ھے جو وھاں چھہ مہینہ ھوئے گیا تھا اور پھر اس نے کوئی خط بھی نہیں لکھا۔ اس کے پاس جو کچھ سرمایہ تھا سب ختم کرنے کے بعد اب وہ اس کی تلاش میں نکلی تھی۔ راستے میں وہ بھیک پر گزربسر کرتی رھی۔ کچھ اسٹیشنوں پر اس نے ٹرین کنڈکٹروں کو خوشامد درآمد کرکے اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ وہ اس کو چند اسٹیشنوں تک لیتے چلیں، بعض بھلے آدمیوں نے کہیں کہیں اس کو اپنی گاڑیوں پر بھی بٹھا لیا اور وہ گاؤں گاؤں گھومتی رھی۔ اس طرح وہ ایئسک تک پہنچی تھی۔ اس دن صبح کو وہ ایئسک سے روانہ ھوئی تو استیپی میں راستہ بھول گئی۔ رات آتے ھی آندھی شروع ھو گئی۔ عورت نے تو یہ سمجھ لیا کہ اب موت آن پہنچی لیکن اس کو اس تنہا گھر کی روشنی نظر آ گئی۔

رات کو عورت بیمار ھو گئی۔ اس کے بخار نے سرسامی صورت اختیار کر لی۔ وہ بے چینی سے تڑپ رھی تھی اور چیخیں مار رھی تھی۔ تین مرتبہ اگافون کی بیوی نے اس کو مقدس پانی پلایا اور اس پر چھڑکا بھی لیکن اس کی حالت خراب ھی ھوتی گئی۔ دوسرے دن شام ھوتے ھوتے وہ اس دنیا سے سدھار گئی۔ اگافون اور اس کی بیوی نے اس کا بچہ گود لے لیا۔

اندریئکا کو اس کی منہ بولی ماں ھلکی ھلکی یاد تھی۔ ایک مہربان، معمر عورت جو اس کو نہلاتی تھی، کھانا کھلاتی تھی اور اس جھولے میں جھلا کر سلاتی تھی جو کمرے کے بیچوں بیچ چھت سے لٹکا ھوا تھا۔ اس کو وہ وقت بھی یاد تھا جب وہ چار سال کا تھا۔ کچھ لوگ گھر کے اندر آئے تھے اور اس کی منہ بولی ماں کو اس بنچ سے اٹھا کر جس پر وہ سوتی تھی اس میز پر لٹایا تھا جو بزرگوں کی شبیہوں کے نیچے تھی۔ انھوں نے موم‌بتیاں جلائی تھیں اور پھر اس کو اگافون دادا کے پاس اکیلا چھوڑ کر ماں کو کہیں

لے گئے تھے۔ اس کو یہ بھی یاد تھا کہ جب اگافون دادا سمندر کو جاتا تو وہ اس کو ایک گاؤں پہنچا دیتا جو استیپی کی ایک تنگ گھاٹی میں ساحل سے تین ورسٹ کے فاصلے پر تھا۔ وہ اس کو ایک عورت اسپیریدونیحا ناسی کے پاس چھوڑ دیتا تھا جو دادا کی عزیز تھی۔ جب لڑکا چھ سال کا ہو گیا تو دادا اس کو اپنے ساتھ سمندر لے جانے لگا اور اندریئکا اکثر گھاس کے ایک ڈھیر پر جو دادا نے اس کے لئے وہاں بچھا دیا تھا کشتی کے اگلے حصے میں سونے لگا۔ سمندری چڑیاں اس کے اوپر منڈلاتیں، سورج چمکتا اور پانی کے چھینٹے اس کے سر پر آتے۔

سات سال کی عمر سے اندریئکا نے دادا کے تمام کاموں میں ہاتھ بٹانا شروع کیا۔ دونوں بہت سویرے، تقریباً تین بجے اٹھتے۔ اندریئکا جلدی جلدی اپنے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیتا، اس کو اپنی قمیص سے پونچھتا، آسمان کے اس حصے کی طرف رخ کرکے جدھر صبح کا درخشان ستارہ دمکتا ہوتا اپنے اوپر صلیب کے نشان بناتا اور پھر جلدی دعا پڑھتا۔ وہ دعائے یسوع مسیح اور ''پاک، پاک،، بس، یہی دو دعائیں جانتا تھا۔ پھر اندریئکا سوکھے کنڈے لاکر چولھا جلاتا، آلو چھیلتا اور مچھلیاں صاف کرکے ان کو ابالتا۔ ناشتے کے بعد وہ سمندر پر روانہ ہو جاتے۔

سمندر اور گھر دونوں میں دادا اندریئکا سے مساوی طور پر وہی سب کام لیتا جو وہ خود کرتا تھا۔ بادبانوں کو کھولنا، کھینا، جالوں کی مرمت کرنا، پھیلانا، ان کو گھسیٹنا اور پانی میں ڈالنا اور مچھلیوں کو کانٹوں سے نکالنا وغیرہ۔ اور اندریئکا بھی ہر کام بڑے حوصلے سے کرتا چاہے وہ کام اس کے بس کا ہو یا نہ ہو۔ دادا اندریئکا کو ہر غلطی، بھول چوک یا بےتکےپن پر بری طرح پیٹتا۔ لڑکا سکان غلط لگا دیتا یا بادبان چڑھانے اتارنے میں دیر ہو جاتی، بس دادا کچھ کہے بغیر اٹھتا اور تارکول بھری رسی کا سرا لے کر اس کو بری طرح ادھیڑ دیتا۔ اس کے جسم پر پڑی ہوئی بدھیاں کبھی دور نہ ہوتیں۔ اندریئکا کا چہرہ دبلا پتلا اور دھوپ سے تپا ہوا تھا اور یوں بھی وہ ٹھگنا اور سوکھا سا تھا۔

اس کی زندگی بالکل یکرنگی تھی۔ چاروں طرف سوائے سمندر، آسمان، استیپی اور ساحل کے کچھ نہ تھا۔ ساحل بالکل سنسان اور

ویران تھا۔ پانی کے بہاؤ کی مٹی سے بھرے نالے، ریت کی پٹیاں اور اتھلا سمندر۔ پھر بھی یہ پورا ویرانہ اندریئکا کے لئے بھرا پرا اور آباد تھا۔

میدانی چوھے استیپی میں سیٹیاں بجاتے ادھر ادھر دوڑتے یا کھونٹوں کی طرح اپنے سوراخوں کے پاس بےحس و حرکت سیدھے کھڑے ہو جاتے۔ چیلیں، شکرے اور باز ھوا میں ادھر ادھر جھپٹتے اور ان کے سائے جھلسی ھوئی گھاس پر پڑتے۔ باز ھوا میں ساکت ٹھہر جاتے۔ بس ان کے پر خفیف سے تھرتھراتے رھتے۔ استیپی کے ٹیلوں پر تنہا اور اداس عقابوں کے سیاہ خاکے تیرتے معلوم ھوتے۔ سفید سمندری بگلے جن کی آواز بڑی تیز ھوتی ھے ساحل پر اڑتے رھتے اور جالوں سے کوئی مچھلی باھر اچھلتے ھی ھوا میں دبوچ لیتے اور کبھی کبھی تو مچھیرے کے ھاتھ سے بھی مچھلی اچک لے جاتے۔ بہار اور خزاں میں موسمی چڑیاں غول درغول آتیں اور بڑا ھنگامہ برپا کرتیں۔

دوسری طرف سمندر کی آبادی بہت بڑی اور مختلف تھی۔ اس کے اندر طرح طرح کی مچھلیاں غول در غول تیرتی نظر آتیں۔ ریت میں پن کیڑوں اور کیکڑوں کی کثرت تھی۔ جولائی کے آخر میں سمندر "پھولنے،، لگتا اور رات میں رنگین اور روشن ھو جاتا۔ لہروں کی دھاریں، کشتیوں کے بنائے ھوئے راستے، پتواروں کے پیدا کئے ھوئے حلقے جن کے دائرے برابر وسیع ھوتے جاتے، ساحل پر سمندری لہروں کے خطوط، اچھلتے ھوئے پانی کے فوارے اور سمندر کے پانی کا ھر قطرہ اپنی پرسکون سطح سے بلند ھوکر نیلی روشنی میں چمکنے لگتا۔ اندریئکا یہ محسوس کرتا کہ اس پراسرار، جھلملاتی، آنکھمچولی کھیلنے والی نیلی روشنی کا تعلق کسی آسیبی طریقے سے ان مردوں اور ڈوبے ھوئے آدمیوں سے ضرور ھے جن کی قبر سمندر کی تہہ میں ھے۔

اگافون دادا زیادہ تر خاموش اور اداس رھتا۔ لیکن جب وہ سمندر کے باسیوں کا ذکر چھیڑتا تو اس کے چہرے سے جھریاں غائب ھو جاتیں، اس کی گھنی بھوؤں کے نیچے آنکھوں میں نرمی آ جاتی اور وہ ان کے متعلق کئی کئی دنوں تک متواتر باتیں کرنے کے لئے تیار نظر آتا۔

''دادا، آخر اتنی ساری مچھلیاں آتی کہاں سے ہیں؟ ہم ان کو برابر پکڑتے رہتے ہیں پھر بھی وہ آتی رہتی ہیں۔ اتنے آدمی شکار کھیلتے رہتے ہیں، پتوار پانی میں ڈالنا دشوار ہے۔ ہر جگہ جال پھیلے ہوئے ہیں۔''

''خدا ان کو پیدا کرتا ہے، خدا۔ کیا خدا کے پاس ان کے رہنے کے لئے کافی جگہ نہیں ہے؟ اس کے پاس تو اتنا پانی ہے اور مچھلیوں کی تعداد میں اتنا اضافہ ہو سکتا ہے کہ سب آدمیوں کو رزق مہیا ہو سکے۔''

''کیا مچھلیوں کو معلوم ہوتا ہے کہ لوگ ان کو پکڑتے ہیں؟''

''ہاں ضرور... مثال کے طور پر مچھلیاں اسی طرح باتیں کرتی ہیں جیسے ہم اس وقت کر رہے ہیں، وہ ایک دوسرے سے ملاقاتوں کا ذکر کرتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ کہاں کہاں جال ہیں اور کیسے لگے ہیں۔ وہ اپنی زبان میں باتیں کرتی ہیں جو ہم نہیں سمجھ سکتے... صرف وہ لوگ جو ڈوب گئے ہیں اور سمندر کی تہہ میں پڑے ہیں جانتے ہیں کہ مچھلیاں کیا باتیں کرتی ہیں کیونکہ مچھلیاں ان سے ڈرتی نہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ مردے انھیں دھوکا نہیں دے سکتے، اس لئے وہ آپس میں باتیں کرتی ہوئی ادھر ادھر پیرتی رہتی ہیں''۔

ایسے موقعوں پر اندریئکا کچھ نہ بولتا بلکہ چپکا بیٹھا پھٹی آنکھوں سے دادا کو دیکھتا رہا۔ سمندر کی نیلی گہرائیوں کی تاریکی، دھندلی زرد سمندر کی تہہ اور اس پر ایک آدمی کی پھولی ہوئی لاش، بالکل نیلی اور کھلی گھورتی ہوئی آنکھیں، اس کے چاروں طرف تیرتی ہوئی مچھلیاں، ان کا تھرتھراتے ہوئے گل پھڑوں سے کھاری پانی سڑکنا اور ایک دوسرے سے مختلف واقعات کے متعلق تذکرے کرنا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے یہ سب باتیں پھر جاتیں۔ مچھلیاں اس کے متعلق، اندریئکا کے متعلق باتیں کرتی ہونگی کہ وہ کیسے اوپر کشتی میں اگافون دادا کے پاس بیٹھا پانی میں جال ڈال رہا ہے۔

یہ سب باتیں اندریئکا کے لئے ذرا ڈراؤنی تھیں۔ اس سے پہلے جب وہ کشتی میں ہوتا تو اس کی دنیا پانی کی سطح پر ختم ہو

جاتی تھی۔ اس نے کبھی اس کی فکر نہیں کی تھی کہ گہرائیوں میں کیا تھا۔ صرف پانی تھا اور وہاں سے جال مچھلیاں کھینچ لاتے تھے۔ اب پتہ چلا کہ ان زبردست، خوفناک گہرائیوں میں وہ خاموش، لاچار اور تڑپتی ہوئی مچھلیاں نہیں رہتی ہیں جو کشتی میں پڑی ہیں، وہ مچھلیاں نہیں ہیں جو وہ جال سے کھینچ کر نکال لیتا ہے بلکہ باشعور ہستیاں ہیں جو باتیں کرتی ہیں اور اپنے کو ہر آفت اور مصیبت سے اسی طرح بچانے کی کوشش کرتی ہیں جس طرح سطح سمندر کے اوپر رہنے والے لوگ کرتے ہیں۔

سر کے اوپر سورج چمکتا تھا، بادل گذرتے تھے، ہوا چلتی تھی اور سمندر کی گہرائیوں میں ایک پراسرار اور لامحدود دنیا تھی جو دادا اور اندریئکا کے خلاف تھی — یہ خیال کرکے وہ ڈر جاتا۔

''خدا نے ہر چیز بڑی عقلمندی سے بنائی ہے،، اگافون دادا اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتا۔ ''ہم کہتے ہیں کہ کارپ گونگی مچھلی ہے اور کچھ نہیں، لیکن اگر تم جالوں کو معہ تمام مچھلیوں کے ساحل پر کھینچ کر لے جاؤ اور ان میں کارپ ہو تو تمام مچھلیاں پھر سمندر میں پہنچ جائینگی۔ جیسے ہی کارپ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ چاروں طرف جال سے گھری ہوئی ہے وہ پوری طاقت سے پھڑکنا شروع کر دیتی ہے اور اپنی ناک سے جال میں ٹکریں مار مار کر اس کی ڈوریاں توڑ دیتی ہے۔ اگر جال پرانا ہے تو وہ اس کو توڑ کر سب مچھلیوں کو اپنے ساتھ لیجاتی ہے، اگر وہ دیکھتی ہے کہ ان کو جال سے نہیں نکال سکتی ہے تو وہ خود پانی کے اوپر اس طرح سے اچھلتی ہے کہ جال سے کود کر نکل جائے۔ اگر ساحل کے قریب تم اپنا جال پانی کے اوپر ذرا اونچا کردو اور کارپ یہ دیکھے کہ وہ بڑی مشکل میں گرفتار ہو گئی ہے اور ضرور پکڑ جائیگی تو فوراً غوطہ لگا جائیگی اور اپنی ناک جال کے نیچے کیچڑ اور بالو میں گاڑ دیگی۔ جال پتھروں سے بوجھل ہونے کے باوجود اس کی چکنی پیٹھ پر سے پھسل جائیگا یا کبھی کبھی اس کی کھال کو کھرچ دیگا اور وہ اپنی دم سڑکا کر بھاگ جائیگی۔،،

''اچھا تو کارپ بڑی چالاک مچھلی ہوتی ہے؟،،

''اور سنو! خدا دیکھتا ہے کہ لوگ لاتعداد مچھلیاں مار رہے ہیں۔ کتنی مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں! وہ دیکھتا ہے کہ اس

طرح سب مچھلیاں جلد ہی ختم ہو جائینگی، اس لئے اس نے کارپ کو اتنی سمجھ دے دی۔ آدمی چالاک ہوتا ہے لیکن مچھلی اس سے زیادہ چالاک ہوتی ہے۔،،

اب دادا کو اور جوش آ جاتا اور وہ اپنی بھویں زیادہ تان کر کہتا :

''مچھلیاں سمندروں میں تیرتی ہیں۔ وہ چارے کی تلاش میں کونہ کونہ چھان ڈالتی ہیں۔ لیکن سمندر میں ان کی چراگاہ کہاں ہے؟ وہ جہاں تہاں کوئی کیڑا پکڑ کر کھا لیتی ہیں یا اپنی ساتھی مچھلیوں کو ہڑپ کر لیتی ہیں لیکن دریاؤں میں ان کے لئے ہر طرح کا چارہ ہوتا ہے۔ جتنا وہ چاہیں، دریا کی تہہ میں کیچڑ بھی ہوتی ہے۔ دریاؤں کی تہہ میں ہر طرح کی مردار اور گندی چیزیں ہوتی ہیں۔ کیڑے اور دوسری چیزیں وہاں پیدا ہوتی ہیں۔ جنگلوں سے بارش جڑیں اور شاخیں بہا کر بھیجتی ہے۔ پہلے زمانے میں مچھلیاں دریاؤں کے چڑھاؤ کی طرف آ جاتی تھیں خصوصاً دون میں۔ وہ چارے کے لئے غول درغول آتی تھیں۔ وہاں کثرت سے لوگ آباد تھے اور دریا میں جال کے ذریعے لاکھوں مچھلیاں پکڑتے تھے۔ پھر سمندر کی مچھلیوں میں بات چیت ہوئی کہ دریاؤں کو جانا ٹھیک نہیں۔ وہاں جال بچھے ہیں۔ بات پورے سمندر میں پھیل گئی اور مچھلیوں نے دون کی ''چراگاہوں،، میں آنا بند کر دیا۔ پھر ایک قانون بن گیا جس کے مطابق روس میں ہفتے میں ایک دن کوئی مچھلی کا شکار نہیں کھیل سکتا تھا۔ یہ قانون مچھلیوں کے آرام کے لئے بنایا گیا تھا۔ سنیچر کو چھ بجے شام سے دوشنبہ کو چھ بجے صبح تک کسی کو مچھلی پکڑنے کی اجازت نہیں ہے اور جانتے ہو! پورے ہفتے کوئی سمندری مچھلی دون نہیں جاتی کیونکہ وہ جانتی ہے کہ وہاں متواتر پانچ دن مچھلیوں کا شکار ہوتا ہے۔ سنیچر کی شام کو ان کے غول وہاں پہنچ جاتے ہیں اور اتوار کی رات کو لوٹ پڑتے ہیں۔ وہ مچھیرے جو دریا کے دہانے پر شکار کھیلتے ہیں اچھی طرح جانتے ہیں کہ پورے ہفتے کھاری پانی کی کوئی مچھلی دریا میں نہیں دکھائی دیتی لیکن دوشنبہ کی صبح کو تمام مچھلیاں واپس جانے کی کوشش کرتی ہیں اور جالوں میں پکڑ

جاتی ھیں — یعنی وہ مچھلیاں جن کو جانے میں بہت دیر ھو جاتی ھے۔ اس طرح یہ سب کچھ ھوتا ھے... آدمی چالاک ھے لیکن مچھلی اس سے زیادہ چالاک ھوتی ھے...،،

دادا اپنی داستان عموماً یہ کہہ کر ختم کرتا:

''سچی بات تو یہ ھے کہ مچھلیاں سال بہ سال کم ھوتی جا رھی ھیں... اس کی وجہ یہ ھے کہ مچھیرے بڑھتے جاتے ھیں، بے حد ھو گئے ھیں، ھر جگہ جال ھی جال دکھائی دیتے ھیں...،،

دادا کی گھنی بھویں پھر اپنی عام حالت پر آجاتیں اور وہ پھر حسب معمول اداس اور کم آمیز ھوکر اپنے خیالات میں کھو جاتا۔

دادا اور اندریئکا بلاناغہ برابر کام کرتے رھتے، ان کے یہاں نہ تو چھٹی ھوتی اور نہ ٹھیک سے آرام۔ جو کچھ بھی وہ کماتے دادا سب پی جاتا۔

دادا گھر پہنچتے ھی ساری مچھلیاں دلال کے ھاتھ بیچ دیتا اور اندریئکا کو گھر پر ٹھہرنے، جالوں کی مرمت کرنے، کشتی کی درزیں بند کرنے یا اس پر تارکول پھیرنے، کانٹوں کو تیز کرنے اور ان کو ڈور میں باندھنے یا بادبان ٹھیک کرنے کی سخت ھدایتیں کرتا اور خود بڑے گاؤں چلا جاتا جہاں ایک بازار تھا۔ وھاں جب تک اس کی جیب میں ایک بھی کوپک اور بدن پر ایک بھی لتا رھتا خوب ڈٹ کر پیتا۔

دادا کی پیٹھ پھرتے ھی اندریئکا جال، کانٹے اور بے سلے بادبان چھوڑ کر استیپی کے ایک گاؤں بھاگ جاتا جو تین ورسٹ کی دوری پر تھا اور وھاں ترکاریوں کی باڑیوں کے درمیان پھرتا، کھیرے چراتا، گوریاں پکڑتا، گاؤں کے لڑکوں سے مکے بازی کرتا اور نانی اسپیریدونیحا سے ملنے ضرور جاتا۔ وہ اس کو گاجروں بھرے سموسے اور پوستے کے کیک کھلاتی اور جنگلی آسیبوں، جادوگرنیوں، جل پریوں، غیر ملکوں اور ساحل سمندر پر واقع دورافتادہ شہروں کے متعلق قصے کہانیاں سناتی۔

''وھاں بڑے بڑے، عالیشان گھر ھیں،، نانی اپنے کھردرے محنت کش ھاتھوں سے اندریئکا کو سہلا کر کہتی۔ وہ نانی کے قدموں کے پاس بیٹھا گاجروں کے سموسوں سے نبٹتا رھتا لیکن ایک

لمحے کے لئے بھی اپنی ٹکٹکی نانی کی طرف سے نہ ہٹاتا۔ ''اور ان مکانوں میں صرف امیر لوگ رہتے ہیں جو اچھے اچھے کپڑے پہنتے ہیں اور پورے سال کوئی کام نہیں کرتے۔ ''

''کیا وہ مچھلیاں بھی نہیں پکڑتے؟''

''مچھلی! ارے وہ کمرے میں جھاڑو تک نہیں دیتے!''

''نانی، میں اس بار دادا کے ساتھ گیا ہوں تگانروگ کو، بہت بڑے بڑے گھر تھے اور گرجا گھروں پر سونے کے صلیب لٹک رہے تھے اور سمندر کے کنارے امیر عورتیں ٹہل رہی تھیں، ان کے سر پروں سے ڈھکے تھے... نانی میں نے ایک انگریزی جہاز دیکھا۔ اس میں امیر لوگ سفر کر رہے تھے، وہ ہم کو شیشوں سے دیکھ رہے تھے۔ ''

ذرا دیر اندریئکا خاموشی سے کھاتا رہا۔

''نانی، یہ پن کیڑے کہاں سے آتے ہیں؟ جب ہم سمندر کے کنارے چلتے ہیں اور ہمارا پیر ریت میں دھنس جاتا ہے تو وہ رینگنے لگتے ہیں۔ ''

''بیٹے، پانی سے، یہ کیڑا پانی سے نکلتا ہے۔ اور سموسہ لو۔ تم کو فائدہ کرےگا۔ بےچارہ یتیم۔ ''

''نانی، دادا کہتے ہیں کہ میری ماں ہمارے گھر کے قریب ٹھٹھر کر مرگئی تھی۔ ''

''ہاں بیٹا، وہ مر گئی۔ وہ پالے سے مر گئی۔ وہ رات بہت سرد تھی۔ خوفناک آندھی چل رہی تھی۔ کچھ بھی نہیں دکھائی دیتا تھا۔ بیچاری اکولینا میتریونا نے تجھ کو، یتیم کو بچا لیا۔ خدا اس کی روح کو چین دے اور خدا سلامت رکھے اگافون دادا کو، انھوں نے بھی تجھ کو بچایا۔''

''نانی، دادا مجھ کو ہمیشہ پیٹتے ہیں، میرے بڑی چوٹ لگتی ہے۔ اگر انھوں نے مجھے پیٹنا نہ بند کیا تو میں بھاگ جاؤنگا۔''

''یہ تو تیرے بھلے کے لئے ہے۔ پگلے کہیں کے، تیری بھلائی کے لئے۔ ان کو تجھے مارتے ہوئے افسوس ہوتا ہے، وہ تیری بھلے کے لئے سکھاتے ہیں۔ دیکھو، ان کی حکم‌عدولی نہ کرنا۔''

نانی اسپیریدونیچا ہی دنیا میں ایسی ہستی تھیں جن سے اندریئکا بےتکلف تھا۔

اگافون دادا نچا کھچا، اداس اور چڑچڑا گھر واپس آتا۔ وہ دیکھتا کہ جال اور بادبان چھوئے تک نہیں گئے ھیں اور پھر وہ انتہائی غصے میں اندریئکا پر جھپٹ پڑتا اور اس کو ایسا پیٹتا کہ وہ ہفتے بھر کے لئے چلنے پھرنے تک سے معذور ھو جاتا۔

(۳)

سورج کی گرمی ناقابل برداشت تھی۔ سمندر کے اوپر جس کی لامحدود گہرائیوں میں نیلے آسمان کا عکس پڑ رہا تھا ھوا ساکت تھی اور بے حد امس تھی۔ سیاہ کشتی سے تارکول بہہ رہا تھا اور اس کے آویزاں باد بان پوری فضا میں معلق معلوم ھو رہے تھے اور ٹھیک اسکے نیچے دوسری مستول والی کشتی جو ھوبہو پہلی کشتی کی طرح تھی لٹک رھی تھی۔

ایک مرتبہ بھی اپنی پیٹھ سیدھی کئے بغیر اندریئکا جال کے اندر گرفتار لاتعداد مچھلیوں کو نکالنے میں دادا کی مدد کر رہا تھا۔ جال کشتی کے برابر برابر تیر رہا تھا۔ اس کا چہرہ جل رہا تھا، منہ ادھ کھلا تھا اور پسینے کی بڑی بڑی بوندیں ٹپک ٹپک کر سمندر میں گر رھی تھیں۔ کشتی پانی میں کافی بیٹھ گئی تھی اور اس کے اندر منہ کھولتی، تڑپتی مچھلیوں کا ایک پہاڑ سا ڈھیر لگا ھوا تھا۔

زبردست پٹائی کے بعد اندریئکا کو اپنی پیٹھ کی جلتی ھوئی بدھیوں میں درد محسوس ھو رہا تھا اور اس کے دل میں برے برے خیال آ رہے تھے۔ پہلے تو اس کا سارا غصہ اس کارپ مچھلی پر تھا جس کی چالاکی کی وجہ سے اس پر مار پڑی تھی۔

''اچھا رھو تم بڑی توندل حرامزادی،، اس نے غصے سے سوچا۔ ''اگر میں نے تم کو پھر پکڑ لیا تو دیکھوں کیسے بھاگ کر جاتی ھو۔ میں اپنی مٹھیاں تمہارے گل پھڑوں میں ٹھونس دونگا اور پھر دیکھونگا کہ تم کیسے بھاگتی ھو۔ پھر میں تم سے اپنا بدلہ لونگا...،،

چونکہ چالاک کارپ اندریئکا کے ھاتھ نہیں آئی اس لئے اس کے خیالات نے پلٹا کھایا۔

''میں اس کا بیٹا ھوں یا غلام؟ جو چیز ھاتھ میں آئی اس

سے پیٹ دیتا ہے۔ کیسی جلن ہو رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے میری کھال ادھیڑ دی۔ میں بھاگ جاؤنگا۔ خدا کی قسم بھاگ جاؤنگا۔ میں شہر جاکر نوکری کر سکتا ہوں یا ساحل پر جال لگانے والے مچھیروں کے ساتھ رہونگا۔ یہ میرے بغیر پڑا رہے۔ ہاں، میں کچھ گڑبڑ کئے بغیر نہ جاؤنگا۔ میں کشتی میں ایک چھوٹا سا چھید کرکے اس میں چیتھڑے ٹھونس دونگا اور پھر استیپی کے ٹیلے پر لیٹ کر دیکھونگا۔ جب وہ سمندر میں جائیگا کشتی کا چیتھڑا نکل جائیگا اور وہ ڈوب جائیگا۔ وہ ڈوبنے لگےگا اور غل مچائیگا: 'اندریئکا! میں ڈوب رہا ہوں!'، اور میں چلا کر جواب دونگا: 'ارے، تمھیں یاد ہے کہ تم نے کس طرح میرا چرسا کھینچا تھا، میری قمیص پیٹھ پر سے پھٹ گئی تھی؟'..."

اندریئکا پر گرمی اور تھکن کا غلبہ ہونے لگا اور اس کی خفگی کم ہونے لگی۔ دادا کو بالکل پتہ نہ تھا کہ اندریئکا کے ذہن میں کیسی کھچڑی پک رہی ہے اور وہ کشتی کے پچھلے حصے میں خاموشی سے کھڑا اپنا پائپ چوس رہا تھا اور مچھلیاں جال سے نکال رہا تھا۔ بڈھا بڑے قاعدے اور انہماک سے کام کر رہا تھا۔ اس کو باتیں بنانا نہیں پسند تھیں۔ وہ دن بھر کے شکار سے مطمئن تھا اور اس کی گھنی بھویں ذرا چڑھ گئی تھیں۔ اس کو توقع تھی کہ شام تک وہ تمام جالوں کا جائزہ لےکر رات کو گھر واپس ہو سکےگا۔

اچانک اندریئکا نے اس کی آواز سنی:

"اندریئکا، جال چھوڑ دو اور چلو!"

اندریئکا حیرت سے بڈھے کا منہ تکنے لگا۔ آخر اس کو کیا ہو گیا ہے؟ ابھی تو آدھے جال دیکھنے باقی ہیں — غالباً ان میں مچھلیوں کی جھول کی جھول بھری ہوگی۔ بہرحال کافی مچھلیاں ہونگی۔ یہ لوگ رات سے پہلے کبھی نہیں جاتے تھے۔ بڑھے کو باربار بات کہنے کی عادت نہ تھی، اس لئے اندریئکا نے جلدی سے جال معہ مچھلیوں کے پانی میں پھر ڈال دیا اور بادبان سیدھے کرنا اور ان کی الجھی ہوئی رسیاں سلجھانا شروع کر دیں۔

"اس کو آدھی دور تک جھکادو اور نیچے سے لپیٹ کر چھوٹا کر لو۔"

اندریئکا جلدی سے یہ حکم بجا لایا۔ اس کو بڈھے سے کچھ پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ عام طور پر وہ بادبان کو لپیٹ کر اس وقت آدھا جھکاتے تھے جب کوئی بڑا طوفان آتا تھا تاکہ ہوا بہت تیز ہونے پر بادبان کو اور چھوٹا کر سکیں لیکن اب بھی ان کے چاروں طرف اسی طرح اسس اور سخت گرمی تھی۔ سانس لینا دشوار تھا اور نا رسا بلندیوں سے لے کر بے انتہا گہرائیوں تک پوری فضا، ایک دوسرے سے انتہائی دوری کے باوجود، دو ہلکے نیلے آسمانوں کی چمک سے روشن تھی اور ان کے بیچ میں پانی نہیں دکھائی دے رہا تھا۔

''پتوار اٹھاؤ!،،

اندریئکا نے بڑی فرماں برداری سے پتوار اٹھا لئے اور کشتی کھینا شروع کی۔ اس کے جسم سے پسینہ ٹپک رہا تھا۔

سمندر سے کسی قدر اونچائی پر ایک بہت ہی چمکدار چھوٹا بادل تیر رہا تھا جس کے کونے ایسے کٹے پٹے تھے جیسے کسی کپڑے کا ٹکڑا کہیں سے پھاڑ لیا گیا ہو۔ اس تیز رفتار ٹکڑے نے اسس، بے حسی اور سکون کو دور کر دیا۔ دادا اس چھوٹے سے بادل اور پھر افق کو دیکھتا رہا جہاں آسمان اور پانی دور، نیلگوں فضا میں ضم ہو گئے تھے۔ وہاں سے گول، پھولے پھولے سفید بادل امنڈتے اور ایک دوسرے سے ٹکراتے چلے آ رہے تھے۔ وہ انتہائی پرسکون فضا میں ناقابل بیان تیزی کے ساتھ جمع ہو گئے۔

اندریئکا کے بدن میں درد ہو رہا تھا، وہ سخت گرمی اور محنت کی وجہ سے ہانپ رہا تھا۔ وہ بےچینی سی محسوس کرنے لگا۔ ایک سمت سے چاندی کی طرح چمکتے ہوئے بادل آئے اور دوسری طرف بہت ہی کالے بادل تیزی سے آسمان پر جمع ہونے لگے جو ابھی ابھی صاف تھا۔ دادا نے جو ابھی تک اندریئکا کو جلدی جلدی کھینے کی تاکید کر رہا تھا خود پتوار سنبھالے اور بوجھل کشتی اس طرف زیادہ تیزی سے چل پڑی جدھر ساحل ہونا چاہئے۔

جہاں سے بادل دکھائی دئے تھے وہاں سے لاتعداد چھوٹے چھوٹے ہلکوروں کی ایک گہری اور پتلی پٹی سطح سمندر پر اچانک دکھائی دی اور بڑھتے بڑھتے جلد ہی کشتی کے قریب پہنچ گئی۔ اسی وقت ہوا کا جھونکا آیا۔ بادبان کو زور کا جھٹکا لگا۔ اندریئکا کی

پیٹھ پر قمیص پھول کر غبارہ ہو گئی۔ ہوا چھوٹے چھوٹے ھلکوروں سے سطح سمندر کو تاریک کرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

پھر ہوا رک گئی اور اس ہو گئی۔ سمندر کی سطح آئینے کی طرح صاف و ھموار تھی اور بادبان بری طرح جھک گیا تھا۔

دادا افسردہ خاطر اور چیں بہ جبیں اٹھا، پتواروں کو احتیاط سے اٹکایا، سیٹ کے نیچے سے اپنا کوٹ نکال کر پہنا، پیٹی خوب کس کر باندھی اور کشتی کے پچھلے حصے میں جا بیٹھا۔ اس نے بادبان کی رسی اپنے پاس کے حلقے میں پھنائی اور سکان لے کر بیٹھ گیا۔

سمندر جلد ھی تاریک ھلکوروں سے بھر گیا جن کے پاس ھی چمکدار اور ھموار پانی پر بادل کے سائے تیزی سے دوڑتے دکھائی دیتے تھے... یکایک پورا سمندر ایک سرے سے دوسرے تک تاریک ہو گیا۔

ہوا ان کے کانوں میں سیٹیاں بجاتی اور بدن میں سرد کپکپی پیدا کرتی ہوئی بادبان میں یکدم بھر گئی۔ کشتی کے سامنے ایک لہر اٹھی اور گرجدار آواز کے ساتھ آگے بڑھ گئی، وہ اڑتے ہوئے تیز بادلوں کے سائے کے ساتھ ساتھ چلی جا رہی تھی۔ کشتی کے راستے پر جھاگ کی ایک لمبی لکیر بن رہی تھی۔

ہوا کی تمام کوششوں کے باوجود جو اب تک آندھی بن چکی تھی پرسکون سمندر فوراً اتھل پتھل نہیں ہوا حالانکہ پانی برابر زیادہ سے زیادہ سیاہ رنگ اختیار کرتا گیا۔ بہرحال دادا تو گرمی کے طوفانوں کی تمام چالوں سے واقف تھا۔ یہ طوفان زور شور کی حالت میں بڑی بڑی لہریں کہیں دور جمع کرتے اور پھر ان کو اپنی جلو میں لے کر آگے بڑھتے۔ یہ لہریں زور کے تھپیڑے دیتیں اور بھنور بن کر سمندر کی سطح کو اتھل پتھل کر دیتیں جو ایک لمحہ پہلے بالکل پرسکون ہوتا۔ اسی وجہ سے دادا نے کشتی الٹنے کی پروا کئے بغیر بادبان میں ہوا اچھی طرح بھرنے دی۔ چنانچہ اب وہ اتنی تیزی سے جا رہے تھے کہ ان کو چکر آنے لگا۔ جھاگ دار پانی اس تیزی سے گزر رہا تھا جیسے کسی چلتی ٹرین پر سے گزرتا معلوم ہوتا ہے۔ دور ساحل کے دھندلے خطوط زیادہ واضح ہوتے جا رہے تھے۔

لہریں برابر آ رہی تھیں جیسے کوئی زبردست فوج آتی ہے۔

وہ اپنے سفید سر ہلاتی بپھری ہوئی سبز قطاروں میں آتیں اور قیامت ڈھا جاتیں۔

کشتی کا اگلا حصہ پانی میں غوطے کھا رہا تھا۔ زبردست لہریں جن کی دھار بڑی تیز تھی پیچ وخم کھاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں اور ہوا ان کو زور کے تھپیڑے دے کر ان سے ہزاروں فوارے اڑا رہی تھی۔ یہ لہریں دھاڑتی اور چنگھاڑتی بےروک ٹوک کشتی پر چھاپے مار رہی تھیں۔ لہروں کی بپھری ہوئی سبز جھالیں کشتی کے کنارے سے ٹکرا رہی تھیں۔ رسیاں خوب کسی بندھی تھیں، بادبان نے مستول کو جھکا دیا تھا اور زبردست بوجھ سے کانپ رہا تھا۔ وہ جلد ہی پانی سے بھیگ کر شرابور ہو گیا۔ اس ہنگامے کی آواز آسمان تک گونج رہی تھی جس پر نیچے، بھورے بادلوں کے ٹکڑے تیزی سے بھاگ رہے تھے۔ ایسا ہنگامہ تھا کہ اس میں کشتی کے جوڑوں کی تمام چرچراہٹ اور انسانی آواز ڈوب گئی تھی۔

اندریئکا مستول سے چپکا ہوا دیکھ رہا تھا کہ دادا کے ہونٹ ہل رہے ہیں لیکن اس کو ایک لفظ بھی نہیں سنائی دے رہا تھا۔ وہ کانپتے ہوئے مستول سے چپکا ہوا تھا اور ان باغی، بپھری ہوئی لہروں کو دیکھ رہا تھا جو ان کی بےیار و مددگار کشتی پر لگاتار لاتعداد چھاپے مار رہی تھیں۔ کشتی یہاں تک ایک طرف جھک جاتی کہ پھڑپھڑاتے بادبان کا سرا پانی میں غوطے کھا جاتا پھر وہ سیدھی ہوکر لہروں پر اٹھتی۔ اس وقت اندریئکا کئی میل کے فاصلے پر ساحل دیکھتا، چھوٹا سا سفید گھر اور بید کا درخت۔

اندریئکا زیادہ خوف زدہ نہ تھا۔ وہ طوفانوں کا عادی ہو چکا تھا۔ لیکن اس کی پوری ہستی میں ایک کھنچاؤ سا پیدا ہو گیا۔ وہ سمندر پر دادا کی ہر بات ماننے کا اتنا عادی ہو چکا تھا کہ اسے خطرہ کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا حالانکہ کشتی کے کنارے سے تھپیڑے کھانے والی لہریں کشتی کو رفتہ رفتہ پانی سے بھر رہی تھیں اور کشتی اب زیادہ بوجھل ہوکر لہروں پر ہلکورے لے رہی تھی۔ اندریئکا نے پانی نکال نکال کر باہر پھینکنا شروع کیا لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

دادا کشتی کے پچھلے حصے میں بیٹھا تھا۔ وہ اڑتے ہوئے پانی کے فواروں اور جھاگ میں چھپ گیا تھا۔ وہ سکان پر بیٹھا کشتی کی سمت ٹھیک رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب کشتی ایک طرف جھک جاتی تو وہ بادبان کو ڈھیلا چھوڑ دیتا۔ بڈھے کا جھریوں پڑا درشت چہرہ پانی کے چھینٹوں سے تر تھا اور اس سے پریشانی برس رہی تھی لیکن وہ اپنے کام میں جٹا ہوا تھا۔ اس نے اندریئکا کو اشارہ کیا جس کو جھکولے کھاتی ہوئی کشتی ادھر ادھر جھلا رہی تھی اور لڑکا اپنے چاروں ہاتھوں پیروں پر پانی میں کشتی کے پچھلے حصے کی طرف چلا جہاں بڈھا رسیوں کے درمیان بیٹھا تھا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو بڈھا جھکا اور اس کے کان میں چلا کر کہا:

''مچھلیاں کشتی کے باہر پھینک دو!''

اندریئکا بڈھے کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا لیکن دادا نے اس کو ایک دھکا دیا۔ لڑکے نے زندہ تڑپتی ہوئی مچھلیوں کو کشتی کے باہر پھینکنا شروع کر دیا۔ اب اس کو اس خطرے کا احساس ہوا جو ان کو درپیش تھا اور اس پر خوف و ہراس طاری ہو گیا۔ ایک ہاتھ سے اس نے ایک تختہ پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے تیزی کے ساتھ مچھلیاں کشتی کے باہر پھینکنے لگا۔ وہ خوب رو رہا تھا اور ساتھ ہی فریاد کرتا جاتا تھا:

''اوں... اوں... اوں... ہم ڈوب رہے ہیں!.. مد... مدد۔ ہم ڈوب رہے ہیں!..''

ہوا غصے میں اس کی فریاد بھی اڑا لے گئی اور موجوں نے کشتی سے ٹکریں مارکر فضا میں فواروں کے لمبے سفید ستون کھڑے کر دئیے۔

اندریئکا نے تمام مچھلیاں کشتی کے باہر پھینک دیں... اب کشتی زیادہ ہلکی ہوکر بھاگ رہی تھی... ساحل قریب آتا جا رہا تھا... ان کو بارش سے دھلے ہوئے نالوں کی مٹی، ساحل کی زرد ریت اور پرانی کشتیوں کے سیاہ ڈھانچے دکھائی دے رہے تھے... اندریئکا کشتی سے پانی باہر نکالتا جاتا اور دعا مانگتا جاتا۔ وہ اس سفید داڑھی والے بڈھے سے دعا مانگ رہا تھا جس کی قدیم تصویر گرجا گھر کے کونے میں ٹنگی تھی اور جس کے سامنے دادا ہمیشہ

شمعیں روشن کرتا تھا۔ اندریئکا کو یہ توقع تھی کہ بس اب کشتی ہلکی ہوئی اور جھاگ دار لہروں کے تھپیڑے رکے۔ لیکن پانی کے پہاڑ اب بھی ھاھا کار کرتے ہوئے کشتی سے ٹکرا رہے تھے، جھاگ اڑ رہا تھا اور سیلے سیلے بادل آسمان پر بھاگ رہے تھے۔

ہوا کا ایک تیز تھپیڑا کشتی کے اندر چیختا اور سوجوں کی جھالوں کو پھاڑتا آیا اور بادبان کو گرا دیا۔ کشتی بڑی بے کسی سے ایک طرف کو جھک گئی اور ایک زبردست لہر کشتی کے کنارے سے جا ٹکرائی۔

اندریئکا سر سے پیر تک تربتر دونوں ھاتھوں سے سستول سے چمٹ گیا۔ کھاری پانی سے اس کا سنھہ بھر گیا تھا اور گلا گھٹ رہا تھا۔ بڈھے کا دھوپ سے تپا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا اور اس کا نیچے کا جبڑا زوروں سے کانپ رہا تھا۔ وہ کشتی کے کنارے اپنا سینہ لگائے بری طرح جھکا ہوا تھا۔ کشتی سیدھی ہوئی لیکن وہ پانی سے آدھی بھر چکی تھی۔ بڑی سشکل سے وہ جھپٹتی ہوئی سوجوں کے اوپر اٹھی جو اب زیادہ تیزی سے تھپیڑے دے رہی تھیں۔ اندریئکا ہر لمحہ یہ سوچ رہا تھا کہ اب سمندر کی تہہ سیں گئے۔ اب ڈوبے۔ اس پر سخت دھشت طاری تھی۔ وہ اپنے ھاتھوں پیروں پر رینگ کر دادا کے پاس پہنچا۔

''دادا، سجھے بڑا ڈر سعلوم ہو رہا ہے...''

بڈھے کا چہرہ ساکن اور سردوں کی طرح زرد تھا۔ اس کا نچلا جبڑا کانپ رہا تھا۔ اس نے اندریئکا کو اپنی جگہ پر دھکیل دیا اور بادبان کی رسی کا سرا اور سکان اس کے ھاتھ سیں تھما دیا۔

''بید، بید کے درخت کی طرف چلو!''

بڈھا اپنا پورا زور لگا کر چلایا لیکن طوفان کی گرج سیں اندریئکا کچھ نہ سن سکا۔ اس نے صرف یہ دیکھا کہ دادا نے اپنی ٹوپی اور جوتے الگ پھینکے، اپنے اوپر صلیب کا نشان بنایا، اپنے ھاتھ پھیلائے اور کشتی کے باھر غوطہ سار گیا۔ کشتی اور ھلکی ہو گئی۔ اس کے بادبان سیں ہوا بھری اور وہ اور تیز چلنے لگی۔

پورے سمندر سیں جھاگ اس طرح پھیلا ہوا تھا جیسے برفانی آندھی سیں استیپی پر برف پھیل جاتا ہے۔ ساحل کشتی سے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ خشکی کی تمام چیزیں صاف دکھائی دے رہی

تھیں — بارش سے دھلے ہوئے نالے کی سٹی، کشتیوں کے سیاہ ڈھانچے، چھوٹا سفید گھر اور اس کے پاس پرانا بید کا درخت۔

اندریئکا یہ سوچ کر بہت خوش ہو رہا تھا کہ اس کی جان بچ گئی۔ اس نے اپنے بازو کے نیچے سکان کو مضبوط دبایا اور رسی کا سرا اپنے ہاتھ میں لپیٹ کر دیکھنے کے لئے پیچھے مڑا۔ دور، بہت دور موجوں اور جھاگ کے درمیان ایک سیاہ سر لہروں کے ساتھ اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ وہ کبھی دکھائی دیتا اور کبھی غائب ہو جاتا۔ دادا کے متعلق اندریئکا کا تصور یہ تھا کہ اس کی زبردست طاقت کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا اور اب اس کے سر کو موجوں کے ساتھ اوپر نیچے ہوتے دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ اندریئکا اپنی بچکانی تیز آواز میں چیخا:

”دا... دا... دا...دا!“

اندریئکا اپنی آنکھوں سے بہتے ہوئے نمکین آنسو اور چہرے کو تھپیڑے دیتے ہوئے چھینٹے پیتا رہا۔ وہ سکان پر اپنی پوری طاقت کے ساتھ لیٹا ہوا تھا۔ کشتی تھرائی، ایک طرف جھکی، چکرائی اور ہوا کے خلاف اس طرح رک کر کھڑی ہو گئی جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔ بادبان گر گیا، زور سے پھڑپھڑانے اور ہلنے لگا۔ اندریئکا نے جو ابھی تک زور زور سے سسکیاں لے رہا تھا سکان پورا گھما دیا، کشتی پھر گھومی، اب ہوا نے دوسرے رخ سے بادبان کو بھر کر پھلا دیا اور کشتی تیزی سے چل پڑی۔ کشتی میں پانی زیادہ بھرتا جا رہا تھا۔ وہ پھر گہرے پانی کی طرف تیزی سے جا رہی تھی، ساحل سے پرے سمندر کی طرف، جہاں گرجتی ہوئی خوفناک لہریں تیزی سے ایک دوسرے کو روندتی ہوئی چلی آ رہی تھیں، جہاں سیاہ سر بڑی لاچاری سے باربار اوپر نیچے ہو رہا تھا۔

”دا... دا... دا... دا!“

۱۹۰۳ء

عوام کی طاقت

(۱)

آدمیوں کے سیاہ گھنے دل بادل شہر کے مرکز کی طرف امڈے چلے آ رہے تھے، ان کے سروں پر سرخ جھنڈے لہرا رہے تھے جن کی ہر شکن ان لوگوں کے خون دل سے رنگی تھی جو ان جھنڈوں کے لئے لڑے تھے۔

وہ عالیشان مکانوں کی قطاروں کے درمیان سے گذر رہے تھے، یہ مکان پچی کاری، مجسموں، نقش و نگار اور مورتیوں سے سجے تھے۔ ان کی چمک دار، شیشے کی کھڑکیاں ان لوگوں کی طرف بے التفاتی سے دیکھ رہی تھیں۔ شہر میں روز کی طرح آج بھی چهل پہل تھی۔ پتھر کے ڈھیروں کے درمیان آدمیوں کے مجمع میں جو ان کی طرف توجہ کئے بغیر تیز تیز سڑک کے کنارے جا رہے تھے اور مارچ کرنے والوں کی لامتناہی قطاروں کے اوپر ہزاروں آوازوں سے فضا گونج اٹھی:

"...محنت کش عوام!..."

ان الفاظ میں بڑا فخر تھا لیکن ان سے کان نا آشنا تھے۔

وہ بڑے فخر کے ساتھ ان لامتناہی سیاہ قطاروں کے اوپر گونج رہے تھے جن کا سرا سڑکوں کی موڑ تک نہیں دکھائی دے رہا تھا۔

یہ آوازیں ان پتھر کی عمارتوں اور شیشے کی کھڑکیوں کی شان و شوکت کے درمیان عجیب معلوم ہوتی تھیں۔

مارچ کرنے والوں میں بے ڈاڑھی مونچھوں والے جوان تھے جن کے چہروں سے خوشی ٹپک رہی تھی۔

ان میں معمر لوگ بھی تھے جو گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ غالباً دل ہی دل میں اپنی غلامی کی عادت کے خلاف جد و جہد کر رہے تھے اور نئے خیالات سے جھجک رہے تھے کیونکہ ابھی تک جن باتوں کے وہ عادی تھے یہ سب خیالات ان کے برعکس تھے۔

وہ اپنی سیاہ چوٹی دار ٹوپیاں، اونچے بوٹ، جیکٹ اور کالے اوورکوٹ پہنے چلے جا رہے تھے۔ اس گھنے مجمع میں ایک ہنگامہ تھا، یہاں وہاں آوازیں، ہنسی مذاق اور چٹکلے قہقہوں میں ڈوب جاتے تھے۔

''ساتھیو، قطار سیدھی رکھو۔''

''وانکا ذرا تیزی دکھا رہا ہے۔''

''نہیں، اس کی بڑی توند آگے نکلی ہوئی ہے۔ ہڑتال سے بھی وہ نہیں پٹکی...''

''اس نے اسی برے وقت کے لئے رکھ چھوڑی تھی...''

''ہا... ں... ہم اندر گئے۔ ایڈجوٹنٹ ہمارے پاس آیا: تم کیا چاہتے ہو؟ ہم نے بتایا کہ مزدوروں کا وفد آیا ہے اور ہم انتظار کرنے لگے۔ جنرل باہر آ گیا اور ہم نے اپنی ٹوپیاں اتار لیں...''

''تم کو اپنے پتلون بھی اتار لینا چاہئے تھا...''

''پھر وہ زیادہ ٹھکانے سے پیش آتا...''

''اور پیر چوسنے کیلئے بڑھا دیتا تھا...''

بات کرنے والا غصے سے بوکھلا کر رک گیا اور صفوں میں ایک مزاحیہ لیکن طنزآمیز قہقہہ بلند ہوا۔

یہ مجمع اس طرح خوش خوش اور بےفکر چلا جا رہا تھا جیسے یہ صاف، کشادہ اور سیدھی سڑکیں جن کے دونوں طرف سجے سجائے مکانات تھے خاص طور سے انھیں کے لئے بنائی گئی تھیں، ان اتفاقی مہمانوں کے لئے، ان دوش بدوش چلنے والوں کی گھنی صفوں کے لئے جو اپنی طاقت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

وہ صف بہ صف چلے جا رہے تھے۔ ان کے اوپر جھنڈے لہرا رہے تھے اور یہ گیت گونج رہا تھا:

"ہمیں کسی سنہرے دیوتا کی مدد
نہ چاہئے..."

گیت بڑھتا اور پھیلتا گیا یہاں تک کہ ان کی جوشیلی آوازوں سے سڑکیں اور چوراہے بلکہ پورا شہر گونج اٹھا۔ ان آوازوں کی زبردست طاقت نے پل بھر کے لئے شہر کی رواں دواں اور چہل پہل سے بھری زندگی میں انتشار پیدا کر دیا۔ یہ ایک ایسی طاقت تھی جس کا اظہار گیت کی اناڑی اور بھدی لے سے نہیں ہو رہا تھا بلکہ یہ طاقت ایک بپھرے ہوئے طوفانی سمندر کی طرح تھی جس نے انسانی جذبات کی صورت اختیار کر لی تھی۔ شہر میں گونجنےوالے قدموں کی آواز میں ایک پرفخر طاقت تھی، اپنے آپ کو پہچاننے کی طاقت۔

(۲)

"ساتھیو!"

سیاہ سروں کے سمندر کے اوپر، دور سے بھی وہ صاف دکھائی دے رہا تھا اور اس کی آواز بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ آگے کی صفیں رک گئیں، پیچھے کی صفیں قریب آ گئیں اور انسانیت کے اس سیلاب کے رکتے ہی مجمع زیادہ گھنا ہو گیا اور لوگوں کا بہتا ہوا دریا رک گیا جیسے پرشور پانی کا بہاؤ روکنے سے اس میں خاموشی اور سکون پیدا ہو جاتا ہے۔

قدموں کی آواز رک گئی۔ اب اس کی ہلکی سی گونج صرف دور سڑکوں پر سنائی دے رہی تھی۔

"ساتھیو!.. میں تو تمہاری پھیلی ہوئی صفوں کو آخر تک دیکھ بھی نہیں سکتا لیکن..." اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور اس کی آواز بلند ہو گئی... "ہماری طاقت تعداد سے نہیں ہے۔ ہم نہتے مارچ کر رہے ہیں، ہمارے خالی ہاتھوں میں گھٹوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ جسمانی طاقت کے سامنے ہم نوزائیدہ بچے کے مانند ہیں۔ ایک درجن مسلح آدمی ہمارے خون سے سڑکوں کو شرابور کر سکتے ہیں۔ پھر کیوں، ہمارے دشمن ہم کو غصے لیکن خوف سے دیکھ رہے ہیں؟"

وہ رک گیا۔ بالکل سناٹا چھا گیا۔ اس نے اس بے حس و حرکت سیاہ سمندر پر نظر دوڑائی اور ان لوگوں کی آوازیں سنیں جو ابھی تک دور مارچ کر رہے تھے۔

”دشمن ہمارے ہاتھوں سے نہیں ڈرتے، وہ ہمارے دلوں سے ڈرتے ہیں، وہ ہماری بیداری سے ڈرتے ہیں، وہ ہمارے جری دلوں سے ڈرتے ہیں، جن میں آزادی کی زبردست پیاس ہے! ہماری بیداری نے ایک زبردست غار کی طرح منہ کھول دیا ہے۔ ہم اپنی غلامی کی گہرائیوں تک پہنچ گئے ہیں۔ ہم نے ان لوگوں کو پہچان لیا ہے جنھوں نے ہم کو غلام بنایا ہے۔ ہم کھلے غار کے ایک طرف جمع ہیں اور ہمارے غلام بنانے‌والے دوسری طرف۔ ہم جانتے ہیں کہ مصالحت کی کوئی صورت نہیں۔ وہ بھی جانتے ہیں کہ سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے ہمارے دشمن ہم سے ڈرتے ہیں۔“

اس نے غلاموں اور غلام بنانے‌والوں کی کبھی نہ ختم ہونے‌والی جدوجہد اور تاریخ کے آہنی رجحان کے متعلق بتایا جو بالآخر اس اژدہے کا سر کچل دیگا جس کا نام ہے آدمی پر آدمی کا اختیار، اس نے ایسی باتوں کا ذکر بھی کیا جو انھوں نے ہزاروں مرتبہ سنی تھیں، جو ان کو ازبر تھیں اور وہ خود بھی ان کو کہہ سکتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ بڑے شوق سے اس کی باتیں سنتے رہے۔ یہ باتیں اکثر سنی ہوئی تھیں لیکن ان کی جدت اور اچھوتا حسن ابھی تک برقرار تھا۔ جیسے جوانوں کے لئے محبت میں ہمیشہ نیاپن ہوتا ہے ویسے ہی انسانیت کی بعض پرانی باتیں بھی آدمی کے لئے ہمیشہ نئی رہتی ہیں۔

ایک مرتبہ پھر انسانیت کا وہ سمندر ان بے‌حس و حرکت مکانوں کے درمیان حرکت کرنے لگا۔ جھنڈے فضا میں شوخ سرخ دھبے بنا رہے تھے۔ مارچ کرنے‌والے قدموں کی گونج اور آوازیں، گانے اور قہقہے مل جل گئے تھے اور ان سب سے بلند یہ الفاظ گونج رہے تھے:

”ہمیں کسی سنہرے دیوتا کی
مدد نہیں چاہئے...“

ابھی دور کی سڑکوں سے پرے کے پرے چلے آ رہے تھے۔

دور دھندلکے میں کھوئی ہوئی سڑک ہلکے بھورے رنگ کی معلوم ہو رہی تھی، اس کا بھورا پن کسی سنسان سمندر کے اداس ریتیلے ساحل کی طرح کا تھا، سپاٹ، اداس غیرآباد ساحل کی طرح جس پر کوئی سفید سمندری بگلا منڈلا رہا ہو ۔ سب لوگوں نے اپنے سر اٹھائے، ان کے نتھنے پھول گئے اور تیوریاں چڑھ گئیں ۔

(۳)

''اھا — ھا!..''
''کہاں؟''
''وھاں...''
''کون ھیں وہ؟''
''تمھیں دکھائی نہیں دیتے؟''
''وہ آ گئے... وہ!''

تمام بات چیت بند ہو گئی جیسے رات میں خطرے کی گھنٹی سن کر سناٹا چھا جاتا ھے، ایک ناقابل بیان بےچینی سی ایک آدمی سے دوسرے آدمی تک پھیلتی چلی گئی ۔ اب یہ بات صاف ہو گئی کہ دوسری طرف لوگ کھڑے تھے، بھورے اور سب ایک طرح کے ۔ سورج ان کی سنگینوں پر اٹکھیلیاں کر رہا تھا ۔

ان کے چہرے یکساں تھے، غیرمتحرک اور ساکن، صدیوں پرانی، کائی جمی ہوئی پہاڑیوں کے درمیان پتھریلی چٹانوں کی طرح ۔ یہ لوگ آنےوالے مجمع کی طرف بجھی بجھی آنکھوں سے دیکھنے لگے ۔

مارچ کرنےوالوں کی صفیں سمٹ کر گھنی ہو گئیں ۔ لوگوں نے ایک دوسرے کے ھاتھ پکڑ لئے ۔ ان لاتعداد سیاہ صفوں کے اوپر سرخ خون جیسے جھنڈے لہرا رہے تھے اور پورا شہر مارچ کرنے والوں کے پیروں کی زوردار اور متواتر گرج سے گونج رہا تھا ۔

(۴)

ایک افسر نے سپاھیوں کی طرف ذرا گھوم کر کچھ حکم دیا، ایک بگل بجانےوالے نے بگل اونچا کیا، مونچھیں منہ سے پھونک کر ہٹائیں ۔ بگل منہ میں لگایا اور گال پھلائے ۔ سنگینوں کی خیرہ کن

چمک اور منہ پھاڑے ہوئے سیاہ مشین گنوں کی ساری عظمت و اہمیت بھورے، بھاری بھر کم کوٹ والے آدمی کی اس ایک جنبش میں سمٹ آئی۔

جب اس نے ان ہزاروں ہستیوں کی طرف رخ کرکے اپنے بگل سے تین مرتبہ مختصر آوازیں نکالیں اس وقت اس کو اس دہشت اور زبردست طاقت کا احساس تھا جس کا حامل اسے بنایا گیا تھا۔

سنگینیں لہرائیں اور چمکیں اور بڑی فرماں برداری کے ساتھ سیکڑوں انسانوں کے ہاتھ میں آ گئیں۔ ان کی نوکیں بڑھتے ہوئے جاندار سمندر کی طرف تھیں۔ رائفلوں کے سیاہ دھانے خاموشی سے ان کی طرف گھور رہے تھے۔ بھورے لباس والے آدمیوں کی پہلی قطار ایک گھٹنے پر جھک گئی اور مشین گنوں نے ان بڑھتے ہوئے اٹل اور زندہ جسموں کو بڑی بھوکی نظروں سے دیکھا۔

بات چیت اور ہنسی مذاق بند ہو چکا تھا۔ شدید سناٹے میں مارچ کرنےوالے قدموں کی آواز رفتہ رفتہ پھیلنے لگی۔ جلدھی ان قدموں کی گونج سے سڑکوں اور چوراھوں کا سخت سناٹا ختم ہو گیا اور یہ گونج پھیل کر پورے شہر پر چھا گئی۔

اس طرح سے جو شدید تناؤ پیدا ہو گیا تھا اس کو نوجوانوں اور بڈھوں کی آوازوں نے توڑ دیا۔ ان ہزاروں بدقسمت انسانوں کے مجمع میں مزدوروں کا نغمہ ''موت کا مارچ،، گونج اٹھا۔

''ہم لڑائی میں مارے گئے...،،

یہ نغمہ ایک الوداعی پیغام کی طرح زرد آسمان، خون جیسے لال سورج اور پتھریلے شہر تک، جو اپنی سانس روکے کھڑا تھا بلند ہو رہا تھا، گلیوں میں اور سڑک کے کنارے کھڑے مجمع نے گانےوالوں کے احترام میں اپنی ٹوپیاں اتار لیں۔

''...ہمارے دل اپنے ساتھی انسانوں
کی محبت سے لبریز تھے...،،

پیام اجل کی طرح یہ آواز مجمع میں گونج رہی تھی:

''...ہم محنت کشوں کے لئے اپنا
سب کچھ تج رہے ہیں...،،

ان کے چہرے زرد تھے لیکن آنکھوں میں چمک تھی اور وہ ان آدمیوں کی طرح آگے بڑھ رہے تھے جو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہوں۔

سورج پر ایک گلابی دھند چھا گیا تھا جس کا عکس انسانوں کے چہروں اور مکانوں پر پڑ رہا تھا۔ خون کی بو کی ایک لہر سی اٹھی اور ہر ایک کی زبان پر ایسی تلخی آ گئی جس کے مزے سے سبھی واقف ہیں۔

آگے بڑھتے ہوئے موت کے جلوس اور بھورے لباس والے آدمیوں کے درمیان فاصلہ کم ہو رہا تھا۔ موت کا ہیبت ناک فاصلہ اس طرح آہستہ آہستہ کم ہو رہا تھا جیسے جسم سے جان نکلتی ہے۔

"...شعلہ‌ور الفاظ میں قسمت نے
لکھا ہے..."

ہزاروں آدمی مارچ کر رہے تھے۔ ہزاروں آوازیں موت کا نغمہ، بڑے جوش سے گا رہی تھیں۔ جھنڈوں کے سیاہ سائے سڑکوں اور عمارتوں کی سفید دیواروں پر ماتمی نشان معلوم ہوتے تھے۔

(۵)

اس افسر نے، جس کی مونچھیں اچھی طرح کنگھی سے سنواری ہوئی تھیں، اپنی تجربہ کار نگاہوں سے گھٹتے ہوئے تباہ کن فاصلے کا اندازہ لگایا۔ پھر اس کی تلوار سورج میں چمکی اور اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی اور ان سے حکم کے الفاظ نکلے۔

انتظار کے سخت لمحے "...الوداع بھائیو!..." کے الفاظ سے بھر گئے۔

اور اسی لمحے موت کا فاصلہ غائب ہو گیا، جاندار اور متحرک صفوں میں ڈوب گیا۔ سنگینیں زمین پر تنکوں کی طرح گر گئیں، متحیر اور مسرور سپاہی بھی ہنستے ہوئے اس انسانی سمندر میں گھل مل گئے۔ ان کے چہرے زرد تھے اور ہر ایک چہرے میں جوانی کی کوئی نہ کوئی خاص نشانی موجود تھی۔ یہ بھوری دیوار لامحدود، متحرک اور سیاہ صفوں میں اس طرح غائب ہو گئی جیسے

گرینائٹ کی چٹان کسی پتھریلے ساحل سے لڑھکتی ہوئی لہروں میں گر کر غائب ہو جاتی ہے۔

افسرنے اپنی بیکار، سرد تلوار نیچی کرلی اور دوسری طرف مڑ گیا۔ مشین گنیں بےڈھنگی معلوم ہونے لگیں۔

لاکھوں آدمی موت کا نغمہ گاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ قبرستان اور ماتمی موسیقی سے ایک روشن، نئی اور پر مسرت زندگی طاقت‌ور اور فتحیاب ہو کر ابھر رہی تھی۔ سورج کی روشنی میں درخشان زندگی کے آثار ہزاروں چہروں پر دکھائی دے رہے تھے اور فٹ پاتھ پر کھڑے ہوئے ہزاروں آدمی مارچ کرنےوالوں کا پرجوش خیرمقدم کر رہے تھے۔

جو خونی دھند پہلے جمع ہوئی تھی اس کا اب کہیں نام و نشان نہ تھا۔ زبانوں کا تلخ مزہ اور تیز، ناخوشگوار بو بھی غائب ہو چکی تھی۔

سورج صاف و روشن چمک رہا تھا اور شہر کی ہزاروں گھٹی ہوئی آوازوں میں پھر زندگی پیدا ہوگئی تھی۔

١٩٠٦ء

بغاوت

(۱)

''ب... بو... م!..''

بھاری دھماکے کی یہ مدھم آواز جس نے کھڑکیوں کے شیشے کھڑکھڑا دئے دور وسط شہر کی سڑکوں سے آ رہی تھی۔

''شروع ہو گئی...''

میں چاہے جو کروں، چاہے جہاں جاؤں، چاہے جس سے بات کروں تان یہیں ٹوٹتی تھی: ''شروع ہو گئی...'' گھر میں بچے ہنس رہے تھے، دروازہ بند ہونے کی آواز آئی، کوئی زور سے کھانسا لیکن اب بھی خاموش توپ کی ہلکی سی آواز ذہن میں گونج رہی تھی... ''شروع ہو گئی!...'' دل کسی آنےوالی زبردست مصیبت کے تکلیف دہ خیال سے پریشان ہو گیا یا کوئی خوش کن امید ابھری جس نے دل کی دھڑکن پل بھر کے لئے روک دی۔ یہ مصیبت یا خوشی کا احساس دل میں گھر کر گیا۔

''ارے، میرے خدا!...'' باورچن نے جو ریازان کی ایک عورت تھی سر دروازے میں ڈالکر جھانکا اور ذرا اچھل کر اپنی رانیں پیٹتے ہوئے کہنے لگی۔ ''ارے آدمیوں کو تو دیکھ... ہر جگہ بھرے ہوئے ہیں! پوری تویرسکایا اسٹریٹ ان سے پٹی پڑی ہے۔ تل‌چٹوں کی طرح ایک دوسرے سے گتھے ہوئے ہیں... اور توپیں استراستنوئی خانقاہ سے گولہ باری کر رہی ہیں۔''

میں باہر نکلا۔ توپوں کی گرج کے وقفے میں اکتا دینے والا سناٹا ہو جاتا۔ لوگ فٹ پاتھ پر حسب معمول گذر رہے تھے اور برف ان کے پیروں تلے چرمرا رہی تھی۔

سرد آسمان کے پس منظر میں آگ بجھانے والوں کے پہرے کا مینار صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہاں سے آتے ہوئے مدھم دھماکوں کا خیال نہ کروں اور اس تازہ اور جاں بخش ہوا سے اپنے پھیپھڑے پوری طرح بھر لوں جو کانوں اور گالوں پر ٹھنڈی ٹھنڈی لگ رہی تھی لیکن سرد آسمان کے پس منظر میں بلند پہرے کے مینار نے کہا: ''شروع ہو گئی...''

ہر چیز حسب معمول تھی، صرف آنے جانے والے لوگوں کے مجمع میں کوئی کہہ رہا تھا:

''ارے کیا بتاؤں کہ وہ کس طرح ایک طرف گرا اور پھر بکھر گیا...''

دوکانوں پر عجیب ویرانی برس رہی تھی۔ سب اچھی طرح بند تھیں یا ان میں تختے لگے ہوئے تھے۔ جوں جوں میں آگے بڑھتا گیا زیادہ آدمی ملتے گئے اور میں ان کی تیز، ان میل باتیں سننے لگا۔ لوگ ذرا دیر کے لئے کھڑے ہو جاتے، فوراً ایک حلقہ بن جاتا اور آپس میں جلدی جلدی، پریشانی کے عالم میں اس طرح باتیں ہونے لگتیں جیسے ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہوں حالانکہ ان کی جان پہچان کبھی نہ تھی۔

ایک معمر عورت جو غالباً جرمن تھی اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ سینے پر باندھے کھڑی تھی اور اس کے ہیٹ کے پر بھی کانپ رہے تھے۔ وہ کہنے لگی:

''میں نے کہا: 'مجھے جانے دو، مجھے ڈر لگتا ہے...' اور اس نے کہا: 'مت ڈرو...' اور ہم نے دیکھا... ب... بو... م اور اس کا سر غائب تھا، اس کی گردن سے خون نکل رہا تھا... اس کی گردن سے فوارے کی طرح خون...''

وہ کھڑی تھی، اس کے چہرے سے وحشت برس رہی تھی اور وہ قریب کھڑے ہوئے ایک آدمی کے اوورکوٹ کا بٹن مروڑ رہی تھی... جو لوگ وہاں کھڑے ہوئے اس کی باتیں سن رہے تھے، ان کے چہروں پر خفگی کے آثار تھے۔ وہ عورت کے اس قصے پر یقین

کرنا نہیں چاہتے تھے لیکن توپوں کی مدھم آواز ان کو اس بات کا یقین دلا رہی تھی۔

پھر میں مورچوں کے پاس پہنچ گیا۔ لوگ بڑے بڑے پھاٹک قبضوں سے نکال رہے تھے، لوہے کے جنگلے اور تار کے کھمبے اکھاڑ رہے تھے۔ سڑکوں کے آر پار ڈوریوں سے سرخ جھنڈے لٹک رہے تھے۔ فٹ پاتھوں پر تنگ راستے بنا دئے گئے تھے اور ہر شخص فرمانبرداری کے ساتھ اس تار کے نیچے سے جھک کر جا رہا تھا جو کھلی جگہوں کے آر پار لگا تھا۔

توپوں کی آواز اب زیادہ صاف سنائی دینے لگی، ہر مرتبہ زمین کانپ جاتی۔ لوگ اب وہاں چل نہیں رہے تھے۔ بلکہ بھاگ رہے تھے۔ ان کے چہرے زرد اور پریشان تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ چہرے کسی نے کچل دئے ہیں۔

''تم کہاں گھسے جا رہے ہو؟'' ایک پستہ‌قد بڑھا غصے سے مجھ پر چیخا اور ساتھ ہی دوچار ناقابل بیان القاب بھی جڑ دئے۔ ''کیوں مصیبت میں مبتلا ہونا چاہتے ہو؟ وہاں مشین گنیں ہیں...''

''اچھا... خوش کر لینے دو ان کو اپنا دل'' ایک نوجوان نے اسی طرح غصے کے لہجے میں جواب دیا اور اپنا مکا اس طرف تانا جدھر بڈھے نے مشین گنیں بتائی تھیں۔ ''خوش ہو لینے دو ان کو... ان کو...'' اور جلدی سے دوڑ کر میرے پیچھے ہو لیا۔

ویران تویرسکایا اسٹریٹ قسمت کی لکیر کی طرح چوراھوں سے گذرتی اور پھیلتی چلی گئی تھی۔ وہاں کوئی نہ تھا لیکن موڑوں کی آڑ میں مشتاق تماشائیوں کا مجمع تھا۔ عورتیں، بچے اور سڑک پر سودا بیچنے والے۔ وہ موڑ کے پار جھانکنے کے لئے اپنی گردنیں نکالتے اور پھر سمٹ جاتے۔

میں نے اپنے قدم دھیمے کر دئے۔ میرے سامنے ٹھیک کونے میں ایک زبردست دھما کا ہوا۔ دھوئیں اور آگ کے درمیان کسی سیاہ چیز کے ٹکڑے ہوا میں اڑے اور پنکھے کی شکل میں چاروں طرف پھیل گئے۔ میری طرف لوگ اپنی پوری طاقت سے بھاگتے چلے آ رہے تھے۔ ان کے آگے ایک بھاری بھرکم لال داڑھی والا آدمی بھاگ رہا تھا، اس کے دانت اور مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں، اس کی

پیشانی سے ناک اور گال تک ایک سرخ لکیر تھی جو گھنی لال داڑھی میں جا کر غائب ہو گئی تھی۔ تقریباً بارہ سال کی ایک لڑکی بدحواس چیخ رہی تھی:

''ارے — اماں۔ ارے — ارے...''

یہ چیخ بڑی دیرتک ہوا میں گونجتی رہی اور پھر سڑک کے سرے پر جا کر کہیں ختم ہوگئی۔

''ارے — اماں — ارے — ارے...''

ایک بوڑھی عورت بھاگی جا رہی تھی، اس کی آنکھوں کی پتلیاں تک نکلی پڑ رہی تھیں۔

''پروردگار تو قادر مطلق ہے، بھر دے زمین اور آسمان کو...''

کسی گولے نے سولہ تماشائیوں کو گھائل کر دیا تھا۔ کچھ زخمی تو خود بھاگے، کچھ کو لوگ اٹھا لے گئے۔ چار آدمی برف پر بےحس و حرکت پڑے تھے۔ پانچواں آدمی حیرت کے عالم میں اب بھی کھڑا تھا پھر وہ ہلکا سا لڑکھڑایا اور تختے کی طرح سیدھا منہ کے بل برف پر گرا اور دوسروں کی طرح بے حس و حرکت ہو گیا۔ پاس ہی دو دکش کی شکل کا ایک سوراخ ہو گیا تھا۔ سوراخ کے چاروں طرف خون کے دھبے اور کسی سیاہ چیز کے ٹکڑے تھے۔ یہ کپڑے یا انسانی اعضا تھے۔

اب کوئی آدمی نہیں نظر آ رہا تھا۔ میں نے موڑ سے آگے بڑھ کر دیکھنا چاہا جیسے مجھے اس طرف کوئی کھینچ رہا ہو۔ مجھے بڑی کوفت تھی اور ساتھ ہی ڈر بھی معلوم ہو رہا تھا لیکن میں ادھر اس طرح کھنچا جا رہا تھا جیسے کسی غار میں جھانکنے جا رہا ہوں جو منہ پھاڑے کھڑا ہے۔

میں ایک قدم آگے بڑھا اور میرا کلیجہ منہ کو آ گیا۔

''ایک منٹ رکو...''

میں پیچھے مڑا۔ جس نوجوان نے چلا کر یہ کہا تھا: ''ان کو خوش ہو لینے دو،'' قریب کے پھاٹک سے باہر نکلا۔

''ذرا رکنا، ابھی ایک اور آئیگا۔''

اسی وقت ایک اور کان پھاڑ دینےوالا دھماکا سامنے والے کونے میں ہوا۔ مختلف سمتوں میں دھواں اور آگ پھیل گئی۔ برابر کے

گھروں سے پلاسٹر برسنے لگا اور کھڑکیوں کے شیشے چور ہو کر دور دور تک پھیل گئے۔
''آو، اب چلیں۔''
جب میں نے موڑ سے نکل کر چاروں طرف دیکھا تو مجھے محسوس ہوا کہ میری گدی ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ تویرسکایا اسٹریٹ دونوں طرف اس طرح ویران تھی جیسے وہاں موت کا راج ہو۔ دور، بہت دور چھوٹے چھوٹے سپاھی کھلونے جیسی توپوں کے گرد دوڑ رہے تھے۔
''آؤ، یہاں سے چلو۔''
میں چند مکانات اور آگے بڑھ گیا۔
''کس پر یہ گولہ‌باری کر رہے ھیں؟''
''محض تفریحاً۔''
میں نے ریوالور کا خانہ دیکھا جو اس کے کھلے اوورکوٹ کے نیچے سے جھانک رہا تھا۔
''تم ملیشیا میں ہو؟''
''ھاں۔''
''اتنے... کم کیوں؟''
''ہم بہت کم ھیں لیکن دیکھو تو کتنی توپیں ھمارے لئے آئی ھیں۔''
''اور پرامن لوگوں کو مارا جا رہا ہے۔''
''کیونکہ لوگوں کو کچھ پتہ تو ہے نہیں۔ جہاں ان کی ضرورت نہیں ہے خواہ مخواہ کے لئے وہاں بھی پہنچ جاتے ھیں... ان کو دیکھ بھال کر گھر سے نکلنا چاھئے اور اپنے کو چھپائے رکھنا چاھئے۔ لیکن وہ آ کر مصیبت میں پھنس جاتے ھیں۔ آج ان تماشائیوں کی کافی تعداد زخمی ہوئی ہے لیکن ھمارے دستے کا ایک آدمی بھی ابھی تک زخمی نہیں ہوا ہے۔''
میں واپس گیا۔ گولہ‌باری جا ری تھی۔ کبھی توپوں کی باڑ چلتی اور کبھی ایک ھی توپ کی آواز فضا میں گونجتی۔
شفق پھول رھی تھی۔ چوراہے پر ھر طرف سرخ شعلے لہرا رہے تھے۔ مجمع ان گھروں کے پھاٹک جلا رہا تھا جن کو مالکوں نے بند کر رکھا تھا۔ گورنر جنرل کا یہ اعلان دیواروں پر لگا تھا

کہ جو لوگ پھاٹک نہ بند کرینگے ان پر تین ہزار روبل جرمانہ کیا جائیگا۔

رات ایسی اندھیری تھی کہ ھاتھ کو ھاتھ نہیں سجھائی دیتا تھا۔ سڑکوں پر کوئی لیمپ یا روشنی نہیں نظر آ رہی تھی۔ توپخانے کی گولہ‌باری ختم ہو چکی تھی لیکن اس کی جگہ رائفلوں نے لے لی تھی۔ جابجا ایک آدھہ گولی چل رہی تھی لیکن بعض جگہوں پر دیر تک بوچھار ھوتی تھی۔ یہ کہنا ناممکن تھا کہ کون گولی چلا رہا تھا اور کہاں۔ اس اندھیرے گھپ میں مختصر اور تیز تڑاتڑ کی آوازیں بہت ھی تکلیف‌دہ اور بھیانک معلوم ھو رھی تھیں۔ رائفل کی اٹکل پچو گولیاں میلوں تک چلی جاتیں اور ایسے لوگوں کو زخمی کر دیتیں جن کا لڑائی سے کوئی تعلق نہ تھا۔

برف میرے پیروں کے نیچے چرچرا رھی تھی۔ آدمی کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔

(۲)

صبح کو عام طور سے سناٹا رہتا لیکن ایک بجے تک پھر گولہ‌باری شروع ھو جاتی۔ سڑکوں پر موت کا سکوت طاری رہتا۔ لیکن ھر پھاٹک، دروازے اور سڑک کے چوراھے پر لوگ جتھوں میں جمع رہتے۔ وہ پولیس اور فوج کے مظالم کی داستانیں بیان کرتے، مزدوروں کی فوج کی بہادری کے قصے سناتے اور بڑے شوق سے اس خونی ڈرامے میں حصہ لینے والے اس یا اس فریق کی کامیابی پر خیال آرائیاں کرتے۔

''وہ ھماری سڑک پر مورچہ بنا رھے ھیں،، ایک خادمہ لڑکی نے ذرا سہمی سہمی لیکن پرمسرت آواز میں کہا۔

''کہاں؟،،

''شہر کے پھاٹکوں کے پاس۔،،

انقلاب یا بغاوت کے نظرئے کے ساتھ ھمیشہ کسی حیرت‌انگیز یا غیرمعمولی چیز کا تصور ھوتا ھے۔ لیکن میں جب شہر کے پھاٹکوں پر پہنچا تو وھاں ھر چیز توقع سے زیادہ معمولی پائی۔ لوگ گا رھے تھے، ھنسی مذاق کرتے جاتے تھے اور تار کے کھمبے اکھاڑتے

جاتے تھے - وہ پھاٹک، تختے، شہتیر اور برف سے بھری ہوئی گاڑیاں کھینچ کر لا رہے تھے - آن کی آن میں ٹیلیفون اور ٹیلی گراف کے تاروں میں لپٹی ہوئی رکاوٹیں اونچی ہو گئیں - فٹ پاتھوں اور مکانوں کے پھاٹکوں پر لوگوں کا مجمع تھا -

''بھائیو - دیکھو نا، عورتیں بھی مورچے پر آ گئی ہیں... اب دوباسوف* کا پٹرا ہو گیا... ہا - ہا - ہا...،،

اس مذاق کو سن کر سب ہنس پڑے -

پریسنیا پل کی طرف ہر سڑک کے سرے پر یکے بعد دیگرے مورچے دکھائی دینے لگے - اچانک تماشائی غائب ہو گئے - برف سے سفید سڑک سنسان، ویران اور ڈراؤنی ہو گئی - سڑک پر بکھرے ہوئے، شہتیروں، تختوں، کھمبوں اور الٹی ہوئی برف گاڑیوں نے مکانوں، کھڑکیوں، مضبوطی سے بند دوکانوں اور خالی پھاٹکوں پر ایسی ویرانی طاری کر دی جیسے وہ سخت انتظار کے عالم میں کھڑے ہوں -

میں بھی ایک گلی میں گھوم گیا -

''کیا معاملہ ہے؟،،

''کزاک!،،

اس مختصر سے لفظ کے ساتھ ہی پوری خالی سڑک اور شہتیروں کے ڈھیر یکساں اور لگاتار جلنے والی بھوری آگ سے روشن ہو گئے - اس منظر کو دیکھ کر آدمی کے دل میں خواہ مخواہ یہ سوال پیدا ہوتا تھا: ''دیکھئے- یہ کس کے لئے آخری منظر ثابت ہو؟،، پھاٹکوں پر تماشائیوں کی بھیڑ لگ گئی - ایک نوجوان نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور چلا کر کہا:

''نمبر ایک!...،،

سڑک کی موڑ کے قریب پھاٹک پر آدمیوں کا ایک جتھہ آ گیا - ان کے ہاتھوں میں ریوالور تھے -

''آپ سب چلے جائیے - سب چلے جائیے... جب وہ آئینگے تب آپ لوگ بھاگیں گے اور انتشار پیدا کرینگے،، نوجوان نے تماشائیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا -

---

* و - دوباسوف — ماسکو کا گورنر جنرل تھا -

''یہ مزدوروں کی فوج کا سپاہی ہے،، لوگ وہاں سے جاتے ہوئے ایک دوسرے سے سرگوشی میں کہہ رہے تھے۔ ان کی اس سرگوشی اور نگاہوں میں مزدوروں کی فوج کیلئے عزت اور خوف تھا۔ ان کو یہ توقع تھی کہ یہ فوج کوئی کارنامہ کر دکھائیگی۔

میں نے سڑک کی طرف دیکھا۔ دور، کزاکوں کی ایک بھوری لائن گھوڑوں سے اتر کر سڑک پر پھیل گئی تھی اور آگے بڑھ رہی تھی۔ ان کے پل پر پہنچتے ہی پوری لائن سے آگ کی ایک لکیر سی چمکی اور ٹرٹر... ٹرٹرٹر... ٹرٹر ٹرٹر کی آواز گونجی جیسے کوئی چھالٹین کا ایک بہت بڑا خشک اور کلف کیا ہوا تھان پھاڑ رہا ہو۔ گولیوں کی بوچھاڑ بری طرح ہو رہی تھی۔ گولیاں پرنالوں سے ٹکرا کر شور پیدا کر رہی تھیں۔ ان کی بوچھاڑ خاص طور سے مکانوں کے پھاٹکوں پر تھی... ٹر... ٹرٹر... ٹرٹرٹر... میں گلی کے ایک دروازے میں گھس گیا۔ وہاں تقریباً بیس راہی اور تماش بین جمع تھے۔ ایک عورت پریشانی کے عالم میں دھکے دے کر ادھر ادھر گھسنے کی کوشش کر رہی تھی اور کہہ رہی تھی:

''میرے خدا، میں کہاں...،،

چھالٹین برابر پھٹتی رہی۔ رائفل کی آوازوں میں جب وقفہ ہوتا تو ریوالوروں کی آواز سنائی دینے لگتی۔ سڑک کے دوسری طرف قومی فوج کا ایک سپاہی گھٹنے پر جھکا، رائفل سے نشانہ باندھا اور گولی چلا دی۔ اچانک مزدوروں کی فوج کے سپاہیوں میں غل اور قہقہے کی آوازیں آئیں۔

''شاباش بہادر... شاباش...،،

چھالٹین پھٹنے کی آواز بند ہو گئی۔ لوگ پھر سڑک پر نکلنے لگے۔ میں بھی ان کے ساتھ نکلا۔ ہر جگہ لوگوں کی بھیڑ تھی۔ کزاکوں نے اپنے چار زخمی اٹھا لئے تھے اور پرا باندھ کر واپس جا رہے تھے۔ وہ دور سے ایک بھورا دھباسا معلوم ہوتے تھے۔

ایک مرتبہ پھر کام زوروں سے ہونے لگا۔ یکے بعد دیگرے مورچے بننے لگے۔ پل کے قریب اور سڑک کے سرے پر آخری مورچہ بنایا گیا۔ اس کے اوپر ایک جھنڈا فاتحانہ لہرا رہا تھا۔ اور دور پریسنیا کا پہرے کا مینار بڑی خاموشی سے اس جھنڈے کو گھور رہا تھا۔

(۳)

رات کو شہر میں بالکل سناٹا ہو گیا ۔ رات کے گہرے اندھیرے میں مکانات دھندلے سیاہ ڈھیر سے دکھائی دیتے ۔ نہ تو کہیں روشنی نظر آتی تھی اور نہ کوئی آواز سنائی دیتی تھی ۔ کبھی کبھی کتے ایک دوسرے پر بھونکتے اور پھر سناٹا چھا جاتا ۔ شہر کی حالت اس بڑے گاؤں کی سی تھی جو رات کے آغوش میں آرام سے محو خواب ہو ۔

رات کے ساڑھے دس بجے ۔

ٹرٹرٹر ... ٹرٹرٹر ... ٹرٹرٹر ...

گولیوں کی باڑیں رات کے سناٹے اور سکون کو توڑنے لگیں ۔

ٹرٹر ... ٹرٹر ...

یہ آوازیں تو باہر ہمارے صحن سے آ رہی تھیں ۔ میں نے بڑی احتیاط سے کھڑکی کھولی ۔ وہ پھاٹک پر گولی چلا رہے تھے ۔ باڑ اور سڑک والے دروازے پر گولیاں ٹناٹن بج رہی تھیں ۔ پورے مکان میں سخت سناٹا تھا ۔ مزدور فوج کے لوگ یہاں نہ تھے کیونکہ یہاں نہ تو ان کے لئے کوئی آڑ تھی اور نہ نقل و حرکت کی گنجائش — صحن ایک بند جگہ تھی جس میں نکاس کا صرف ایک دروازہ تھا، اس لئے وہ آسانی سے یہاں گھس جاتے ۔ بہر حال فوجی صحن کی طرف اور گھروں کی کھڑکیوں پر گولیاں چلاتے رہے تاکہ لوگ ڈر جائیں اور باہر نہ نکلیں لیکن ان کے گولی چلانے کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہاں مزدور فوج موجود نہ تھی جس پر وہ گولی چلا سکتے — مزدور فوج نے ان کو خوب چرکہ دیا تھا ۔

گولی چلنی بند ہو گئی ۔ سڑک پر سے کچھ آوازیں آ رہی تھیں ۔ رفتہ رفتہ آسمان پر ایک سرخ چمک سی پھیلنے لگی ۔ چنگاریاں زوروں میں اڑنے لگیں ۔ لکڑیاں جل رہی تھیں اور ان سے کڑاکے کی آواز نکل رہی تھی ۔ فوجیوں نے مورچوں میں آگ لگا دی تھی ۔

کسی نے زور سے اپنی ناک صاف کی ۔ یہ پرامن آواز سرد رات کی فضا میں تسلی‌بخش تھی ۔ ایک ایسے جوان سپاہی کی صورت آنکھوں کے سامنے آ گئی جو اپنی انگلیاں وردی کے دامن سے صاف کر رہا ہو ۔ یہ ایک ایسے کسان کا موسم‌زدہ نرم لیکن ذرا احمقانہ چہرہ

تھا جسے زبردستی اپنا کھیت چھوڑنے پر مجبور کیا گیا تھا اور اسے وہاں واپس جانے میں بڑی خوشی ہوتی۔

سرخ چمک میں اور اضافہ ہو گیا۔ اس خونی چمک میں مکانات اور ان کی بے جان اور بےنور آنکھوں کی طرح کھڑکیاں اداس اداس معلوم ہوتی تھیں۔ پھر آگ ذرا کم ہو گئی، بالکل خاموشی چھا گئی۔ فوجی چلے گئے اور پھر ڈراؤنا سناٹا چھا گیا۔ کتے اب بھی بھونک رہے تھے۔

''چلو، خاتمہ ہو گیا۔''

میں محسوس کرنے لگا جیسے مجھے قبر کا عذاب پیسے ڈال رہا ہے۔ میں جانتا تھا کہ کیسی ظالمانہ سزا ملیگی اور کتنا قتل و غارت ہوگا۔ لیکن صبح کو مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ ابھی خاتمہ نہیں ہوا ہے۔ نئے مورچے بنا لئے گئے تھے جو بڑے فخر سے سر بلند کھڑے تھے اور سرخ جھنڈا اب بھی بڑی شان سے لہرا رہا تھا۔ پورے شہر میں بغاوت دبا دی گئی تھی لیکن پریسنیا یکہ و تنہا، مورچہ‌بند، اداس لیکن فخر سے سر اٹھائے آخری مقابلے کے لئے تیار کھڑا تھا۔

مجھے شہر سے لوٹنا پڑا۔ میں گورباتی پل کی طرف سے پریسنیا چلا۔ وہاں سے مجھے بڑی پریسنیا اسٹریٹ پر سے گزرنا تھا لیکن مجھے روک دیا گیا۔

''ادھر مت جاؤ۔''

''کیوں؟''

''وہ پہرے کے مینار سے گولیاں چلا رہے ہیں... تمہارے گولی لگ جائیگی۔''

میں نے مینار کی طرف دیکھا۔ وہاں مجھے واقعی کئی شکلیں نظر آئیں۔ کبھی کبھی وہاں سے گولی چلنے کی آواز بھی آتی۔ پولیس اور فوج پریسنیا پر قبضہ نہیں کر سکے تھے اور اب کھسیانے ہو کر باشندوں پر گولی چلا رہے تھے۔ وہ آدمی دیکھتے ہی گولی چلا دیتے تھے۔ بڑی سڑک پر ہر جگہ گولیاں برس رہی تھیں۔ صحنوں میں اور مکانوں کی کھڑکیوں پر۔

بڑی پریسنیا اسٹریٹ دونوں طرف ویران تھی لیکن گلیوں میں، جو

پہرے کے مینار سے آڑ میں تھیں بہت سے لوگ جمع تھے۔ اس زمانے میں گھر پر بیٹھنا ناممکن تھا۔ میں لوگوں کی باتیں سننے لگا۔

"کل رات گورباتی پل پر ایک طالب علم گرفتار کیا گیا، تلاشی لینے پر اس کے پاس ریوالور نکلا۔ پھر ایک لڑکی اور مزدور پکڑے گئے۔ افسر نے ان سے کچھ نہیں پوچھا کہ وہ کون اور کیا تھے۔ صرف اپنا سر ھلایا... اور پھر..."

"کیا؟"

"ان کے گولی مار دی۔"

اچانک سخت سناٹا چھا گیا۔

"میں اب یہاں سے کیسے جاؤں؟"

"میں تمھیں راستہ بتاؤنگا۔"

ایک دس سالہ ذھین اور تیز لڑکا اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"تم راستہ بتا سکتے ہو؟"

"یقیناً۔"

وہ مجھے موڑ کی طرف لے گیا جہاں سڑک کے آرپار مورچہ بنا تھا۔

"پیٹ کے بل لیٹ جاؤ۔"

"کیا؟"

"پیٹ کے بل لیٹ کر رینگو۔ اگر یہ نہیں کروگے تو وہ تمھیں گولی کا نشانہ بنا دینگے۔"

اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ہم ٹھنڈی برف پر پیٹ کے بل چل رہے تھے اور مورچے کی آڑ لے کر پہرے کے مینار سے بچ رہے تھے۔ دوسری طرف ایک اور گلی میں کھڑے ہو کر ہم نے اوپر سے برف جھاڑی۔ میں نے لڑکے کو کچھ پیسے دئے اور وہ خوشی خوشی چھپکلی کی طرح واپس رینگ گیا اور اس بات کا انتظار کرنے لگا کہ جب تک مینار کے پولیس‌والے اس کو گولی کا نشانہ نہ بنا سکیں اس وقت تک وہ لوگوں کو راستہ بتاتا رہے۔

"دریائے ماسکو کی طرف!.."

"دریائے ماسکو کی طرف!..."

یہ الفاظ میرے دماغ پر نقش تھے، دن رات میرے دھیان سے نہیں اترتے تھے، خواہ میں کام کرتا ہوں یا سوتا ہوں۔ تین آدمی

ایک ساتھ چلے جا رہے تھے، شاید وہ ایک دوسرے کو جانتے بھی نہیں تھے۔ وہ خاموشی سے چل رہے تھے۔ ان کو ریازان، کالوگا اور دوسرے علاقوں کے لوگ رائفلیں کندھوں پر رکھے تین طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔

وہ بھی خاموشی سے چل رہے تھے۔

التجا، آنسوؤں یا مقابلے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ یہ سب چیزیں بیکار تھیں۔ سرد دھند میں دونوں طرف تاریک، خاموش اور ویران مکانات گذرتے جا رہے تھے۔ ممکن ہے مکانوں کے اندر لوگ سو رہے ہوں یا چل پھر رہے ہوں، باتیں کر رہے ہوں، کپڑے اتار رہے ہوں اور بچے رو رہے ہوں لیکن یہ تینوں جن مکانوں کے پاس سے گذر رہے تھے وہ باہر سے تاریک اور ویران معلوم ہوتے تھے۔

اب باڑیں اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر آ گئے اور ان کے بعد سوائے سرد دھند اور پیروں کے نیچے سفید برف کے اور کچھ نہ تھا۔ وہ رک گئے۔ تینوں کو مناسب جگہوں پر کھڑا کیا گیا۔ ایک لمحہ تک سخت سناٹا رہا۔ یہ تینوں اور ریازان اور دوسرے علاقوں کے کسان کچھ سوچ رہے تھے۔ کس چیز کے متعلق؟

پھر...

جب سپاہی چلے گئے تو سفید برف پر تین سیاہ داغ سے معلوم ہو رہے تھے۔

(۴)

میں بھاری زوردار دھماکوں کی آواز سے جاگ پڑا۔ ابھی اندھیرا تھا۔ میں اٹھ بیٹھا۔ بچے سو رہے تھے۔ نرس دوسرے کمرے میں کچھ کر رہی تھی۔ گولہ باری میں اضافہ ہو گیا تھا اور مکان ہل رہا تھا۔ گولہ باری کے درمیانی وقفوں میں مجھے مشین گنیں اور رائفلیں چلنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ عجیب طرح کھرچنے کی آواز، جیسے لوہے پر لوہا کھینچا جا رہا ہو، کھڑکی کے باہر تاریکی سے آ رہی تھی اور ان آوازوں سے مجھے بےچینی ہو رہی تھی۔

اچانک — دھڑام! ایک مختصر سی آواز ہوئی اور ایک گولی کھڑکی کے دوہرے شیشوں کو پار کرتی ہوئی سامنے کی دیوار

کے پلاستر میں پیوست ہو گئی۔ پلاستر کے ٹکڑے زمین پر ڈھیر ہو گئے۔

''ہائے — ہائے... مجھے مار دیا... ارے — ارے!'' کمرے میں ادھر ادھر بھاگتی ہوئی نرس چلائی۔

میں نے اس کی آواز سے اندازہ لگا لیا کہ اس کو کوئی گزند نہیں پہنچی ہے۔

''نرس، بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ! کھڑکی کے تختے کے اوپر سر نہ نکالنا۔ فرش پر بیٹھ جاؤ!'' میں نے چلا کر کہا تا کہ وہ گولیوں کی گرج میں میری آواز سن سکے۔

میں فرش پر رینگ کر دوسری طرف گیا اور فرش پر بیٹھے بیٹھے کپڑے پہنے۔ مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میں اپنے ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلکر بچوں کے پاس گیا۔ دونوں لڑکے خاموشی سے سو رہے تھے۔ ان کو کسی بات کی خبر بھی نہ تھی۔ میں نے ان دونوں کو بستر سے گھسیٹا اور اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے گیا جس کی کھڑکیاں گولہ باری کے رخ پر نہیں تھیں۔

چھوٹا لڑکا بری طرح رونے لگا۔ بڑے نے سہمی ہوئی آواز میں کہا:

''ابا، مجھے نیچے اتار دو، میں خود چلا جاؤنگا...''

''کوئی بات نہیں'' میں نے دروازے کی طرف رینگتے ہوئے کہا۔ ''بس اپنا سر اوپر نہ اٹھانا!''

''کیا کوئی خطرہ ہے؟''

''نہیں، نہیں، بس اپنا سر اوپر نہ اٹھانا۔''

دوروالے کمرے میں نوکر، مالک مکان اور اس کا خاندان سب جمع تھے۔ ہم سوفوں اور کرسیوں پر لیٹ گئے۔

معلوم ہوا کہ ہم یہاں بھی نہیں کھڑے رہ سکتے۔ دوہری کھڑکیوں کے اندر بھی رائفل کی گولیاں برماتی، مکان کی اندرونی دیواروں کو پار کرتی سامنے والی باہری دیوار کی اینٹوں میں تین چار انچ پیوست ہو رہی تھیں۔ ہم گولیوں کی ہلکی ہلکی ''ٹر ٹر'' اور پلاستر گرنے کی آواز برابر سن رہے تھے۔ پلاستر کی ایک ہلکی تہہ جلد ہی پورے فرش پر پھیل گئی۔

اجالا ہونا شروع ہوا۔ وقت بڑی جانکاہ سست رفتاری سے گذر رہا تھا۔ توپوں کی گرج ہو رہی تھی۔ عورتیں سوفوں میں اپنے سر

ڈالے رو رہی تھیں۔ بچے خاموش بیٹھے اس غیر معمولی منظر کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔

"آؤ۔ چلکر دیکھیں کہ کیا ہو رہا ہے"، مالک مکان نے کہا۔ اس کا چہرہ فق تھا اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔

سب لوگ جھکے جھکے میرے کمرے میں گئے اور ایک کونے میں دبک کر کھڑکی سے جھانکنے لگے۔ صبح کی روشنی بڑھ گئی۔ ہماری پانچویں منزل کی کھڑکی سے سڑک اور پریسنیا پل جہاں سے گولیاں چل رہی تھیں بہت اچھی طرح دکھائی دے رہے تھے۔

"آخر وہ گھروں پر کیوں گولیاں چلا رہے ہیں!"، مالک مکان چلایا لیکن اس کا چہرہ دھلی چادر کی طرح سفید ہو رہا تھا۔

ہر مرتبہ کسی توپ کے دھانے سے آگ کی لمبی لکیر نکلتی تو کسی نہ کسی گھر میں دھوئیں کا ایک گیند پھٹتا، گولے کے ٹکڑے ٹکراتے، گری ہوئی اینٹیں دیوار میں سیاہ، منہ پھاڑے سوراخ چھوڑ جاتیں اور مسمار کھڑکیاں اپنی بےنور اور ڈراؤنی آنکھوں سے گھورتی رہ جاتیں۔

پھر ہماری منزل کے نیچے ایک دھماکا ہوا۔ سبزی مائل دھوئیں کا گھنا بادل ہوا میں بلند ہو کر ہماری کھڑکی کے پاس سے گذرا اور ایک سکنڈ کے لئے ہر چیز نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ ہمارے نیچے چوتھی منزل پر ایک گولہ گرا تھا۔

پاگلوں کی طرح میں نے اپنے دونوں بچوں کو دبوچا اور زینے پر نیچے کی طرف بھاگا۔ اس وقت تمام احتیاطی تدابیر بھول گئیں۔ میرا مالک، اس کی بیوی، بچے اور نوکر میرے پیچھے بھاگے۔ گولیاں برابر پلاستر میں پیوست ہو رہی تھیں۔ ہمیں اس بڑے زینے سے اترنا تھا جو مکان کی پانچوں منزلوں کے لئے تھا۔ زینے کی کھڑکیاں جن سے روشنی آتی تھی گولیوں سے چھلنی ہو رہی تھیں۔ پل پر سے گولے برسانےوالی توپوں کے شعلے ہمیں نظر آ رہے تھے۔ تھوڑے بہت کپڑے پہنے لوگ ہانپتے کانپتے اپنے اپنے فلیٹ چھوڑ کر نیچے کی طرف بھاگ رہے تھے۔ اس انسانی سمندر میں مرد اور عورتیں، بوڑھے اور بچے سب گڈمڈ تھے۔

لڑکے مجھ سے چمٹے ہوئے تھے۔ ان کے بازو میری گردن کو زوروں سے بھینچے ہوئے تھے۔ ہر لمحے مجھے یہ خیال آ رہا تھا

کہ اب ان کے بچکانے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑی اور تب ان کے ننھے منے جسم میری گود میں بےجان پڑے ہونگے۔ میں پاگلوں کی طرح زینے پر بھاگ رہا تھا، یہ بھی نہیں دیکھ رہا تھا کہ میرا قدم کہاں پڑ رہا ہے۔ میں ڈراؤنی اور خاموش کھڑکیوں کے پاس سے تیزی سے گذر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے نچلی منزل کوسوں دور ہے۔ میرے پیر کانپ رہے تھے اور کنپٹیاں زوروں سے تپ رہی تھیں۔

آخرکار صحن میں پہنچ کر میں نے اطمینان کی سانس لی۔ صحن میں عمارتوں اور باڑوں کی آڑ تھی۔ لیکن ہمیں یہاں سے بھی بھاگنا پڑا۔ گولیاں چاروں طرف سنسنا رہی تھیں اور برف اچھال رہی تھیں۔ وہ زمین کے اندر اور باڑ کے پاس لگے ہوئے کوئلے کے ڈھیر میں پیوست ہو رہی تھیں۔ مینار سے آبادی پر گولہ‌باری ہو رہی تھی۔

لڑکوں کو اپنے بازوؤں میں سنبھالے میں ایک مکان کے نچلے حصے میں جا گھسا۔

اس میں تاریکی اور نمی تھی اور چوہوں کی بو آ رہی تھی۔ یہاں بیٹھے، کھڑے اور چلتے پھرتے آدمیوں کے دھندلے سائے نظر آ رہے تھے۔ گولیوں کی آواز اب بھی مدھم سی سنائی دے رہی تھی۔ مجھ پر ایسی تھکن طاری ہو گئی جس کا اس سے پہلے مجھے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میرے بازو اور پیر کٹ کر گر جائیں گے۔ میں اپنے حواس مجتمع کرنے کے لئے ایک بکس پر بیٹھ گیا۔

”بوا،، چھوٹا لڑکا ہنکنے لگا۔

”چہ — چہ — چہ،، ایک سہمی ہوئی عورت نے چپکے سے کہا اور دوڑ کر لڑکے کا منھ اپنے ہاتھ سے بند کر دیا۔

سب لوگ کھسر پھسر کر رہے تھے۔ وہ اس طرح پنجوں کے بل چل رہے تھے جیسے گھر میں میت ہونے پر لوگ کرتے ہیں۔ گویا اس طرح سے ان کی جانیں بچ جائینگی۔

اور بڑھیا کہاں تھی؟ وہ ماری گئی یا کسی دوسرے گھر کے تہہ خانے میں گھس گئی۔

اس کھسر پھسر میں دعا کے الفاظ سنائی دئے:

”اے خدا، تو ہم لوگوں کو سزا کیوں دے رہا ہے؟،،

کوئی چپکے چپکے کونے میں دعا کر رہا تھا اور مجھے اس کے کچھ الفاظ سنائی دئے:

''اے، منصف خدا... رب اکبر... تیرے ھاتھوں میں... ھمیں نجات دلا، ھم پر رحم کر... بھوک، بیماری اور حملے سے...''

''اگر انھوں نے اوپر کی منزلوں کو تباہ کر دیا تو وہ ھمارے اوپر پھٹ پڑینگی اور ھم کو کچل ڈالینگی...''

کوئی کھڑا ھوکر اپنے ھاتھوں سے تہہ‌خانے کی چھت ٹٹولنے لگا۔

''چھت مضبوط ھے۔''

''اس میں لوھے کے شہتیر پڑے ھیں، یہ پانچوں منزلوں کو سنبھال لینگے۔''

''اگر عوام نے ان کو بنایا ھے تو سہار لے جائینگے لیکن اگر ٹھیکہ‌داروں نے...''

''ان کو پتہ نہ تھا کہ تم لوگ یہاں چھپنے کے لئے آؤگے ورنہ وہ انھیں زیادہ مضبوط بناتے...''

تہہ خانے کے دوسرے حصے میں وہ بھٹی تھی جس کے ذریعہ مکانات گرم رکھے جاتے تھے۔ لہراتی ھوئی سرخ لپکیں بھٹی کی سلاخوں سے نکل کر کچے فرش پر پھیل رھی تھیں۔ لوگ بھٹی کے پاس آ کر اپنے ھاتھ سینکنے لگے۔

کالا اور اکل کھرا بھٹی جھونکنے والا کوئلوں کے ڈھیر پر بیٹھا تھا۔ وہ سیاھی میں بالکل ضم ھو گیا تھا۔ وہ تولا ضلع کا رھنے والا تھا، بے گھردر، آوارہ اور بیکار۔ عمارت کے منتظم نے رحم کھا کر اس کو رکھ لیا تھا۔ وہ بھٹی جھونکتا تھا اور اس کو سونے کی جگہ اور کھانا مل جاتا تھا۔

''ایوان، کیا تم ڈر گئے ھو؟''

''میرے لئے سب ایک ھے'' اندھیرے سے جواب ملا۔

''اور اگر تم مار ڈالے گئے؟''

''تو پھر کیا کروں؟''

اور پھر تھوڑی دیر خاموش رھنے کے بعد اس نے کہا:

''وہ تو ھم کو بہت دنوں سے مار رھے ھیں۔ اس میں نئی بات کیا ھے؟''

''کیسے تم کو مار رھے ھیں؟''

"ہاں، مجھکو مار رہے ہیں۔ میرے اور میری بیوی کے علاوہ میرے خاندان میں آٹھ بچے تھے۔ اب دو ہیں۔"

"باقی کیا ہوئے؟"

"مر گئے۔ بھوکوں مر گئے... قحط کا علاقہ..."

پھر اس اندھیرے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ آگ کے سرخ سائے فرش پر کانپ رہے تھے اور گرم گرم سفید راکھ بھٹی سے اچھل اچھل کر باہر آ رہی تھی۔ چپکے چپکے سب لوگ دوسرے کمرے میں واپس گئے۔ مجھے یاد آیا کہ میں کس طرح اپنے بچوں کو لپٹائے زینے سے نیچے بھاگا تھا اور یہ آدمی بھی اپنے بچوں کو خوب لپٹائے تھا یہاں تک کہ یکے بعد دیگرے ان کے ننھے ننھے ہاتھ اس کی گردن سے چھٹ گئے تھے اور ان کے شل، بھوک سے جھانجھر بدن اس کی گود میں بےسکت پڑے تھے...

میں باہر نکلا، سنسناتی گولیوں کے درمیان صحن پار کرکے دوڑتا ہوا اپنے گھر پہنچا تاکہ بچوں کے گرم کپڑے لے آؤں کیونکہ تہہ خانے میں نمی تھی۔

خالی کمروں میں پیروں کے نیچے پلاستر چرمرا رہا تھا۔ دیوار کے قریب سمٹ کر میں نے کھڑکی سے جھانکا۔

اس جگہ جہاں ایک گھنٹہ پہلے عورتوں اور بچوں سے بھرے پرے بڑے بڑے رہائشی مکانات تھے جن میں محنت، اور دنیا بھر کے دھندھوں اور زندگی کی چہل پہل تھی اب شعلوں کا سمندر اسنڈ رہا تھا۔

کھڑکیوں سے خیرہ کن چمکدار آگ کے آسیبی شعلے پاگلوں کی طرح اچھل کود کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی خونیں نوکیلی زبانیں لہرا رہی تھیں۔ جابجا چمکدار لباس دکھائی دیتے اور غائب ہو جاتے۔ یہ منظر ایسا ہولناک، پرفریب اور اژدھے جیسا تھا کہ اس کے اندر کبھی کبھی زندہ جانوں کو دیکھکر میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ ایک تیز جنون انگیز مسرت کے ساتھ یہ پراسرار، ناقابل بیان کھیل جاری رہا، یہ پرفریب وحشی رقص ہوتا رہا۔

اس روشن فضا میں کبھی کبھی سیاہ منہہ پھاڑے غار نظر آتے،

ان کے اندر آگ سے جلے ہوئے سیاہ شہتیر دکھائی دیتے اور ان پر گرم گرم سفید لہراتی ہوئی چنگاریاں دوڑتی نظر آتیں۔

لیکن یہ خوشی اور ہنگامہ بےجان تھا۔

آگ پھیلتی گئی۔ اب اس نے مکانوں کی ایک پوری قطار اپنی لپیٹ میں لے لی۔ دوسری طرف مکانوں میں بھی آگ لگی ہوئی تھی۔ وسطی پریسنیا کے پیچھے دھوئیں کا ایک زبردست بادل اٹھ رہا تھا۔ ایک ہی وقت میں بہت سی جگہوں پر مکانوں میں آگ لگی تھی۔ سب دروازوں اور کھڑکیوں سے ایک ساتھ دھواں نکل کر لہراتا اور پیچ کھاتا ہوا دور دور تک پھیل رہا تھا۔ چاروں طرف سے درجنوں شعلوں کی زبانیں دیواروں اور چھتوں کو چاٹ رہی تھیں۔ شعلے گرج رہے تھے اور گھڑگھڑاہٹ کی آواز آ رہی تھی، ان کے اوپر دھواں اٹھ رہا تھا اور چنگاریوں کی بوچھار ہو رہی تھی۔ پریسنیا پل کے اس پار ایک آگ کا سمندر تھا۔ چھتیں گر رہی تھیں۔ لیکن جلی ہوئی سیاہ چمنیوں کے کھمبے اب بھی دھوئیں اور شعلوں کے درمیان تباہ کاری کے عفریتوں کی طرح کھڑے تھے۔

یہ بہت ہی زبردست، بالکل ناقابل بیان اور انتہائی غیر فطری حادثہ تھا۔ یہ ایک پورے شہر کی تباہی تھی۔

میں بالکل مسحور کھڑا اس تباہی کے منظر کو دیکھ رہا تھا کہ ایک تیز کھٹکے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ایک گولی کھڑکی کے شیشے اور فریم کی لکڑی کو برماتی ہوئی دو دروازوں کو پار کرکے دوسرے فلیٹ کی دیوار میں پیوست ہو گئی تھی۔ یہاں سے چل دینا تھا۔ میں نے آخری مرتبہ نیچے دیکھا اور اپنی نظریں نہ ہٹا سکا۔ لوگ جلتی ہوئی عمارتوں کے چاروں طرف دوڑ رہے تھے۔

وہ کہیں سے دوڑ کر آئے تھے۔ ان کے ہاتھ دعا مانگنے کے انداز میں اٹھے ہوئے تھے۔ وہ جلتے ہوئے مکانوں کی طرف دوڑے اور اپنا سر ڈال کر دھوئیں کے اندر غوطہ لگا گئے۔ ان کے پیر کبھی کبھی دھوئیں سے باہر دکھائی دے جاتے تھے۔

چند گھڑیاں بڑی کوفت میں گذریں۔ وہ برسوں کے برابر ہو گئیں۔ کھڑکیوں کے باہر سیاہ دھواں لہرا رہا تھا۔ پھر اچانک ایک آدمی کا سیاہ خاکہ اور جھلسا ہوا سر دکھائی دیا۔ وہ چند

قدم دوڑا اور اس نے ایک تجربےکار آدمی کی طرح اپنی ہتھیلی وادکا کی بوتل کے پیندے پر مار کر اس کی ڈاٹ کھولی اور اپنا سر پیچھے کرکے کانپتے ہوئے ہاتھ سے قل قل کرتی ہوئی وادکا چڑھا گیا جو آگ کی روشنی میں خون جیسی سرخ معلوم ہو رہی تھی۔ سرکاری شراب کی دوکان میں آگ لگی تھی۔

اس آدمی کے چاروں طرف گولیاں سنسنا رہی تھیں، آگ پھیلی ہوئی تھی، دیواریں لہرا لہرا کر گر رہی تھیں۔ چھتیں نیچے آ رہی تھیں۔

(۵)

تہہخانے میں واپس آکر میں نے دیکھا کہ پہلے کی طرح بی دبی کھسر پھسر جاری ہے۔ نرس وہاں پہنچ گئی تھی اور بچوں کو پریوں کا کوئی قصہ سنا رہی تھی۔

''اور بھورے بھیڑئے نے شہزادے دلیر سے کہا کہ شہزادے میری پیٹھ پر بیٹھ جاؤ اور میں تم کو میدان اور جنگل، پہاڑ اور جھاڑیاں، سمندر اور دریا سب پار کرا دونگا...''

لڑکے پھٹی پھٹی آنکھوں سے بڈھی نرس کے جھریوں پڑے چہرے کو دیکھ رہے تھے۔

''بوا، تم روکیوں رہی ہو؟''

''ارے میرے خدا! کیا ہم کبھی یہاں سے نکل سکینگے؟'' نراش ہو کر ایک بیمار عورت نے کہا جو بستر پر بےحس و حرکت پڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''پریشان مت ہو، پیاری... تمہاری صحت کے لئے پریشان ہونا مضرترساں ہے'' اس کے بھائی نے سرھانے جھکتے ہوئے کہا۔

''پریشانی بری چیز ہے'' اس نے تلخی سے ہنستے ہوئے کہا۔

توپیں ہٹا لی گئی تھیں اور گولہباری کی آواز اب ہم سے دور کہیں آگے سنائی دے رہی تھی۔

''...پھر بھیڑئے نے اپنا برش اچھالا اور چوکڑیاں بھرتا روانہ ہو گیا...''

''برش کیسا؟'' ایک بچکانی آواز نے پوچھا۔

''چہ — چہ۔ یہ بھیڑئے کی دم ہوتی ہے۔''

کسی نے کچھ کھایا پیا نہ تھا - صرف بچوں کو ٹھنڈی چائے ملی تھی -
''ہم کب تک یہاں رہینگے - ہمیں یہاں سے نکلنا چاھئے - ''
''پھر جاؤ اور معلوم کرو - ''
''میں کہاں جاؤں؟ وہ گولیاں برسا رہے ھیں... تم جاؤ...''
''میں چلا تو جاؤں لیکن بچے جو ھیں... وہ کیا کرینگے اگر میں... تم تو جانتے ہو...''
''میں خود جاتا لیکن تولا میں میری ماں ہے اور میں تنہا روٹی کمانے والا...''
''دربان کو بھیجدو - یاکوف!''
''کیا بات ہے؟''
''ذرا جا کر معلوم کرو کہ آیا ہم یہاں سے نکل سکتے ھیں یا نہیں - ''
سب لوگ دربان کی طرف مخاطب ہو گئے :
''یہ ناممکن ہے...''
''ہم یہاں بیٹھ کر اس بات کا انتظار نہیں کرینگے کہ وہ ہمیں گولی کا نشانہ بنا دیں یا جلا دیں - ''
''خدا جانے کیا ہو رہا ہے... تم کچھ کرو نا، کھڑے کیا ہو؟''
دربان باھر نکل گیا -
''میں تمھیں یہ بتا سکتا ہوں'' ایک سپاٹ، مدھم آواز سنائی دی - ''میں تمھیں یہ بتا سکتا ہوں کہ آگ ہم تک پہنچیگی...''
''ارے ختم کرو نا - میں برداشت نہیں کر سکتا جب لوگ ایسی باتیں شروع...''
''کیسی آگ؟... کس رخ کو بڑھ رہی ہے؟ کئی میل دور...''
''خدا کا شکر ہے کہ ھمارا گھر کافی بڑا ہے، پکا ہے اور دوسرے گھروں سے الگ تھلگ بھی...''
''تم ہمیشہ...''
لوگ اس سے نفرت کرتے تھے - مختصر خاموشی کے بعد پھر اس نے اپنی بات اسی مدھم، سپاٹ لہجے میں جاری رکھی :
''الگ تھلگ ہے!.. وہ باڑوں کے ذریعہ دوسرے گھروں سے

ملا ہے۔ اور جانتے ہو باڑ کے پاس کوئلہ کا ایک بڑا ڈھیر لگا ہے... اگر اس میں آگ لگ گئی تو دروازے، کھڑکیوں اور فرش میں بھی آگ لگ جائیگی۔ اور تم معہ اپنی اینٹوں کے... پھر تم نہیں نکل سکوگے۔ صرف ایک دروازہ ہے اور وہ بھی کوئلہ کے ڈھیر کے پاس۔ اگر تم کھڑکی سے اتر کر گلی میں جانا چاہو تو وہ دیکھتے ہی گولی مار دینگے۔ جانتے ہو نا...''

ہر شخص جانتا تھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے سچ ہے پھر بھی سب اس کی باتوں سے نفرت کرتے تھے۔ ہر شخص نے ادھر سے منہ پھیر لیا اور باتیں بند کر دیں۔

ایک آدمی چوٹی دار ٹوپی اور سفید پیش‌بند پہنے تہہ‌خانے کے اندر آیا۔

''تم کون ہو؟''

''جنرل اسٹور کا اسسٹنٹ۔''

''وہی دوکان جل رہی ہے نا؟... بم سے آگ لگ گئی ہے؟''

''بم!...'' اسسٹنٹ نے غصے سے جواب دیا۔ ''بم سے اس میں آگ نہیں لگ سکتی تھی۔ ایک گھر میں بھی بم سے آگ نہیں لگی ہے۔ گولہ‌باری کے بعد جب ضلع سے قومی فوج کا صفایا ہو گیا اور فوج آ گئی۔ ہم خوش ہوئے کہ اب معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ پھر ایک افسر آیا اور اس نے ہم سے کہا: 'اس گھر سے نکلو، تم سب'۔ ہمارے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ 'فوراً نکلو۔ ہم گھر کو آگ لگانے جا رہے ہیں۔' ہم نے اس سے کہا کہ آگ نہ لگائی جائے۔ 'ہم انتظار نہیں کر سکتے۔ فوراً نکلو۔' دوکاندار نے گھٹنوں کے بل گر کر اس سے التجا کی۔ صرف ان کو اس بات کی اجازت ملی کہ وہ سامان کے چار بکس لے جا سکتے ہیں۔ سپاہیوں نے ہی چیز پر مٹی کا تیل چھڑک کر پانچ جگہ آگ لگا دی۔ اتنے لوگ عمارت میں تھے اور سب کے پاس سامان تھا۔''

کوئی سیاہ، سرد اور چپ چپی سی چیز اندر آ کر آہستہ آہستہ تہہ خانے کو بھر رہی تھی... ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی زبردست دیو اپنی بھاری توند کے بل زمین پر گر پڑا ہے اور اپنی اندھی آنکھوں سے ہماری طرف بے‌مطلب گھور رہا ہے، ہماری طرف جنون انگیز ظالم نگاہوں سے ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا ہے۔

''اور اب انھوں نے سوڑ کے مکان میں آگ لگا دی ہے، جو تمھارے برابر ہے۔ وہ جانتے تھے کہ ھوا اس طرف کی چل رہی ہے اس لئے انھوں نے آگ لگا دی ہے تاکہ پوری قطار میں''...

''آ... ہ... ہ...''

تمام آوازیں اچانک بیٹھ سی گئیں۔

''صاحبان... صرف ایک منٹ... ہمیں کھڑکی ڈھکنا چاھئے... گورنر جنرل... اور ذرا خاموش رھنا چاھئے۔ خدا کے لئے۔ چپ رھئے...''

انھوں نے کھڑکیاں ڈھک دیں اور پنجوں کے بل چل کر پھر سرگوشیاں کرنے لگے۔ گھپ اندھیرا تھا لیکن کھڑکی کی دراڑ سے جلتی ھوئی عمارتوں کی روشنی کا عکس ایک دھبے کی شکل میں چھت پر پڑ رھا تھا۔ چھت پر روشنی کی وہ خونی لکیر زیادہ روشن ھوکر پھر مدھم پڑ گئی۔ سب لوگ اس کو سانس روکے دیکھ رہے تھے۔

''وہ دربان کہاں گیا؟... میرے خدا، وہ دربان کہاں ہے؟'' کسی نے پاگلوں کی طرح چپکے سے پوچھا۔

''یاکوف، تم کہاں چلے گئے تھے؟ آخر تم یہ کیوں نہیں معلوم کرتے کہ ھم یہاں سے کب نکل سکینگے؟''

''ھونہہ، معلوم کروں... تم جاکر خود معلوم کر لو۔ میں نے اپنا سر نکالا، ذرا سا نکالا اور سپاھی نے گولی چلائی۔ میں نے اس سے کہا کہ 'مجھے بات تو کہنے دو'، اور وہ سنگین تان کر مجھ پر دوڑا اور اپنی سنگین سے پھاٹک کا کونا چھید ڈالا۔''

خاموش، فرماں‌بردار اور آرام‌طلب یاکوف کا لہجہ اب خودمختارانہ تھا۔ اب وہ دربان نہ تھا بلکہ ان تمام لوگوں کا برابری دار تھا جو تہہ خانے میں تھے کیونکہ سب کی طرح اس کو بھی جل مرنے یا گولی کا نشانہ بننے کا خطرہ تھا۔

یہ جاننا ممکن نہ تھا کہ دن ہے یا رات۔ غالباً رات تھی۔ چھت کے دھبے کی روشنی زیادہ خون‌آشام ھوتی جاتی تھی۔

''مجھے ایک بالٹی پانی چاھئے!''... ایک گمک دار دلیر آواز گونجی، اس چنگاری کی طرح جو اندھیرے، ھیجان اور بےحسی کو ختم کر دیتی ہے۔ یہ ایک لڑکے کی صاف آواز تھی جو اداس خاموشی اور بےجان سرگوشی کے درمیان گونج اٹھی تھی۔

''چپ - چپ - چپ...'' لوگ کود کر کھڑے ہو گئے اور اپنے بازو ہلا کر اس پر بڑبڑانے لگے ''خدا کے واسطے چپ رہ!''
ایک گیارہ سالہ لڑکا جس کے گال سرخ اور چہرہ گول تھا خوشی سے بتیسی نکالے آیا، اپنی بالٹی نل کے نیچے رکھ دی اور جھاگ دار پانی کی آواز اس ڈراؤنے کمرے میں گونجنے لگی۔
لوگ اس کے چاروں طرف جمع ہو گئے۔
''تم کہاں سے آئے ہو؟''
''راستے کے اس پار سے، سفید گھر سے...''
''تو سڑک پر نکلا جا سکتا ہے؟''
''بڑی خوشی سے، جہاں تمہارا جی چاہے۔''
ایک طرح کا بوجھ سا فوراً اٹھ گیا، سرپر سوار دیو غائب ہو گیا، ہر شخص مطمئن ہو گیا اور فوراً خوب چلا کر جلدی جلدی باتیں کرنے لگا۔
''دیکھو نا، میں نے تم سے کہا تھا۔ وہ جانور نہیں ہیں۔ آخر وہ مکانوں میں آگ کیوں لگاتے اور بیمار آدمیوں، عورتوں اور بچوں پر گولیاں کیوں چلاتے... ایسے آدمیوں پر جن کو ان باتوں سے کوئی مطلب نہیں ہے...''
''خدا کا شکر ہے... شکر ہے بادشاہ اور پیدا کرنے والے کا...'' بیمار عورت ایک کہنی پر ذرا اٹھی اور اپنی آنکھیں چھت کی طرف اٹھا کر بڑے جوش کے ساتھ اپنے اوپر صلیب کا نشان بنانے لگی۔
خوشی کی سسکیاں سنائی دینے لگیں۔
''بچو، اپنے کپڑے پہن لو۔''
''ایوان ایوانووچ، آپ نے میرے گلوشے* کہاں رکھے؟''
''اچھا تو اب گولی نہیں چل رہی ہے؟''
''ضرور، وہ گولی تو چلا رہے ہیں!'' لڑکے نے نل بند کرتے ہوئے ہنس کر کہا۔ ایک لمحہ میں انتہائی جانکاہ اور زبردست خاموشی چھا گئی۔ ''ابھی انھوں نے دو آدمیوں کو گولی مار دی۔ وہ سڑک پر گولی چلا رہے ہیں، گلی اور چڑیا گھر کی طرف سے بھی۔''

---

*ربڑ کے جوتے جو جوتوں کے اوپر پہنے جاتے ہیں۔

''پھر تم کیسے؟...''

''مالک نے کہا: 'مجھے چائے چاہئے، وانکا، دوڑ کر ایک بالٹی پانی تو لانا...، ہمارے گھر میں پانی نہیں ہے اور بھشتی باھر نکلنے سے ڈرتے ھیں... اور مالک اور اس کی بیوی تہہ خانے میں بیٹھے ڈر کے مارے شراب کے جام پر جام چڑھائے جا رہے ھیں...''

لڑکے نے سب کو ھنسانے والا قہقہہ لگایا اور اپنی بالٹی لیکر ایک لمحے میں چلتا بنا۔

پھر وھی اداس خاموشی چھا گئی، اسی طرح سرگوشیاں ہونے لگیں اور پھر معلوم ہونے لگا جیسے گھر میں میت ہو گئی ہو۔

بچے تہہ خانے کے کوڑے کرکٹ میں کھیل رہے تھے۔ وہ جھگڑتے، روتے اور ھنستے۔ بڑے ان کو روکتے اور ان کو چپ رکھنے کے لئے شو شو کرتے رھتے۔

(٦)

''آگ پھیل رھی ہے'' ایک مدھم سپاٹ اور پرسکون آواز نے کہا۔

''تمھیں کیسے معلوم ھوا؟'' کسی نے غصے اور نفرت کے لہجے میں اس کی بات نوچ لی۔

''دیکھو!''

سب لوگوں کی نگاھیں چھت کے خونی دھبے کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ بہت روشن ہو گیا تھا۔ پھر وہ رفتہ رفتہ مدھم پڑتا گیا۔ سب کی سوجی، جلتی ہوئی آنکھیں اس کو گھور رھی تھیں۔

''دیکھو، اب شعلہ مدھم پڑ رہا ہے۔''

''ارے، میرے اللہ، کیا واقعی!''

''بچو... میرے پیارے... بچو... تم بچ گئے...''

ھر شخص کھڑا ہو گیا اور سب لوگ حتی کہ بچے بھی چھت کے دھبے کو دیکھنے لگے۔

''دھواں شعلوں کو چھپا لیتا ہے'' اسی ڈراؤنی، مدھم اور پرسکون آواز نے کہا۔ ''بس کرو، یہ کاؤں کاؤں بند کرو...''

چھت کا دھبہ پھر چمکدار ہو گیا، روشنی کی خونی لکیر بےپرواھی سے نیچے گھور رھی تھی، پھانسی کے پھندے کی طرح۔

سر جھک گئے - طرح طرح کے وسوسے دل میں آنے لگے - کبھی کبھی تو یہ ایسا برا خواب معلوم ہوتا جس سے سوتا آدمی چونک پڑنا چاہتا ہو - میں ایک مجرمانہ خیال کو چھپانے کے لئے فرش کی طرف تکنے لگا یعنی یہ سب جل جائیں اور میں معہ اپنے بچوں کے صحیح سلامت بچ جاؤں -

بڑی تیزی اور لالچ کے ساتھ میں نے صحن کا نقشہ اپنے ذہن میں کھینچا، باڑے کے اندر نظر دوڑائی اور باڑ کے اوپری حصے کا جائزہ لیا کہ مجھے کوئی کھلی جگہ رینگ کر باہر نکلنے کے لئے مل جائے - کیا مجھے بچوں کو لیکر چڑیا گھر کے اندر سے پیٹ کے بل رینگ کر نکلنا چاہئے؟... نہیں - وہاں تو اور زور کی گولی چل رہی ہے - آج انھوں نے جانوروں کے ایک نگراں کو گولی مار دی — وہ وہاں جانوروں کو کھانا دینے گیا تھا - دوسری طرف شعلے بھڑک رہے تھے - سڑک پر گولیاں سنسنا رہی تھیں... کوئی راستہ نہ تھا...

میرے سینے میں درد اٹھا اور سانس لینے میں تکلیف ہونے لگی - میں نے سر اٹھایا اور غصہ بھری شعلہ‌ور آنکھوں کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا کہ ان سب آنکھوں میں بھی یہی خیال تھا کہ دوسرے جل جائیں گے اور صرف وہی بچینگے -

"ہونہہ... دھوئیں کی بو..."

حالانکہ وہ سب اس سے اور اس کی مری مری آواز سے نفرت کرتے تھے لیکن کسی نے اس کی بات پر اعتراض نہیں کیا - ہر شخص کو اپنے گلے میں دھوئیں کی تلخی محسوس ہو رہی تھی اور آنکھوں میں بھی دھواں لگ رہا تھا - دراصل دھواں نہ تھا کیونکہ ہوا دوسرے رخ کی چل رہی تھی اور وہ دھواں اڑا لے جاتی تھی لیکن ہر شخص اس کو محسوس کر رہا تھا -

خونی دھبہ پھر چمکدار ہو گیا - گولی چلنے کی دھیمی آواز آئی - اس مرتبہ کون نشانہ بنا؟ اور وہ جو سنگینوں کا نشانہ بنتے ہیں؟ پہلے ایک کے سینے میں سنگین پیوست کرتے ہیں، پھر دوسرے اور تیسرے کے، بڑے اطمینان سے -

"کیسی طویل رات ہے -"

"کیا وقت ہوا؟"

''کوئی تین بجے ہونگے۔''

''میرے خدا، چار گھنٹے کی مصیبت ابھی باقی ہے!''

میں نے اپنی گھڑی نکال کر دیکھی، اپنی آنکھیں ملیں اور پھر گھڑی دیکھی۔

''آٹھ بجے ہیں!''

''ناممکن... یہ نہیں ہو سکتا... آپ کی گھڑی رک گئی ہے'' سہمی ہوئی آوازیں آئیں۔

بہت سی جیبوں سے گھڑیاں نکل پڑیں۔

''آٹھ...''

''آٹھ بجنے میں پانچ...''

''آٹھ بجکر دس...'' چاروں طرف سے گھٹی گھٹی آوازیں آئیں اور ایک درجن گھڑیاں کانوں تک پہنچ گئیں۔

اس کے بعد ہر شخص خاموش اور بے حس و حرکت مجسمے کی طرح بیٹھ گیا۔ بچے مختلف جگہوں پر مختلف انداز سے سو رہے تھے۔

کوئی بول نہیں رہا تھا لیکن تہہ خانہ ایک پراسرار سرگوشی سے بھرا ہوا تھا۔ ایک سرسراتی ہوئی بے چین اور پریشان کن چٹخنے کی آواز سے۔ بھڑکتی ہوئی آگ اپنی زبان میں بول رہی تھی اور اس کی پھن پھناہٹ، لکڑی کا چٹخنا اور گرتی ہوئی اینٹوں کی آواز چپکے چپکے ہر جگہ پہنچ رہی تھی۔ بھاری تہہ خانوں اور موٹی دیواروں سے دب کر، مدھم ہو کر وہ اس روشنائی جیسے اندھیرے کو غم و یاس کی سسکیوں سے بھر رہی تھی۔

میں نے کسی کو ناک سے سوں سوں کرتے سنا، جیسے کوئی عورت اپنی سسکیاں دبا رہی ہو لیکن آواز زور پکڑتی گئی اور آخرکار وہ بے روک ٹوک پھوٹ پڑی اور پورے تہہ خانے میں بھر گئی۔ اس نے سرسراہٹ اور سرگوشیوں کو دبا دیا۔ ایک جوان عورت اپنے گھٹنوں پر جھکی زور زور سے سسکیاں بھر رہی تھی۔ اس کا چہرہ ہاتھوں سے ڈھکا ہوا تھا۔

''آخر یہ دھوکا کیوں، آخر کیوں؟ محبت اور خوشی... اگر یہ سب کچھ اپنے بچوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے دم توڑتے ہوئے

دیکھنے کے لئے ہے تو مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے خوشی نہ چاہئے... مجھے یہ دھوکا نہ چاہئے... مجھے اس کی ضرورت نہیں!...''

سسکیوں سے اس کا پورا جسم ہل رہا تھا۔ کوئی نہیں بول رہا تھا۔ کسی کو اسے تسکین دینے کے لئے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ ہر شخص خود اپنی مصیبت میں بری طرح کھویا ہوا تھا۔ چھت کے خونی دھبے کی چمک اور ڈراؤنی ہو گئی تھی۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وقت ٹھہر گیا ہے، رات ٹھہر گئی ہے، اور خیالات بھی ٹھہر گئے ہیں۔ صرف ایک سنسنی خیز تنگ حلقہ آدمی کے جذبات کو کچل رہا تھا۔

(۷)

''وہ آ گئے!... وہ آ گئے!!'' ایک پاگلوں کی سی آواز گونجی۔

ہر شخص اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ان کے چہرے خوف سے بگڑے ہوئے تھے اور وہ برے وقت کے لئے تیار تھے۔

''کون؟ سپاہی؟ توپ خانہ؟ ہم پر گولہ باری کر رہا ہے؟''

''وہ آ گئے... وہ آ گئے...''

''لیکن کون؟ کون؟ ہم کو بتاؤ نا؟..''

لوگوں نے اسے شانوں سے پکڑلیا اور غصے میں ہلا ڈالا لیکن وہ اپنے ہسٹریا کے دورے میں کانپتی رہی۔

''ارے کون؟ کون؟ بولو نا!''

''وہ... آگ والے...''

''کیا وہ آگ بجھا رہے ہیں؟''

''نہیں۔ وہ ہمارے اور دوسرے گھر کے درمیان کی باڑ کھینچ کر توڑ رہے ہیں... وہ ہم کو جلانا نہیں چاہتے...''

پورے تہہ خانے پر عجیب پاگل پن طاری تھا۔ عورتیں گھٹنوں کے بل رینگ کر کونوں میں جا رہی تھیں جہاں ان کے خیال میں بزرگوں کی تصویریں تھیں، وہاں جا کر اپنے اوپر صلیب کے نشان بنا رہی تھیں، زوروں سے ہنس رہی تھیں۔ ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہی تھیں۔ اور اپنے بچوں کو چوم رہی تھیں۔ بچے سہم کر جگ اٹھے تھے اور زور زور سے چیخ رہے تھے۔ میں جلدی سے بھٹی والی کوٹھری میں گیا۔

آگ تقریباً بجھ چکی تھی۔ ایوان ہر بات سے بےفکر اونگھ رہا تھا۔ لوگ رفتہ رفتہ پرسکون ہوتے جا رہے تھے۔ لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ اور خوشی تھی اور وہ زور زور سے باتیں کرکے ایک دوسرے سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ ہر ایک کو دوسرے پر افسوس تھا ہر ایک کو دوسرے سے دلچسپی تھی۔ رات جلدی گذر رہی تھی۔ دس بج چکے تھے۔ ساڑھے دس...

میں سونا چاہتا تھا اور محسوس کر رہا تھا کہ کیسی گہری اور میٹھی نیند ہوتی لیکن لیٹنے کے لئے کوئی جگہ نہیں رہی تھی۔ تمام جگہیں بھری ہوئی تھیں۔ رفتہ رفتہ بچے خاموش ہو گئے...

چھت کا لال دھبا زرد پڑ گیا لیکن اب اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کر رہا تھا۔

"جانتے ہو" اس مدھم آواز نے کہا۔ "اب حالات ذرا بہتر ہیں۔ میرے خیال میں یہاں سے نکل جانا ہی اچھا ہوتا۔ کم ازکم اس پرامن حالت سے فائدہ اٹھا کر عورتوں اور بچوں کو تو نکال لے جانا چاہئے... یہ اچھا رہتا..."

لیکن لوگوں نے اس کو معاف کر دیا، اب تو وہ اس سے بھی محبت کرنے لگے تھے۔

"لیکن کیوں؟" لوگوں نے اس سے نرمی سے پوچھا۔ ان کا نرم لہجہ بھی ملامت آمیز تھا۔ "اگر ہمارے گھر کو آگ سے بچانے کے اقدامات کئے گئے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ بات مان لی گئی ہے کہ ہماری عمارت میں بےخطا لوگ رہتے ہیں۔"

میں بےحد تھک گیا تھا۔ میں نے اپنی کہنیاں گھٹنوں پر ٹکالیں، چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور اونگھنے لگا۔ کبھی کبھی میرا دل چاہتا کہ زور سے ہنسوں، ہماری حالت کچھ ایسی ہی بےمعنی اور مضحکہ انگیز ہو گئی تھی۔

اب میں نے بےربط اور گڈمڈ خواب دیکھنے شروع کئے۔ میں نیند اور خوابوں کو روکنے کی کوشش کرنے لگا، بڑی مشکل سے اپنی آنکھیں کھولیں لیکن میرے بھاری پپوٹے پھر بلا ارادہ بند ہو گئے۔ مجھے ہر چیز سرخ معلوم ہو رہی تھی اور اس گھناؤنے سرخ پس‌منظر میں بال دار انسانی چہروں کا عکس تھا۔ بولتی ہوئی آگ کی خونیں کا ناپھوسی تھی — سپاہیوں نے میرے اندر اپنی سنگینیں اتارنے کی

پوری کوشش کی۔ سنگینیں میرے بدن پر پڑکر دوھری ھو جاتیں، سپاھی ان کو پھر جلدی سے سید ھا کرتے اور پھر میرے بدن میں گھسیڑتے اور میں ان سے غل مچا کر کہتا : ''جلدی کرو ... جلدی! ..''

کوئی میرے کان میں غل مچا رھا تھا : ''جلدی کرو ... جلد... ی !'' اور مجھے شانے پکڑکر ھلا رھا تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ چھت سرخ تھی۔ سرخی مائل اندھیرے میں بازو اور پیر ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے جیسے ان کو کسی نے چیر پھاڑ کر پھینک دیا ھو۔ میں نے اپنی آنکھیں پھر بند کرلیں۔ پھر مجھے کسی نے ھلا دیا۔ اس مرتبہ میں اٹھ کر کھڑا ھو گیا۔

دربان میرے برابر کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر سخت خوف کے آثار تھے۔

''سپاھی... بہت سے سپاھی... وہ پھاٹک کے اندر کھڑکی سے جھانک رہے تھے... وہ کہتے ھیں کہ وہ اس مکان پر گولہ باری کرنے جا رہے ھیں...''

ادھر ادھر بکھرے ھوئے بازو اور پیر حرکت کرنے لگے اور لوگ نیند میں ماتے سہمے سہمائے کھڑے ھو گئے۔

''کیا؟..''

''کون کہتا ھے یہ؟..''

''کہاں سے؟..''

''دو بج چکے تھے اور مجھے محسوس ھو رھا تھا کہ میں اب بھی سو رھا ھوں۔ ''

''میرے خدا، کیسی طویل اور مصیبت بھری رات ھے! ..''

''یہ بات سچ نہیں ھو سکتی۔ وہ ھم پر گولی کیوں چلائینگے۔ انھوں نے تو باڑ توڑ ڈالی ھے...''

''کیوں سے تمھارا کیا مطلب ھے؟ انھوں نے تمام دن کیوں گولیاں چلائی ھیں؟''

''ھمیں کسی کو بھیجنا چاھئے۔ ''

تمام نگاھیں اس پرسکون اور مدھم آوازوالے آدمی کی طرف پھر گئیں۔ وہ اٹھ کر باھر چلا گیا اور ایک منٹ بعد لوٹ آیا۔

''باھر سپاھی نہیں ھیں، جانور ھیں۔ میرا تو خیال تھا کہ وہ میرے سنگینیں بھونک دینگے۔ ''

''اس بات پر اصرار کرو کہ وہ تمھیں افسر کے پاس لے جائیں - ''
وہ پھر باھر گیا، ھم انتظار کرنے لگے - بیس سنٹ گذرے - آدھہ گھنٹہ گذرا... اکتا دینےوالا انتظار بے چینی سیں تبدیل ھو گیا - ھر سنٹ کوئی نہ کوئی اپنی گھڑی نکالتا -
''وہ ابھی تک نہیں لوٹا!..''
ھم ذرا سی کھٹکار پر بھی کان لگائے بیٹھے تھے لیکن ھمیں قدسوں کی چاپ نہیں سنائی دی - ایک ھی خوفناک خیال سب کے دلوں سیں تھا: ''انھوں نے اس کو سار دیا'' -
''انھوں نے اس کو سار دیا'' ایک آواز نے سیرے کان سیں چپکے سے کہا - ''صرف یہ بات زور سے نہ کہنا...''
''زور سے نہ کہنا'' ھر ایک دوسرے سے کھسرپھسر کر رھا تھا -
ھر شخص اس خونی دھندلکے سیں بیٹھا اپنی پوری کوشش کر رھا تھا کہ کوئی دوسرا اس کی نگاھوں سیں اس کے خیالات نہ پڑھ سکے - سب باتوں سے زیادہ ان کو اس بات کا ڈر تھا کہ یہ ڈراؤنا لفظ کہتے ھی ایک زبردست خوف اور ھل چل سچ جائیگی -
قدسوں کی آھٹ ھوئی، ایک سکنڈ کے لئے سب لوگ سننے لگے - شاید سپاھی آ رھے ھیں - لیکن وہ آ رھا تھا -
ھم سب اس کی طرف جھپٹے -
''اچھا؟...''
''تم نے ان سے کہہ دیا؟''
''کیا وہ گولی چلائینگے؟''
اس نے اسی پرسکون، سپاٹ اور سدھم آواز سیں جواب دیا:
''وہ سجھے صحن کے باھر لے گئے - ان کی سنگینیں ھر وقت سیری طرف تنی رھیں - برابروالی گلی آگ سے خوب روشن ھے اور کسی آدسی کا نام نہیں... 'تم سجھے کہاں لئے جا رھے؟' 'چلو، چلو - سیں نے سوچا کہ کہیں باڑ کے نیچے وہ سیرے سنگینیں سار دینگے - ایک کم یا ایک زیادہ... کیا ساسکو کی سڑکوں پر لاشوں کی کچھ کمی ھے؟.. وہ سجھے بڑی سڑک پر لے گئے - وھاں دن جیسی روشنی تھی، ایک افسر کھڑا تھا - سیں نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا اور چہرہ تھا بھی کیا، صرف ایک سونچھ، ایک زبردست عمدہ ترشی ھوئی سونچھ بھوؤں

تک اوپر چڑھی ہوئی - میں نے اس سے کہا : 'بچے، عورتیں، بیمار،۔ وہ میری طرف پیٹھ کئے کھڑا رہا - پھر بڑی حقارت کے ساتھ، دانت بھینچ کے کہنے لگا: 'اگر تم کھڑکیاں ڈھک لو، اگر ان کے قریب کوئی نہ آئے، اگر گھر کے باھر کوئی نہ نکلے... اگر عمارت یا صحن سے ایک گولی بھی نہ چلے تو ہم گولی نہیں چلائینگے،...''

پھر ایسا معلوم ہوا جیسے گھر میں میت ہوگئی ہے - لوگ اپنی اپنی جگہوں پر واپس گئے - ان کے چہرے ستے ہوئے تھے - آگ کا عکس چھت پر مچل رہا تھا، ایک تھرتھراتی ہوئی روشنی - لیکن لوگوں کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں گہری اداسی کے سوا کچھ بھی نہ تھا - شعلے بڑبڑا رہے تھے اور ان میں سے چٹخنے کی آواز نکل رہی تھی - پہلے کی طرح پھر وھی دبی دبی گھبرائی سی کھسرپھسر شروع ہو گئی - لیکن کانوں پر زور دینے کے باوجود بھی قبر کی سی خاموشی معلوم ہوتی تھی - ایک چیز کی ان کو توقع تھی - ایک بات وہ بڑے غور سے سن رہے تھے - وہ جان‌لیوا گولیوں کی بوچھار جو دیوار کے پیچھے سے ہونےوالی تھی -

میں نے رنجیدہ ہوکر بچوں کی طرف دیکھا اور ایسی جگہ تلاش کرنی شروع کی کہ اگر وہ کھڑکی سے گولی چلانا شروع کر دیں تو بچے وھاں محفوظ رھیں - لیکن ایک بھی جگہ محفوظ نہ تھی - سڑک کھڑکیوں کی سطح پر تھی اس لئے پورا کمرہ زد میں تھا - مکان کی اوپر کی منزلوں پر اچھا رھیگا لیکن دروازے تک جانے کے معنی موت تھے - میرا پھر زور سے قہقہہ لگانے کو جی چاہا - میں نے اپنی گھڑی نہیں دیکھی - دیوار کا تکیہ لگاکر بےخبر، گہری نیند سو گیا -

''وہ موڑ کے اس طرف بیٹھا ہے، جہاں باڑ ہمارے گھر سے مل گئی ہے... وھاں اس کے لئے آسان ہے - وہ دکھائی نہیں دیتا...''

یہ منحوس سرگوشی میرے کانوں تک پہنچی اور دماغ میں گرم سوئیوں کی طرح پیوست ہو گئی - ایک صفاچٹ، جھری دار چہرہ جو چالاکی کی وجہ سے بگڑ گیا تھا دانت نکالے میری طرف دیکھ رہا تھا - اس کی چالاک اور بری نگاھیں تنی ہوئی پرفن بھوؤں کے نیچے سے مجھے گھور رہی تھیں -

''وہ صرف ہم کو ستانا چاہتا ہے... اس کو ہمارے چہرے دیکھ کر لطف آتا ہے جن میں انتظار کی کوفت ہے...''

''لیکن وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟..''

''ہا — ہا — ہا... تمہارا کیا مطلب ہے — کیوں؟ وہ بالکل سیاہ اور جھلسا ہوا ہے... اس کی ہر چیز جل چکی ہے: میز، بستر، کپڑے، بیوی، بچے... وہ ہمارے لڑکوں کو معاف نہیں کر سکتا... وہ اس جگہ چھپا ہے... اور...''

ترچھی تنی ہوئی بھوؤں کے نیچے سے حاسد، چمکتی ہوئی آنکھوں کی پتلیاں میری آنکھوں میں گھسی جا رہی تھیں، وہ صفاچٹ، جھریوں والا بگڑا ہوا چہرہ مجھے تقریباً چھو رہا تھا۔

''اور وہ دو مرتبہ ہوا میں گولی چلائیگا...''

میں نے وہ چنگل جیسی ہڈی دار انگلیاں جھٹک دیں جو میرے کندھے کو ٹٹول رہی تھیں۔

اب دن نکلیگا اور ان سب باتوں کا خاتمہ ہو جائیگا۔ سب کچھ پہلے کی طرح ہو جائیگا۔ لیکن دیوانہ پن باقی رہیگا...

. . . .

میں نے اپنی پوری زندگی میں کسی نئے خوش کن دن کا اس خوف کے ساتھ کبھی انتظار نہیں کیا تھا جیسے اس دن کا۔ میں اچھل کر اٹھا اور بچوں کو کپڑے پہنانے لگا۔

''کیا اب ہم باہر جا سکتے ہیں؟'' میں نے ڈوبتے دل سے پوچھا۔ مجھے اکادکا رائفلوں کے چلنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''کوئی بات یقینی نہیں کہی جا سکتی...'' دربان نے کہا۔ ''اپنے ہاتھ اوپر اٹھا کر دوڑو... معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے پھر شروع کر دیا...''

میں دونوں لڑکوں کے ہاتھ پکڑ کر تہہ‌خانے کے باہر بھاگا۔ آگ سے جلی ہوئی چیزوں اور تباہی کا عالم بے حد خوفناک تھا۔

شدید سردی کی وجہ سے میری سانس پھولنے لگی۔ چھوٹا لڑکا بڑی بےچینی سے جماہیاں لے رہا تھا۔ ہانپتا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا وہ میرے برابر تیز چلنے کی اسکانی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے پیر تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔

''ابا،، بڑے لڑکے نے میرے برابر چلتے ہوئے خوف سے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ ''کیا وہ ہمیں گولی مار دینگے؟،،

''نہیں، نہیں... صرف ذرا جلدی چلو، بیٹے... جلدی، جلدی... شاباش!..،،

ایک اتفاقی گولی باڑ سے آکر لڑی۔ مجھے ہر سکنڈ انتظار تھا کہ گولیوں کی باڑ اب چلی تب چلی۔ برف بڑی ناراضگی سے چرمرا رہی تھی۔

''تیز اور تیز... بس اس موڑ تک... اور تیز!..،،

اب صرف پندرہ... دس... پانچ قدم باقی رہ گئے... ہم موڑ پر پہنچ گئے... ہم گھوم گئے... ہم بچ گئے!..

ماسکو

۸ — ۱۸ دسمبر ۱۹۰۵ء

بازگشت

(۱)

نیلی شفق کی چھوٹ دور دریا کی موڑ، زرد ریت، دریا کے کنارے کی اونچی پہاڑیوں اور سنسان جنگل پر پڑ رہی تھی۔

آوازیں مدھم پڑتی گئیں، رنگ ہلکے ہوتے گئے اور گہرے نیلے آسمان کے نیچے، جس پر کہیں کہیں ستارے جھلملاتے دکھائی دیتے تھے، تھکی ہوئی زمین کو آرام نے اپنے آغوش میں لے لیا۔

دریا کے بلند کنارے کے پس منظر میں بجرے اور اس سے بندھی ہوئی چھوٹی کشتی کے خاکے سیاہ دھندلا سا دھبہ معلوم ہو رہے تھے۔ پانی کے بالکل کنارے آگ کے ناچتے ہوئے سرخ شعلے چاروں طرف اپنا عکس ڈال رہے تھے۔ آگ کے اوپر کوئی چیز لٹکی ہوئی ابل رہی تھی اور اس کا سیلا جھاگ گرم کوئلوں پر گرگر کر سنسنا رہا تھا۔ لمبے لمبے سائے رینگ رہے تھے اور آگے پیچھے ہو رہے تھے۔ جیسے وہ دریا کے کنارے ریت کی تنگ پٹی پر کوئی چیز ڈھونڈھ رہے ہوں۔ اونچی پہاڑی خیالات میں ڈوبی سی اوپر کھڑی تھی اور اس کی لال مٹی دھندلی سی دکھائی دے رہی تھی۔

رات سنسان تھی لیکن اس سناٹے میں پانی کے بہنے کی کلکلاہٹ گونج رہی تھی — جیسے کوئی جلدی جلدی گھبرا کر کھسرپھسر کر رہا ہو۔ یہ سرگوشی کبھی ناگوار اور زوردار ہو جاتی اور کبھی سوئی سوئی سی، خوابیدہ — لیکن دریا پر سکون تھا، اس کی سطح پر ایک شکن بھی نہ تھی۔

مچھلیوں کے اچھلنے کی آواز، الو کی چیخ، گرتی ہوئی ریت کی سرسراہٹ یا مشکل سے سنائی دینے والی اسٹیمر کے پتوار پہیوں کی آواز — یا ممکن ہے کہ یہ سب محض خیال ہو — اور پھر وہی خوابیدہ، بہت ہی دھیمی کھسر پھسر، پہلے سوئی سوئی سی اور مدھم، پھر اونچی اور تیز - لیکن دریا آنےوالی رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں چمکتا ہوا بڑے سکون سے بہہ رہا تھا -

''جیسے ''یرماک،، آ رہا ہے - ،،

''نہیں ہو سکتا - غالباً وہ کہیں سوباچی پیسکی میں پھنس گیا ہے...،،

یہ صاف، سیدھے سادے الفاظ، انسان کے منہ سے اچانک نکلے ہوئے الفاظ خاموش اور پرسکون دریا کی ناقابل فہم اور بےچین کھسر پھسر میں گونجے اور غائب ہو گئے -

جھلملاتی آگ میں ایک ٹھگنا سایہ یکایک سیدھا ہوکر آگ کے پاس سے بھاگا - سایہ پہاڑی کی چوٹی پر بھونڈے پن سے جھکا اور اسٹیپی کی تاریکی میں غائب ہو گیا جہاں سے بٹیروں کی آوازیں اور تازہ کٹی ہوئی گھاس کی مہک آ رہی تھی - آگ کے پاس سے ایک لمبا، لحیم شحیم آدمی اٹھا جس کے بازو اور پیر لمبے تھے - وہ ایک موٹی سوتی قمیص پہنے تھا - چمچہ لیکر اس نے ابلتے ہوئے پانی کے برتن سے جھاگ نکال کر پھینکا اور اس میں ایک مٹھی باجرہ ڈال دیا - پانی فوراً ابلنا بند ہو گیا اور وہ سایہ بھی اپنی اسٹیپی کی مہم سے واپس آکر آگ کے پاس غائب ہو گیا - لمبا آدمی بالکل ساکت بیٹھا تھا - اس کے ہاتھ گھٹنوں پر بندھے ہوئے تھے، وہ چمکدار دریا، دور دھند میں کھوئے ہوئے جنگل اور دریا کے دوروالے کنارے کو گھور رہا تھا -

ذرا فاصلے پر ایک آدمی کا سیاہ خاکہ مردے کی طرح بےحس وحرکت ریت پر ٹانگیں پھیلائے پڑا نظر آ رہا تھا -

اس کا چہرہ نہیں دکھائی دے رہا تھا -

یہ کہنا مشکل تھا کہ آیا وہ سو رہا ہے یا کچھ سوچ رہا ہے، آیا وہ کچھ بیمار ہے یا ختم ہو چکا ہے -

جنگل، دریا کے موڑ اور دور ریتیلے کنارے پر اندھیرا پھیل گیا تھا، صرف پانی جس میں ایک سیاہ چمک تھی اب بھی جھلملا رہا

تھا اور لاتعداد روشن ستاروں کے عکس نے اسے ایسا بنا دیا تھا جیسے وہ اتھاہ ہے اور اس کے نیچے زمین کی تہہ نہیں ہے۔

چاروں طرف کی چیزوں میں کوئی خاص بات نہ تھی نیلگوں رات میں پہاڑی کے نیچے، آہستہ آہستہ گنگناتے ہوئے پانی کے پاس آگ جل رہی تھی، لمبے، بھدے آدمی کے خاکے پر جو مجسمے کی طرح بیٹھا تھا اور ہاتھ گھٹنوں پر باندھے تھا، سیاہ، بےحس و حرکت شبیہہ پر جو ریت پر پڑی ہوئی تھی اور تیسرے اس معمر آدمی پر جس کے بڑی سی داڑھی اور پرسکون اور درشت چہرہ تھا اور بالکل کانسے میں ڈھلا معلوم ہوتا تھا سرخ جھلملاتے ہوئے شعلوں کی ہلکی ہلکی روشنی پڑ رہی تھی۔ یہ سب باتیں معمولی تھیں۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی اداس گیت گا رہا ہے حالانکہ کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی اور نہ گیت کے کوئی الفاظ تھے۔ شام کے نیلے دھندلکے میں چھپا ہوا دریا، آگ، پہاڑی کے دھندلے خطوط اور سیاہ گہرائیوں میں ہلکے ہلکے سے جھلملاتے ہوئے تارے۔ یہ سب چیزیں بظاہر خیالی معلوم ہوتی تھیں۔

''وقت آ گیا۔ انسانی زندگی گھاس کی طرح اگتی ہے...''

یہ آواز پرسکون، متوازن اور دھیمی تھی اور پورا منظر اس قدر پر سکون تھا کہ یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ آواز کس کی ہے۔

اس لگاتار، لافانی اور سوئی سوئی سی سرگوشی کے درمیان یہ آواز اسی طرح نیلگوں رات کا حصہ معلوم ہوتی تھی جیسے مہیب اور بلند پہاڑیاں یا پانی کا ہلکا ہلکا نغمہ اور آگ جس کے سائے ریت پر خاموشی سے لہرا رہے تھے۔

''...اس گھاس کی طرح جو بہار کی ابتدا میں سیاہ مٹی سے اگتی ہے...''

''ہونہہ... تو وہ اگتی ہی چلی جاتی ہے اور کوئی اس کو روک نہیں سکتا۔''

بہت ہی آہستہ اور غیر واضح آواز میں اس ''ہونہہ'' کی گونج دریا کے کنارے دور تک ہوئی۔

جو آدمی اپنے گھٹنے بازوؤں سے باندھے بیٹھا تھا خاموش ہو گیا۔ وہ آدمی بھی چپ تھا جس کا سیاہ خاکہ ریت پر دکھائی دے رہا تھا اور بڈھا بھی ساکت بیٹھا تھا۔ اس کے سرخی مائل سنولائے چہرے

سے بےچینی کا اظہار ہو رہا تھا اور وہ بیکار بیٹھا ان جلتے ہوئے کوئلوں کو اپنے ہاتھ سے آگ میں واپس پھینک رہا تھا جو اچھل کر باہر آجاتے تھے۔ اس خاموشی سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سب کوئی گتھی سلجھانے میں محو ہیں — نیلگوں رات خود بھی سوچ رہی تھی۔

ایک تیز دردبھری چیخ فضا کو چیرتی ہوئی دریا کے پار تک چلی گئی۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ وہی سوچ میں ڈوبی ہوئی اداسی، وہی بےچین اور تیز بہتے ہوئے پانی کی سرسراھٹ اور لگاتار سرگوشی۔ ہر طرف سے اندھیرا بڑھ رہا تھا، پہاڑی کا دھندلا خاکہ ساکت تھا اور اس کے پیچھے اسٹیپی بھی سنسان پڑا تھا۔ آگ پر ٹنگے ہوئے برتن میں دھیما دھیما ابال آ رہا تھا اور پانی کا جھاگ سوئے سوئے انداز میں اوپر نیچے سانسیں لے رہا تھا۔

ان کے مخالف سمت سے دریا پر پھر وہی تیز چیخ سنائی دی۔ کوئی جل‌پری کھیل رہی تھی یا شائد کوئی ان دیکھی چڑیا پانی پر نیچی اڑ رہی تھی — یہ بتانا ناممکن تھا۔ اندھیری اور سنسان رات چاروں طرف سے اڈتی چلی آ رہی تھی۔

”دریا کے کنارے بہت دور تک آواز سنائی دیتی ہے۔ ٹیڑھے موڑ تک بھی سنائی دیتا ہے۔“

دونوں آدمیوں نے سر جھکا لئے اور ھلکی سی ھلکی آواز سننے کے لئے کان لگا دئے۔ وہ کسی آنےوالے اسٹیمر کے پتوار پہیوں کی آواز سننا چاھتے تھے لیکن رات کی نرم اور مدھم آوازیں جو ھزاروں مرتبہ سننے کے بعد بھی عجیب تھیں صاف صاف یہ بتا رہی تھیں کہ وھاں آدمی کا کوئی نشان نہیں ہے۔

بس، آگ جل رہی تھی اور اس کے پاس دو آدمی بیٹھے تھے۔ تیسرا، ایک بےحس و حرکت سایہ، ریت پر پڑا تھا۔

(۲)

لمبے آدمی نے اٹھ کر برتن کو آگ کے اوپر سے اتار لیا۔ سائے ادھر ادھر چلنے لگے اور ان میں کا ایک پھر پہاڑی پر چڑھ کر اسٹیپی میں غائب ہو گیا۔

"تیار ہے۔"
اس نے برتن زمین پر رکھ کر اسے زور سے اس طرح گھمایا کہ برتن کا پیندا اچھی طرح ریت میں بیٹھ گیا۔
"نو بج گئے۔ اوھو۔ اوھو.. ھو..." اور دریا کے پار سے کسی نے کہا: "اوھو، اوھو"۔
"اس آدمی سے کہو کہ آکر ھمارے ساتھ کھانا کھائے۔ کافی بھوکا معلوم ہوتا ہے۔"
بڈھے نے اپنی جیب سے ایک چمچہ نکالا اور اس کو اپنی کھردری انگلی سے صاف کیا۔
"اے لڑکے! آؤ کھانا کھاؤ" لمبے آدمی نے سیاہ، بے حس و حرکت خاکے کے اوپر جھک کر کہا۔
"ایں؟ ایں؟ ایں؟.. کدھر کو؟.. رکو... جوانو، ڈٹے رھو!.." تیسرا آدمی اچھل کر کھڑا ھو گیا اور غل مچانے لگا۔ وہ کانپ رھا تھا۔
"تمھیں کیا ھو گیا ہے؟ میں نے تو یہ کہا کہ آکر ھمارے ساتھ کھانا کھاؤ..."
نوجوان نے چاروں طرف متحیر نظریں ڈالیں۔ یہ دھندلے خاکے، لگاتار سرگوشیوں سے بھرا رات کا سناٹا، جھلملاتی سرخی مائل روشنی کا پانی میں عکس اسکی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ اس نے اپنے چہرے پر اس طرح ھاتھ پھیرا جیسے وہ کوئی جالا چھڑا رھا ھو۔ اب وہ بالکل ڈھیلا پڑ گیا اور اس کے چہرے پر مسکراھٹ کھیلنے لگی جس میں بےچارگی اور مصیبت کے آثار نمایاں تھے۔
"دیکھو نا، مجھے برے برے خواب پھر دکھائی دینے لگے۔"
آگ کی روشنی میں ایک بہت ھی بگڑا ھوا مصیبت‌زدہ چہرہ دکھائی دیا جس میں بےچین اور کافی چمک‌دار آنکھیں بڑے بڑے سیاہ حلقوں سے کہیں خلا میں گھور رھی تھیں۔
وہ پالتی مار کر برتن کے چاروں طرف ریت پر بیٹھ گئے اور کھانا کھانے لگے۔ وہ لپسی کو زور زور سے پھونکتے جا رہے تھے۔ ان کے سائے اسی طرح پراسرار انداز میں ریت پر لہرا رہے تھے۔
بڑی دیر تک وہ خاموشی سے کھاتے رہے۔ انسانی جبڑوں کے چلنے کی آواز رات کی سوئی سوئی سرگوشی میں بری طرح خلل ڈالتی رھی۔

ان کی تیز اشتہا کو اب کچھ تسکین ہو چلی تھی۔ اس نوجوان نے جس کے چہرے پر سردنی چھائی تھی زور سے آہ بھر کر کہا:

''او... ہو... ہو... اب جاکر ذرا جان میں جان آئی...''

اور پھر اسی طرح لاچاری اور کوفت سے مسکرا کر بولا:

''میں نے دو دن سے کھانا نہیں کھایا تھا۔''

''تم کہاں کے رہنے والے ہو؟''

''شہر سے آیا ہوں۔'' پھر تھکی تھکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آئی لیکن اس مرتبہ اس میں اعتماد کی جھلک بھی تھی۔ ''بس میں جہنم کے منہ میں جاتے جاتے بچا۔ معلوم نہیں کیسے بچ گیا۔''

''جب تم دریا کے کنارے جا رہے تھے اسی وقت ہم لوگوں نے یہ بھانپ لیا تھا'' لمبے آدمی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''لیکن ہم نے تم سے پوچھا نہیں۔ بیکار کسی آدمی کو پریشان کرنے سے کیا فائدہ۔''

''کسی بات سے ڈرو نہیں... سپاہی اسٹیپی میں گشت لگاتے رہتے ہیں اور ان لوگوں کو پکڑتے ہیں جو شہر سے بھاگ نکلے ہیں۔ جب کوئی ہاتھ آجاتا ہے تو بس چٹکی بجاتے اس کا وارا نیارا کر دیتے ہیں — گولی یا پھانسی کا پھندا۔ ہم نے ان میں سے بہتوں کو دریا کے پار آنے میں مدد دی ہے... یہ بجرے پر کے سارے لوگ اور اسٹیمر کے ملاح سب ہمارے آدمی ہیں۔ وہ ہمارے بجرے کی کبھی تلاشی نہیں لیتے اور اگر تلاشی لے لیں تو بہت لوگ مل جائیں۔ تم شہر میں کیا کرتے تھے؟''

''پرنٹر تھا۔'' پھر اس نے اپنے شانے اس طرح جھکائے جیسے اس کو سردی معلوم ہو رہی ہو اور چاروں طرف سہمی سہمی نظروں سے دیکھنے لگا۔

لمبے آدمی نے ایک چمچہ لپسی لی، اس کو پھونکا اور پھر اپنے ہونٹ نکالکر زور سے لپسی سڑک گیا اور اس کے ساتھ تھوڑی سی ہوا بھی۔

جل پری یا الو کی آواز پھر دریا پر سنائی دی۔ ایک مچھلی غڑاپ سے اچھلی لیکن اندھیرے میں پانی کے پھیلتے ہوئے حلقے نہ دکھائی دے سکے۔ بڈھا خاموشی سے کھاتا رہا۔

”میں دریا میں پڑا رہا اور جب میں کچھ دیکھتا تو پانی میں غوطہ مار جاتا... کل تمام دن اندھیرا ہونے تک میں پانی میں بیٹھا رہا۔ میں نے اپنے بیٹھنے کے لئے کیچڑ میں جگہ کھودی اور سرکنڈوں میں اپنا سر چھپا لیا۔ اس طرح بیٹھا رہا۔“

اس نے اپنا چمچہ رکھ دیا اور بالکل گڑمڑا کر بیٹھ گیا۔ گرم رات اور جلتی آگ سے دور اس کے دماغ اور دھندلی نگاہوں میں بہت سے خیالات چکر لگا رہے تھے۔

”جو کچھ ہوا اس کے خیال سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ خون... خون... اور اتنے سارے گئے!..“

پھر اس نے سہم کر چاروں طرف دیکھا اور اس طرح اپنے شانے جھکائے جیسے اسکو سردی لگ رہی ہو۔

”میں تھک گیا ہوں... تھکا ہوں اور درد بھی ہے.... ہاتھوں پیروں میں اتنا نہیں جتنا دل میں ہے۔ میں بالکل نڈھال ہو چکا ہوں جیسے کوئی پھانسی پر لٹکتے...“

پھر اس نے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ وہ اندھیرے، آگ، دریا اور پاس بیٹھے ہوئے لوگوں سے پرے دیکھ رہا تھا — اسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے تباہی و بربادی کے بھوت نے ہر جگہ چھاپہ مارا ہو اور اب کہیں پناہ کی جگہ نہ رہ گئی ہو۔

”سب سے خراب بات تو یہ ہے“ اس نے اچانک زور سے کہا ”کہ کتنی محنت برباد ہوئی ہے، محنت! ہم لوگوں کو ہوشیار کرنا اور کوئی بات سمجھانا آسان نہیں... کوئی ان سے برابر کہتا رہے۔ برابر سکھاتا رہے لیکن وہ اپنے ہی ڈھرے پر چلتے رہیں گے۔ وہ بڈھے گھوڑے کی طرح ہیں جو چابک کے زور پر چلتا ہے۔ بھوکوں مرتے ہیں لیکن وادکا چڑھاتے رہتے ہیں... ان کو سمجھانے بجھانے، ان کے حلقے منظم کرنے، ان کو پڑھنے اور سوچنے کے قابل بنانے میں، تاکہ وہ خود کچھ سمجھ سکیں کتنا وقت لگا ہے اور ہم لوگوں کو کتنا کام کرنا پڑا ہے، ہم نے کتنے آدمی سزا، قید اور جلاوطنی کی وجہ سے ضایع کئے ہیں اور وہ بھی کیسے کیسے لوگ!.. ایک ایک اینٹ جوڑ کر ہم بناتے ہیں اور پھر... اڑاڑا دھڑام! ختم ہو جاتا ہے۔ سب ختم ہو جاتا ہے...“

وہ پھر چاروں طرف دیکھنے کے لئے گھوما - اس نے کچھ نہیں دیکھا - وہ رات کی نیلاہٹ، سرگوشی کی آوازوں اور اس پرسکون فضا کے پرے دیکھنے لگا جو سوئے سوئے دریا کے کنارے پر طاری تھی -

''اھا - ھا...،، وہ آگ کے اوپر جھومتے ہوئے کراھا اور اپنا سر دونوں ھاتھوں سے دبا لیا جیسے اس کو سر پھٹ کر پاش پاش ہو جانے کا ڈر ہو - اس کا سایہ بھی ساتھ ھی جھومنے لگا، بدھئیت، ٹیڑھا میڑھا سایہ جس کے ھاتھوں میں بھی سر تھا، بےڈھنگا اور بےتکا سر -

تباہ کشتیوں، برباد امیدوں اور ناامیدیوں سے پرے ابلتے ہوئے چشمے کی سرگوشی جاری تھی - وہ کچھ بڑبڑا رھا تھا جس کا تعلق صرف اسی سے تھا - بھیگی ہوئی کالی رات میں تاروں بھرا آسمان کچھ لرزاں سا معلوم ھوتا تھا - کچھ ٹہنیاں آگ میں ڈال دی گئیں لیکن انھوں نے آگ نہیں پکڑی اور دھوئیں کی ایک بہت ھی چھوٹی لکیر جو مشکل سے دکھائی دیتی تھی ھوا میں لہرائے بغیر سیدھی اٹھنے لگی -

اس سکون اور خاموشی میں جو تاریک رات کے دل تک اترتی چلی گئی تھی کوئی شاندار چیز ضرور شامل تھی کوئی ایسی چیز جس کے متعلق ابھی تک نہ کوئی جانتا تھا اور نہ کسی نے اسے دیکھا تھا -

''دیکھتے ہو نا، بچے، رات بالکل پرسکون ھے - ھر چیز سو رھی ھے، ھر چیز آرام کر رھی ھے،، بڈھے کے لہجے سے بھی گہرے سکون کا اظہار ہو رھا تھا - ''ھر چیز، جانور، آدمی، سانپ، بچھو اور گھاس — ھے نا — گھاس بھی رات کو لیٹ جاتی ھے اور صبح کو پھر بالکل سیدھی ھوجاتی ھے - ھر چیز پرسکون اور پرامن ھے... ھا... ں...،،

ایک مدھم پھڑپھڑاتی سی آواز دریا کے اوپر سے آئی - شائد کوئی چوہا رات میں اڑ کر بسیرے پر جا رھا ھو -

''ھاں، آرام.. کیونکہ دن بھر میں سب تھک جاتے ھیں - بالکل چور ہو جاتے ھیں — شانے، ھاتھ اور پنجے سب کام کرتے ھیں... اور پوری دنیا سوتی ھے - اور صبح کو ھر ایک پھر اپنی اپنی راہ

لگے گا۔ جانور، چڑیاں اور آدمی۔ بس سورج کے جھانکتے ھی وہ پھر سے اپنا کام کرنے پر تیار ہو جاتے ھیں۔ تو یہ بات ھے، بچے...''

بڑی دیر تک خاموشی رھی۔ پرنٹر جھکا بیٹھا آسمان پر کہکشاں کو تکتا رھا۔ لمبا آدمی اپنی لپسی ختم کر رھا تھا۔

''بابا'' ایک گھٹی آواز نے درد بھرے لہجہ میں کہا۔ ''صبح ھر چیز جاگ اٹھیگی لیکن شہر میں پڑے ہوئے مردہ لوگ نہ اٹھیں گے۔''

''کھاؤ، بچے تم کھاؤ'' اپنی ھتھیلی سے داڑھی اور مونچھیں صاف کرتے ہوئے بڈھے نے کہا۔ ''او... ھو... ایک دیہاتی، ایک کسان کھیت جوتنے گیا۔ اس نے سب جوت ڈالا اور ایک ٹوکری میں بیج لے کر بونے لگا۔ اس نے بیج بو دیا۔ کھیت گوڑ دیا۔ بارش ہوئی، ھری ھری کونپلیں زمین کے باھر نکل آئیں۔ کسان بہت خوش ہوا — بھلا کسان کو اس سے زیادہ اور کیا چاھئے تھا۔ وہ جوتتا ھے، بوتا ھے اور فصل کاٹتا ھے۔ بس اس کا پیٹ بھر جاتا ھے۔ اوھو... پودوں میں بالیاں لگنا شروع ہوئیں اور پھر اچانک کہیں سے ایک کالا بادل اٹھا، طوفان آیا، اولے گرے اور ایک لمحے میں سب کچھ برباد ہو گیا۔ جہاں پہلے فصل تھی اب وھاں زمین سیاہ پڑی تھی۔ کسان بہت نراش ہوا... لیکن جانتے ہو اس‌نے کیا کیا؟ سب کچھ چھوڑ بھاگا؟ ختم کر دیا؟ ارے، نہیں۔ بچے اب بھی بھوکے تھے... ریلوے میں جا کر نوکری کرلی اور پیسہ کمایا۔ لیکن ایک ٹرین سے اس کے پیر کٹ گئے۔ وہ بہت دن تک بیمار رھا اور پھر اس دنیا سے رخصت ہو گیا... تم سمجھتے ہوگے کہ بس بات ختم ہو گئی؟ نہیں۔ سنو، بچے۔ کھیت بنجر نہیں پڑے رھے۔ اس کے بھائیوں اور داماودں نے جوتنا بونا شروع کیا۔ پھر ھری کونپلیں نکلیں، پھر بالیاں آئیں۔ کسانوں کو چاھے جتنا ستایا جائے، ان کو لڑائی پر بھیجا جائے، جیل میں سڑا دیا جائے، غربت سے کچل دیا جائے، وہ سسک سسک کر بھوکوں مریں — لیکن بہار میں کونپلیں ضرور پھوٹتی ھیں...''

وہ رک گیا۔

اس خاموشی میں ایک انتظاری کیفیت تھی۔

''آہ؟''

اور دریا کے پار سے کسی نے اس دردبھری آہ کا جواب ''آ...ہ'' سے اس طرح دیا جیسے وہ سوال بھی کر رہا ہو اور بڈھے کی بات سے متفق بھی ہو - پرنٹرنے ڈوئی سے لپسی نکالنا شروع کی -

''تارا ٹوٹا، دیکھا نا'' لمبے آدمی نے ڈکار لیکر کہا -

''یہی بات ہے، بچے - تم گھاس کو چاہے جتنا کچلو وہ پھر نکلے گی، اوپر کی طرف لہکے گی - تھوڑی دیر ہوئے ہم نے تم کو دیکھا تھا - تم ادھر ادھر تک رہے تھے اور لڑکھڑا رہے تھے - تمہارا خیال تھا کہ تمہارے چاروں طرف دشمن ہیں - تم ہمارے پاس آئے لیکن ہم سے ڈر رہے تھے - لیکن ہم لوگ طے کر چکے تھے کہ تم کس قسم کے آدمی ہو - میں نے ستیوخا سے کہا : 'اسے چھیڑنا نہیں، اسے ہم لوگوں کے چاروں طرف چکر کاٹنے دو -' اور اب ایسا ہوا... یہ رہا ہمارے پاس'' بڈھے نے بجرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا - ''جو چاہئے سب ہے، ہم ہر گاؤں میں سامان اتارتے ہیں - لوگوں کو کرید کرنے دو - گھاس کو ذرا پھر سیدھا ہونے دو - اوھو... ھو... ھو - ''

اور دریا کے اس پار بھی اوھو... ھو... ھو کی گونج ہوئی -

(۳)

''بجرا یہاں کیوں کھڑا ہے، اوں؟''

''دیکھو بجرے اتھلے پانی میں نہیں جا سکتے - اس سال دریا بہت جلدی گھٹ گیا - اسٹیمر کچھ سامان لیکر اتھلا حصہ پار کر گیا - وہ واپس آکر کچھ سامان اس بجرے سے لے گا اور پھر اس کو اپنے ساتھ گھسیٹ لے جائیگا - ''

پرنٹر برتن میں لگی ہوئی لپسی کو آہستہ آہستہ کھرچتا رہا - پھر اچانک ذرا مسکراتے ہوئے اپنا سر اٹھایا اور چاروں طرف دیکھا - پہلی مرتبہ اس نے سوچ میں ڈوبی ہوئی خاموش اور پر سکون رات کی طرف توجہ کی - اس نے آسمان کی گہرائیوں میں جھلملاتے ستارے دیکھے اور نظر نہ آنے والے بہتے ہوئے پانی کی سوئی سوئی سرگوشی سنی - پھر ایک لمبی آہ کھینچکر کہا :

''کیسی حسین رات ہے!''

ایک خوشگوار تھکن جو نیند اور آرام کی دعوت دے رہی تھی اس پر طاری ہو گئی۔

''ذرا سو لینے میں تو کوئی ہرج نہیں ہے۔ دو راتوں سے میری آنکھ تک نہیں جھپکی ہے۔''

''ذرا ٹھہرو، ابھی دھی کا پیالہ باقی ہے۔''

لمبا آدمی آہستگی کے ساتھ اٹھا۔ اس کا سایہ بھی ساتھ ہی بڑھا۔ وہ کشتی میں گیا، چاروں طرف کچھ ٹٹولا، ایک پیالہ لیکر واپس آیا اور بیٹھ گیا۔ سایہ بھی اپنی جگہ پر واپس آیا۔

''یہ لو۔ اسے پی جاؤ۔ دھی اچھا ہے۔''

چاروں طرف کی خاموشی میں پانی کی متواتر کلکلاہٹ کچھ اس طرح گم ہو گئی تھی کہ اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کر رہا تھا۔ اچانک اس میں ایک غیر متوقع آواز مخل ہوئی جو مدھم، طویل اور غیرواضح تھی لیکن رفتہ رفتہ بڑھتی اور صاف ہوتی گئی، یہاں تک کہ رات کسی ایسی آواز سے گونج اٹھی جو پہلے موجود نہ تھی۔

تینوں آدمی پہاڑی کی طرف مڑ کر سننے لگے۔

لہراتی اور جھلملاتی آگ اپنی بےچین اور سرخ آنکھوں سے پہاڑی کو تکنے لگی جو اس وقت اچانک تاریکی سے نکل آئی تھی۔ سائے خوف زدہ ہو کر تیزی سے ریت پر ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ وہ کوئی ایسی چیز ڈھونڈھ رہے تھے جو ان کو نہیں مل رہی تھی۔ اب یہ سائے کوشش کر کے لیٹ گئے۔ انھوں نے ایک دوسرے کو اور پہاڑی کے اوپر اسٹیپی کی طرف دیکھا۔ اسٹیپی سے ٹاپوں کی آواز برابر آ رہی تھی اور قریب ہوتی جاتی تھی۔

اور قریب، زیادہ قریب... سننے والے یہ محسوس کر سکتے تھے کہ اوپر مٹی خشک، سخت اور گونج دار ہے۔

آگ کی آخری سانسیں تھیں، شاید اس کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ کیا ہو رہا ہے، اس لئے اس نے مدھم ہونا شروع کیا اور آخر میں سفید راکھ کا کمبل اوڑھ کر سو گئی۔ ہراساں سائے اس طرح زمین پر پڑے تھے کہ وہ ماحول کی تاریکی میں بالکل مل گئے تھے لیکن ان کے سر اب بھی پہاڑی کی طرف تھے۔

ٹاپوں کی آواز ختم ہو گئی۔ پہاڑی کے کنارے پر جو تاروں بھرے روشن آسمان کی وجہ سے صاف دکھائی دیتا تھا ایک سیاہ بےڈھنگے عفریت کا خاکہ دکھائی دیا۔ وہ شکل کے لحاظ سے چوڑا اور بدقطع تھا جیسے پہاڑ سے کوئی چٹان گر پڑی ہو۔ وہ بے حس و حرکت کھڑا ہو گیا اور چمکدار جھلملاتے ہوئے ستارے اس کی آڑ میں چھپ گئے۔

چند لمحے تک رات کی ساری آوازیں خاموشی میں گم رہیں۔

''ارے، وہاں کون لوگ ہیں؟''

یہ آواز پہاڑی سے آئی، تند اور گونج دار اور دریا کے پار سے اس کی بازگشت ہوئی۔

''تم سے کیا مطلب؟'' لمبے آدمی نے چمچے سے دھی چلاتے ہوئے لاپروائی سے رک رک کر کہا۔

''تم کون ہو؟ تم...'' اور اس کے بعد گالیوں کی بوچھار نے رات کی خاموشی کو گندگی سے بھر دیا۔

لمبا آدمی بےڈھنگے پن سے بھالو کی طرح اٹھا اور کہنے لگا:

''تم کیا چاہتے ہو؟ بھاگ جاؤ یہاں سے... کیا تم کچھ گڑبڑ کرنےوالے ہو؟''

آگ نے اپنی ادھ کھلی سرخ آنکھ سے بڑی احتیاط کے ساتھ جھانکا اور اس کی سرخ روشنی میں ایک لمحہ کے لئے پہاڑی پر ایک گھوڑے کا سر دکھائی دیا، اس کے اوپر ایک آدمی کا سر تھا، اس کے برابر دوسرے گھوڑے کا سر اور اس کے اوپر دوسرے آدمی کا سر۔ اسی وقت آگ کی ایک لمبی لہر چمک اٹھی، پھر گولی چلنے کی آواز آئی، اس کی تھرتھراتی ہوئی ناخوشگوار گونج دریا اور جنگل میں پھیل گئی، رات کا سناٹا ٹوٹ گیا۔ دیر تک اس آواز کی بازگشت ہوتی رہی پھر ڈراؤنے انداز میں ختم ہو گئی۔

وہ پرسکون رات، تاروں سے جھلملاتا تاریک دریا، سوئی سوئی سی سرگوشی، پہاڑی، اسٹیپی جہاں سے بٹیروں کے بولنے کی آواز آ رہی تھی اور تازہ کٹی ہوئی گھاس کی سہک — سب ختم ہو گئی۔ ان کی جگہ اندھادھند جبر و ظلم کی فضا پیدا ہو گئی۔

''کزاک!'' پرنٹر نے کھڑے ہوتے ہوئے چپکے سے کہا۔ ''خدا حافظ۔ میں بھاگ جاؤنگا...''

بڈھے آدمی نے اس کا بازو پکڑ کر اسے روک لیا۔

”ذرا ٹھہرو... کوئی جلدی نہیں ہے...“

”ہم کو ڈراؤ ست۔ ہم آسانی سے نہیں ڈرینگے۔ اس طرح سے جنگل کے پار تین چار میل تک بےخطا آدمی زخمی ہو سکتے ہیں۔ حراسیو! جانتے ہو گولی کتنی دور تک جاتی ہے...“ لمبے آدمی نے غصہ میں زور سے مکا تان کر کہا۔

سفید راکھ نے آگ کو پھر ڈھک لیا اور تاریک پہاڑی کے اوپر سے کالے کالے سائے کھسکنے لگے۔ وہ چھوٹے اور مختصر ہوتے گئے اور کنارے کے پار غائب ہو گئے۔

ستارے بےفکری سے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے اور اسٹیپی سے واپس ہوتے ہوئے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز دور جاکر مدھم ہوتی جا رہی تھی۔ یہ آواز خاموش تاریکی میں خوف و ہراس کے ہلکے ہلکے آثار چھوڑ گئی تھی۔ پانی کی تیز سرگوشی نے چاہا کہ خاموشی اور تاریکی کو نیند سے بھردے اور سب کچھ بھلادے لیکن واپس ہوتے ہوئے گھوڑوں کی ٹاپوں نے جو سناٹا پیدا کیا تھا وہ رات کی سوئی سوئی پرسکون سرگوشی سے کہیں زیادہ ڈراؤنا اور زوردار تھا۔

وہ پھر بیٹھ گئے۔

”کھانا کھانا اجیرن کر دیا سوروں نے!“

”بڑے پاجی ہیں یہ لوگ! ان کے پاس ضرورت سے زیادہ کھیت ہیں پھر بھی وہ لوگوں کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔“

حالانکہ پھر خاموشی چھا گئی لیکن رات میں وہ سکون و خواب کی کیفیات نہیں پیدا ہو سکیں جو سب چیزوں پر طاری تھیں۔ معلوم ہوتا تھا سب کچھ اڑ گیا ہے۔ صرف اندھیرا اور کسی غیرمتوقع واقعے کا انتظار باقی رہ گیا ہے۔ اندھیرے میں کسی دھات کی چیز کی جھنکار ہوئی اور اس انتظار کی بھی تصدیق ہو گئی۔ ایک منٹ بعد پھر ایسی ہی آواز ہوئی۔ سر پھر اس طرف مڑ گئے لیکن اس مرتبہ وہ دریا کے نشیبی کنارے کی طرف تاریکی میں دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

پھر جھنکار ہوئی اور اس کے ساتھ ایک تیز، نپے تلے پیر کے نیچے نم ریت کی چرچراہٹ کی آواز سنائی دی۔ دریا کے کنارے کی

تاریکی میں پہاڑی کے نیچے کوئی سیاہ چیز دکھائی دی جو تاریکی سے بھی زیادہ سیاہ تھی - یہ برابر قریب آتی گئی... اور اب سر ہلاتے ہوئے گھوڑوں اور ان کے سواروں کے سیاہ خاکے دکھائی دینے لگے -

وہ گھوڑوں پر جمے بیٹھے تھے، شانوں پر رائفلوں کی نالیں چمک رہی تھیں - وہ سر ہلاتے، چوکنے اور پھنکتے ہوئے گھوڑوں کی باگیں گھسیٹے سیدھے آگ کے پاس آ گئے -

''تم کون ہو؟''

''تمھیں کیا کرنا ہے؟''

تینوں کھڑے ہو گئے -

پھر چنیدہ گالیوں کی بوچھار ہونے لگی -

''تم ہماری تلواروں کا مزا چکھنا چاہتے ہو؟ چاھو تو چکھ سکتے ہو، ہم تمھیں کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دینگے!.. تم ہو کون؟ میں جاننا چاھتا ہوں - ''

''کیا تم اندھے ہو؟ ہم بجرے کے چوکیدار ہیں - ''

''ریابوف، ان کو باندھ کر کماندار کے پاس لے چلو - ''

ایک نوجوان کزاک جس کا چہرہ بھورا اور جبڑا آگے نکلا ہوا تھا گھوڑے سے کودا اور گھوڑے کی لگام پکڑے پکڑے ان کے پاس آیا - چلنے میں اس کے ہتھیار کھڑکھڑا رہے تھے -

''ہم جانتے ہیں تم کیسے چوکیدار ہو - گھوسو...''

''اور تم، تم لمبو حرامی - راستے بھر تمہارے اوپر کوڑے برسینگے - میں تمھیں پلٹ کر جواب دینے کا مزا چکھاؤنگا - تم...''

''ہم لوگوں کو باندھ کر لے جانا آسان ہے'' بڈھے نے اطمینان سے کہا - ''زندگی بھر تمہارا کام ھی یہی رہا ہے، لیکن غالباً بعد کو مصیبت آئےگی - تم ھمیں لئے جا رہے ھو اور بجرا جو چوٹی تک سامان سے بھرا پڑا ہے صبح تک خالی ھوجائیگا اور جب اسٹیمر آئےگا تو بجرا ایسا خالی ھوگا جیسے میری جیبیں - ہے نا؟ میرے خیال میں لوگ کہیں گے کہ کزاکوں نے یہ کیا ہے اور اسی وجہ سے وہ چوکیداروں کو پکڑ لے گئے - یہ کزاک ان باتوں میں بڑے استاد...''

''جھوٹ بند کر، بڈھے شیطان!،، داڑھی والے کزاک کے لہجے میں تذبذب تھا۔ ''ریابوف، ایک منٹ رکنا... تمھارا پاسپورٹ کہاں ہے، پاجی؟،،
''کیا تم ابھی آئے ہو، نو سکھئے؟،، لمبا آدمی ہنسا۔ ''پاسپورٹ تو سالک کے پاس رہتے ہیں۔ جاکر کپتان سے مانگو، وہ تمھیں پاسپورٹ دکھا دیگا۔،،
کزاک نے تذبذب کی حالت میں گھوڑے کی لگام کھینچی۔
''اور وہ؟،،
''یہ بھی چوکیدار ہے، بجرے پر سقے کا کام کرتا ہے۔،،
''اچھا جھوٹ بندکر، کتے کے بچے! تو سمجھتا ہے کہ میں یہ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ یہ شہر سے بھاگ کر آیا ہے۔ ارے یہ تو وہی ہے جس کو ہم ڈھونڈھ رہے ہیں... ریابوف، دیکھو۔ ممکن ہے کہ کوئی بھاگ کر گیا ہو۔ آگ کے چاروں طرف پیر کے نشانات دیکھو اس طرف...،،
جوان کزاک نے ایک ٹہنی اٹھا کر آگ پر دکھائی یہاں تک کہ وہ جل اٹھی۔ پھر اس نے جھک کر چند قدم ریت کو دیکھا جس پر سائے زوروں سے تھرتھرا رہے تھے۔
''نہیں، قدموں کے نشانات آپکی طرف ہیں، سیدھے شہر سے آئے ہیں۔،،
''پاجیو، تم سمجھتے کہ تم ہم سے جھوٹ بول کر نکل جاؤگے۔ ہے نا؟ انقلابیوں کو چھپاتے ہو۔ ہو نہہ؟ اچھا تمھیں اس کا سزا ملےگا... اس کو باندھ لو، ریابوف۔،،
''ہمارے پاس رسی نہیں ہے۔،،
''اس کے گلے میں تسمہ باندھ کر کتے کی طرح گھسیٹتے لے چلو۔،،
جوان کزاک نے اپنے گھوڑے کی راس کا لمبا سرا لیا جو گھوڑے کی سرکی رسی کی جگہ کزاک استعمال کرتے ہیں اور پرنٹر کی طرف بڑھا:
''ادھر گھوم، پاجی۔،،
پرنٹر اس کو ڈھکیل کر پیچھے ہٹ گیا۔
''تم جہنم پہنچ جاؤگے!،،

ایک رائفل کا کھٹکا کھڑکا۔ پرنٹر نے نگاہ اٹھائی۔ داڑھی والے کزاک کی رائفل کی نال اس کو گھور رہی تھی۔

''بس ایک قدم ہٹے اور میں نے گولی چلائی!''

ریابوف نے اس کی گردن میں تسمہ ڈال دیا اور اس کو باندھنے لگا۔ داڑھی‌والے کزاک نے اپنی رائفل کندھے پر ڈال لی۔ پرنٹر نے تھکی تھکی بے فکر نگاہوں سے تاریکی میں دریا کی طرف دیکھا۔ تاریک رات میں گھٹن تھی۔ وہ چاروں طرف سے ان پر چھا گئی تھی۔ ہوا کا کہیں نشان تک نہ تھا۔

بڈھے اور لمبے آدمی نے ایک دوسرے کو معنی‌خیز نگاہوں سے دیکھا۔ وہ اس کارروائی کو بے‌پروائی سے دیکھتے رہے۔

''باندھ لیا؟.. اچھا۔ اب گھوڑے پر بیٹھ جاؤ اور چلو۔ اس کو اپنے گھوڑے کے سامنے کوڑے مار مار کر لے چلو۔''

جوان کزاک نے اپنا ایک پیر رکاب میں ڈالا اور سامنے سے کاٹھی کی محراب کو پکڑ لیا تاکہ اچک کر گھوڑے پر بیٹھ جائے۔ گھوڑے کے سر اور آدمی کی گردن کے درمیان کالا کالا تسمہ چمک رہا تھا۔

بڈھا نوجوان کزاک کے پاس گیا اور جس وقت وہ اپنا دوسرا پیر پھینک کر گھوڑے پر بیٹھنے والا تھا اس سے جھک کر چپکے سے کان میں کچھ کہا۔ نوجوان گھوڑے سے کود پڑا اور بڈھے کے شانے پر اپنا چہرہ رکھ کر پھٹی پھٹی آواز میں چیخا۔

اسی وقت لمبا آدمی داڑھی والے کزاک کے پاس پہنچا جو گھوڑے پر سوار تھا اور ہاتھ بڑھا کر اس سے پوچھنے لگا:

''حضور، کیا آپ کا کچھ کھو گیا ہے؟''

کزاک اس کو دیکھنے کے لئے زین پر گھوما اور اس کو محسوس ہوا جیسے سانپ کی طرح کسی چیز نے اس کی گردن کو آہنی گرفت میں لے لیا ہو۔ اس نے فوراً گھوڑے کو ایڑ لگائی تاکہ خطرے سے بھاگ نکلے لیکن ایک دوسرا سانپ اسی آہنی گرفت کے ساتھ اس کی کمر میں لپٹ گیا اور پھر پیچھے سے ایک زبردست ہاتھ نے لگام تھام لی اور اس کو اتنی زور سے کھینچا کہ گھوڑے کا سر اوپر اٹھ گیا اور وہ پچھلے پیروں پر بیٹھ گیا، پیچھے کی طرف پھسلا اور پہاڑی سے اپنا پٹھا اڑا کر رک گیا۔

''ا... و... ہ... ہو... ہو! ح... حرا... سی!.. ر... ر... یا... بو... ف... سد... دا!..''

''اچھا... پا... جی۔''

''اچھا رہو... ذرا... سجھے... سجھے... اپنی... تلوا: تو...''

''میں انتظار کر رہا ہوں... ذرا اترو. تو...''

ان کی گرم گرم سانسیں خوب زور سے لہرالہرا کر آواز کے ساتھ ایک دوسرے کے چہرے پر لگ رہی تھیں۔ گھوڑے دو آدمیوں کے بوجھ سے دبے زور لگا رہے تھے اور پہاڑی سے مٹی اور پتھر ان پر برس رہے تھے۔

ارے... ر... یا... بوف!..''

کزاک نے اپنا ہاتھ چھڑانے کے لئے پوری طاقت لگا دی اور اپنی تلوار کا دستہ ٹٹولنے لگا لیکن وہ جس شیطان کے چنگل میں تھا اس نے فوق‌الفطرت طاقت سے اس کو جھکا دیا اور باوجود اس کے کہ داڑھی‌والے کزاک نے بھی زبردست کوشش کی لیکن وہ زین سے گر ہی پڑا۔ ہلکی سی چمکتی ہوئی رکابیں جن میں پھیلے ہوئے پیر پھنسے تھے اوپر آ گئیں اور پسینے سے شرابور سر کسمساتے ہوئے گھوڑے کے پیٹ کے نیچے جا پہنچا۔

کوئی چیز کھڑکھڑائی اور الف ہوتے ہوئے گھوڑے کے نیچے دو آدمیوں کے گرنے کے دھماکے سے زمین کانپ گئی۔

رات ایسی پرسکون اور ڈراؤنی تھی جیسے وہ کسی بات کی منتظر ہو۔ گہری خاموشی کو صرف بھاری بھاری سانسیں اور دبی دبی کراہیں توڑ رہی تھیں۔ غصے سے بھنچے ہوئے دانتوں کے اندر کوسنے اور گالیاں گھٹ کر رہ گئی تھیں۔

گھوڑا آزاد ہو گیا تھا۔ ریت پر گھسٹتی ہوئی لگام کا سرا باربار اس کے پیر کے نیچے پڑ رہا تھا اور وہ باربار سر جھٹک رہا تھا۔ وہ اس جگہ سے مارے ڈر کے بھاگ کھڑا ہوا جہاں زمین پر ایک بھاری پلندہ لڑھک رہا تھا۔

بڈھے اور پرنٹر نے جو اب آزاد ہو چکا تھا جوان کزاک کو باندھ لیا، وہ ریت پر لاچار پڑا ہوا تھا۔

''مجھے پھندےوالا تسمہ دینا''، لمبے آدمی نے بھرائی آواز میں کہا۔ اس کا گھٹنا ہانپتے ہوئے کزاک کے سینے پر تھا۔

بڈھے اور پرنٹر نے گھوڑا پکڑا اور اس کے مالک کے پاس دوڑ کر گئے جو ریت پر پڑا تھا اور جب تسمہ اس کی کلائیوں کے گوشت میں پیوست ہوا تو کزاک کا جوڑ جوڑ چرسرانے لگا۔

''ارے، بس میں نے اس شیطان کو گھوڑے سے گرا ہی لیا۔ ذرا دیر ہوجاتی تو گھوڑا اس کو لیکر رفوچکر ہو جاتا... آؤ دھی ختم کر لیں۔ یہ لوگ تو کھانا بھی نہیں کھانے دیتے۔ یہ سور بڑا گڑبڑ کرتے ہیں۔''

(۴)

وہ ایک حلقے میں خوش خوش بیٹھ گئے۔ ان کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔ چہروں سے پسینہ پونچھ کر وہ پھر کھانا کھانے لگے۔

''بابا نے جب اس لونڈے کو ریت پر گرایا تو اس نے سانس تک نہ لی۔''

''اور یہ موٹا سور البتہ کافی مضبوط تھا۔''

''اور یہ تمہارے گلے میں تسمہ باندھکر لے جانا چاھتا تھا، اونہہ، گدھا کہیں کا...''

انہوں نے آگ میں کچھ ٹہنیاں پھینکیں، وہ تقریباً بجھ چکی تھی لیکن پھر سے جاگ اٹھی اور سائے ریت پر لہرانے لگے۔ بندھے ہوئے کزاک بےحس و حرکت پڑے تھے اور ان کے پاس گھوڑے سر جھکائے کھڑے تھے۔

''پچھلے سال ھمارا بجرا وھاں اتھلے پانی میں کھڑا تھا،'' لمبے آدمی نے کہنا شروع کیا۔ اس نے اپنا چمچہ رکھ دیا اور گھوم کر اپنا نتھنا دباتے ہوئے زور سے ناک صاف کی۔ ''طوفان آگیا، کیا طوفان تھا! ایک نیلا گیند میرے پاس سے سنسناتا ہوا گذرا جس سے میں تقریباً چھ گز ایک طرف جا پڑا۔ یہ گیند کنارے سے سو گز کے فاصلے پر ایک درخت سے ٹکرایا اور اس کے ٹھنٹھ کے سوا کچھ نہ رہ گیا۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔''

''پچھلی گرمیوں میں بڑی آندھیاں آئیں، شہر کے دو مکانوں میں آگ لگ گئی۔''

داڑھی والے کزاک کے حواس اب ٹھیک ہو رہے تھے۔ وہ غیرمتوقع حادثے سے چوندھیا گیا تھا۔ اس نے سہمے سہمے چاروں طرف دیکھنا شروع کیا اور اس خراب‌حالی میں وہ تھوڑا بہت دیکھ

سکا۔ حقیقت تھی کہ وہ پھندے دار تسمہ میں بندھا پڑا تھا اور گھوڑا اس کے پاس کھڑا تھا اور وہ تینوں دھی کھا رہے تھے جو ان کے چمچوں پر سفید سفید چمک رہا تھا۔ اس کو ریابوف نہیں نظر آ رہا تھا جو اس کی پشت پر پڑا تھا۔

''تم کیا سوچ رہے ہو، بدمست پاجیو۔ تم کو اپنے سر نہیں پیارے ہیں یا تم پاگل ہو گئے ہو؟''

''ہمیں اپنے سر ضرور پیارے ہیں!'' لمبے آدمی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اور اسی وجہ سے تو ہم نے تم کو باندھ دیا ہے۔''

''کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم صرف دو ہیں؟ پورے سو کزاکوں کا دستہ تعینات ہے اور ہر طرف گشتی دستے بھیجے جا رہے ہیں... اگر کوئی اس طرف آ گیا تو تم کو دیکھتے ہی گولی سے اڑا دیگا... مجھ کو جلدی سے کھول دو۔''

''اگر یہاں کزاک نہ ہونگے تو وہ ہم پر گولی کیوں چلائیں گے؟''

''فضول مت بکو، تم یہاں سے نکل کر نہیں جا سکتے۔ ہم کو فوراً کھول دو... سنتے ہو تم...''

''اگر یہاں کزاک نہ ہونگے تو وہ ہم پر گولی کیوں چلائیں گے؟'' لمبے آدمی نے اپنی بات بڑی معصومیت سے جاری رکھی۔ ''تم ذرا صبر سے کام لو۔ ہم اپنا کھانا ختم کر لیں تو تمہارے گھوڑوں کی کاٹھیاں کھولینگے۔ تمہاری پتلونوں اور قمیصوں میں بالو بھر دینگے اور تم دونوں کو دریا کے سپرد کر دینگے۔''

اس کے بعد موت کی سی خاموشی طاری ہو گئی۔ کزاک کی آنکھیں گول ہو گئیں اور شدید تاریکی کے باوجود اس کی آنکھوں کی سفیدی تک صاف دکھائی دینے لگی۔ اس کی سانس تیز ہو گئی اور تکلیف محسوس ہونے لگی لیکن اس نے ضبط کرکے مری ہوئی آواز میں کہا:

''مجھے ڈرانے کی کوشش نہ کرو، میں آسانی سے نہیں ڈرتا... کزاک سوئی کی طرح نہیں کھو سکتا۔ ضرور پتہ چل جائیگا۔ تم گھوڑوں کو نہیں ڈبو سکتے اور یہی پتہ دینگے۔''

لمبے آدمی نے زور کا قہقہہ لگایا جس کی بازگشت دریا کے پار سے ہوئی۔

"جب تک باتیں بنا سکتے ہو خوب بنا لو - ہماری فکر نہ کرو، بھائی کزاک، ہم گھوڑوں کی زینیں کھول کر تمہاری گردنوں میں لٹکا دینگے تاکہ تم قطعی ڈوب جاؤ، کاٹھیاں بھاری ھیں وہ تیرینگی نہیں - گھوڑوں کو ہم اسٹیپی میں لے جائیں گے اور ان کی لگامیں کھولکر چھوڑ دینگے - پھر دیکھنا کہ وہ آزاد ھوکر کیسی چوکڑیاں بھرتے ھیں - اور، کزاکو، سنتے ھو اسٹیپی میں ان کو جلد ھی مالک مل جائیں گے - وہ کسی نہ کسی فارم کے قریب پہنچ جائیں گے اور تم جانتے ھی ھو کہ کھویا گھوڑا پاکر کون خوش نہیں ھوتا - فارم میں وہ ھمیشہ کارآمد ثابت ھوگا - اگر یہ نہ ھوا تو اسٹیپی میں ھمیشہ گھوڑےچور پھرتے رھتے ھیں - ان کو اس آسانی سے گھوڑا مل جائیگا تو وہ کیسے خوش ھوں گے - سمجھے نا، کزاکو - "

خاموشی - کزاکوں پر گہری سیاہ رات چھائی ھوئی تھی جو بےرحمی سے موت کی پیش گوئی کر رھی تھی - اچانک بے حس و حرکت ڈراؤنے اندھیرے سے بھونکنے کی بھاری آوازیں متواتر آنے لگیں جو کبھی زیادہ زور دار ھو جاتیں اور کبھی مدھم جیسے کوئی کمعمر بھیڑیا آسمان کی طرف تھوتھن کرکے چلاتا ھے - داڑھی والا کزاک سوں سوں کر رھا تھا اور ترچھی نگاھوں سے تینوں کو دھی کھاتے دیکھ رھا تھا - وہ آھستہ آھستہ کھا رھے تھے - ان کو مرنا تو تھا نہیں - ان کا یہ اطمینان بہت ھی جاں سوز تھا - بھیڑئے کے چلانے کی آواز برابر رات کی خاموشی کو توڑتی رھی - یہ ڈراؤنی آواز دریا کے پار جاکر اسٹیپی کی ساکت اور لامحدود وسعتوں میں مہیب سسکتی ھوئی غراھٹ بن کر غائب ھو جاتی -

"جب تمہارا کبھی کسی تگڑے سے پالا پڑ جاتا ھے تو کچھ کئے نہیں بنتی - بس، تم تو بےگناھوں اور نہتوں کو مارنا اور اپاھج بنانا جانتے ھو ... اس کی گردن کتوں کی طرح سے باندھی، ھاتھ یا کمر نہیں، گردن - ھائے ... ھائے! .."

داڑھی والے کزاک نے اپنے دانت پیس کر کہا:

"چلانا بند کرو، حرامی! .."

لیکن اس کی پشت پر بھیڑئے کی آواز برابر آتی رھی اور اس کی چیخ دریا اور اسٹیپی میں پھیلتی رھی - داڑھی والا کزاک ھیجانی

حالت میں دیکھتا رہا کہ وہ تینوں بڑے اطمینان سے کھانا کھا رہے ہیں ۔ وہ سخت کرب کی حالت میں سوچ رہا تھا کہ کاش دھی کبھی نہ ختم ہو لیکن چمچے پیالے کے اندر زیادہ گہرے جانے لگے ۔

''ارے، سنو، بھائیو،، اس نے پھر دھیمی آواز میں کہا ۔ ''ہم کو چھوڑ دو...،،

''دیکھو، بچے،، بڈھے نے نرمی سے بات شروع کی ۔ ''تم لوگوں کو مارنے اور زخمی کرنے آئے تھے ۔ تم نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ تم کو یہ دن دیکھنا نصیب ہوگا کہ تم پڑے سسکتے ہوگے ۔،،

اس نے ہونٹوں سے اپنا چمچہ چاٹا اور اپنی مونچھیں پونچھکر پھر کہنے لگا :

''ہا — ں، وہ وقت آئیگا جب عوام یکدم اٹھ کھڑے ہوں گے اور تم پڑے سسکتے ہوگے، تم کو حیرت ہوگی ۔ تم کو دل ہی دل میں افسوس ہوگا ۔ پھر تم دوسری طرح کی باتیں کروگے اور کہوگے کہ اگر ہم کو موقع ملتا تو ہماری زندگی مختلف ہوتی ۔،،

''ہم صرف اپنا فرض ادا کر رہے ہیں ۔ یہ کام ہماری مرضی کے مطابق تھوڑے ہی ہے... میرے کھیت ہے، بال بچے ہیں، میں بھی گھر جانا چاھتا ہوں، اسٹیپی میں مارے مارے پھرنے میں کوئی لطف تو آتا نہیں...،،

''فرض!.. اگر تم کو بزرگوں کی شبیہیں برباد کرنے کا فرض سونپ دیا جائے تو کیا تم وہ بھی کروگے؟،،

''ضرور! کیونکہ میں نے تخت اور اپنے ملک کی خدمت کا حلف لیا ہے...،، اور اس نے محسوس کیا کہ اس سنسان، اندھیرے اور خاموش دریا کے کنارے وقت تیزی سے گذر رہا ہے ۔ دریا ان کا منتظر ہے اور چمچے پیالے کی تہہ تک پہنچ رہے ہیں ۔

''حلف!..،، بڈھے کے لہجے میں تلخی تھی ۔ ''حلف!.. سنو، تمہارا حلف یہ ہے،، بڈھے نے اپنا ھاتھ مجذوب کی طرح اٹھایا ۔ ''مقدس تاروں کی قسم، روشن چاند کی قسم، تاریک جنگلوں، شفاف پانی، جنگلی جانوروں اور ہوا کی چڑیوں کی قسم، بنی نوع انسان کی قسم — کیونکہ یہ انسانی زندگی کا معاملہ ہے ۔ یہ رہا تمہارا سچا حلف، وہ اول فول حلف نہیں جو پادری پڑھ کر تمھیں دلاتے ہیں ۔ یہ ہے وہ حلف جو شہیدوں نے لیا ہے ۔ اور یہی حلف ہر اس شخص

کو لینا چاہئے جس کی روح مسخ نہیں ہوئی ہے... لیکن تم، تمہاری روحیں مسخ ہو چکی ہیں اور کتے کے اندھے پلوں کی طرح ہر جگہ ٹوہ لگاتے پھرتے ہو... زندگی، یہاں تمہارے چاروں طرف زندگی ہے،، اس نے اپنے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تمھیں زندگی کے سامنے حلف اٹھانا چاہئے، پادری کے سامنے نہیں۔ لیکن زندگی تمہارے لئے کیا حقیقت رکھتی ہے، تم تو گھوڑوں کی ٹاپوں کے نیچے اس کو روندتے پھرتے ہو، تلواروں سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہو، اس کو اپنی برچھیوں سے مجروح کرتے ہو، گولی مار دیتے ہو... بس تم گولی چلا دیتے ہو اور اس کی فکر نہیں کرتے کہ وہ کس کے کلیجے کے پار ہوگی!..،،

ان کے چاروں طرف اندھیرا اور سناٹا تھا۔ اب نہ تو چلبلا پانی اندھیرے میں دھیما دھیما کلکلا رہا تھا اور نہ دریا پار کا جنگل اسکی دھیمی آواز سن رہا تھا اور نہ تاریک دریا کا کنارا جو دو قدم پر تھا۔ لیکن تینوں آدمیوں کے چہرے آگ کی روشنی کی وجہ سے تاریکی میں تانبے کی طرح چمک رہے تھے اور بس۔

کزاک کی ٹکٹکی ان لوگوں پر بندھی تھی۔ جتنا ہی وہ ان لوگوں کو دیکھتا اتنے ہی وہ طاقت ور معلوم ہوتے۔ وہ اس طرح بیٹھے تھے جیسے کانسے کے مجسمے ہوں یا رات اور تاریکی کے آسیبی عفریت۔

''ہاں، ہاں۔ یہی زندگی ہے،، بڈھے نے پھر شروع کیا۔ اس نے چمچہ رکھ دیا اور منہ کے اندر آتے ہوئے مونچھوں کے بالوں کو ہٹایا۔ پھر اس نے چمچہ اٹھایا اور منہ میں دھی ڈالا جو گھنی مونچھوں سے ڈھکا تھا۔ کزاک چمچہ کی جنبشوں کو دیکھتا رہا جس میں سفید دھی نظر آ رہا تھا۔ ''مثال کے طور پر مان لو کہ تم اپنے فارم پر دن‌رات کام کرو۔ اپنے هل سے زمین جوتو... پھر جب تک هرے هرے انکھوے نہ پھوٹیں تم آسمان دیکھتے رهو اور بارش کا انتظار کرتے رهو۔ پھر انکھوے پھوٹیں اور بڑھیں، بالیاں نکلیں اور ان میں اناج بھر آئے۔ تم ہر وقت اس کی دیکھ بھال میں رہو۔ اس گیہوں کی دیکھ بھال میں، اس گھاس کی...،،

''ایک تارا ٹوٹا،، لمبے آدمی نے کھانستے ہوئے کہا۔

کزاک نے دریا کی طرف دیکھا جو لاتعداد ستاروں کے عکس سے جھلملا رہا تھا۔ اس نے سوتے ہوئے پانی کی مدھم بلبلاہٹ سنی

لیکن یہ سب باتیں اس کو پرانی یادوں کی طرح دور معلوم ہو رہی تھیں - کسی زمانے میں اس کا خاندان اور فارم تھا - روزمرہ کا کام اس کی زندگی کا جز بن گیا تھا - یہ سب اب گذری ہوئی باتیں تھیں — حال میں تاریکی کے سوا کچھ بھی نہ تھا - اندھیرے میں ان آدمیوں کے خاکے آگ کی روشنی کی وجہ سے کانسے کی طرح چمک رہے تھے -

گھوڑا کھڑا تھا - اس نے افسردگی سے اپنے کان ڈال دئے تھے اور رنج سے سر جھکائے تھا - دریا پر پھڑ پھڑا کر اڑتی ہوئی کسی ان دیکھی چڑیا کی چہکار پھیل گئی -

بڈھا باتیں بند کرکے اپنی سفید بھوؤں کے نیچے سے دھندلے گل کو گھورنے لگا -

''گھاس اگتی ہے اور آدمی اس کی نگرانی کرتا ہے، کوئی ننھا سا پودا زمین سے اگتا ہے اور آدمی اس کو بچا کر چلتا ہے کہ کہیں ٹوٹ نہ جائے... لیکن آدمی کچھ بھی نہیں - وہ گیہوں کے برابر بھی حقیقت نہیں رکھتا - ذرا سوچو تو - اس کے جان ہوتی ہے - اوپر ستاروں کو دیکھو، وہ سب کے لئے چمک رہے ہیں اور تم لوگوں پر ظلم کرتے ہو، ان کی جانیں لیتے ہو اور ان کو جیل میں ڈال دیتے ہو... حلف!.. انسانی زندگی سے بڑا حلف اور کوئی نہیں ہو سکتا، یہ عزیزترین حلف ہے - بچے، تم یہاں سوچکر آئے تھے کہ تم بڑے بلوان ہو لیکن اب تم یہاں پڑے سسک...''

کزاک نے ہونٹ چاٹے اور اپنے کو چھڑانے کے لئے پورا زور لگا دیا لیکن کچے چمڑے کا تسمہ اور بھی گوشت میں پیوست ہوگیا -

''سنو، بھائی،'' وہ پھر بےبس ہوکر کہنے لگا - ''کیا میں...''

آدمیوں کے چہرے کھانا کھانے میں حرکت کر رہے تھے - آگ ان پر پوری طرح روشنی ڈال رہی تھی اور ان سے ایسے عزم کا اظہار ہو رہا تھا کہ کزاک نے اپنی نگاہیں ادھر سے ہٹا لیں - انھوں نے چمچے صاف کئے، ان کو چھپا دئے اور کزاکوں کے نزدیک آئے -

کزاک کے ذہن میں وہ پورا دن پھر گیا - اس کی نگاہوں کے سامنے یہ بات بہت صاف آ گئی کہ کس طرح جان لیوا حالات اس کو اس انجام اور خواہ مخواہ موت کی طرف گھسیٹ لائے تھے - وہ غم میں ڈوبا ہوا سن رہا تھا کہ اس کے پیچھے نوجوان کزاک رو چلا

رہا ہے لیکن اسٹیپی سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ اور واقعی ادھر آ بھی کون سکتا تھا؟ اب رہائی پانے اور رحم کی کوئی امید نہیں تھی اور اس کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی کیونکہ اس نے بھی تو ذرا رحم نہیں کیا تھا۔

یہ خاموشی موت سے بھی زیادہ ڈراؤنی تھی۔ وہ انتہائی کوفت اور ہیجان کی حالت میں پڑا پڑا سب سن رہا تھا۔ پھر اس نے اچانک بہت سے ٹڈوں کی چرچراہٹ سنی، یہ چرچراہٹ اسٹیپی میں ہمیشہ سنائی دیتی تھی لیکن آج یہ آواز آخری اور الوداعی معلوم ہوتی تھی۔

وہ ریابوف سے نبٹ رہے تھے کیونکہ اس کی چیخیں زیادہ تیز اور دردبھری ہوتی جاتی تھیں پھر اچانک بند ہوگئیں۔

داڑھی‌والے کزاک کے دل کی حرکت ایک لمحہ کے لئے بند سی ہوگئی۔ لمبا آدمی اس کے اوپر جھکا تسمے کو کچھ کر رہا تھا۔ تسمہ ڈھیلا ہوکر اس کے ہاتھوں سے کھلا اور نیچے گر گیا اور کزاک اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ریابوف ایک پیر سے لنگڑا رہا تھا، اس کے اسلحہ کھڑکھڑاتے رہے تھے اور وہ گھوڑے پر بیٹھنے جا رہا تھا۔ آخرکار وہ اچھل کر بیٹھ گیا اور اس کا گھوڑا سرپٹ بھاگتا ہوا اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

”ہا۔ ہا۔ ہا!..“ لمبا آدمی ہنس رہا تھا۔ ”وہ تو سر پر پیر رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا اور اب تم بھی رفو چکر ہو جاؤ۔“

کزاک نے بڑی مشکل سے وہ خوشی ضبط کی جو اس کو از سر نو زندگی ملنے سے ہوئی تھی، وہ جان بوجھکر سکون کے ساتھ گھوڑے تک گیا، تنگ کو دیکھا اور گھوڑے پر سوار ہوکر لگام سنبھالی...

”خدا حافظ، لوگو۔“

”خدا حافظ، کزاک!..“

گھوڑا آہستہ آہستہ جا رہا تھا، اس کے پیروں کے نیچے ریت چرسرا رہی تھی۔ رفتہ رفتہ تاریکی نے اس کو نگل لیا۔

پانی کی دھاروں کی سوئی سوئی سرگوشی پہلے کی طرح جاری تھی اور آسمان کے لاتعداد تارے تاریک پانی میں جھلملا رہے تھے۔

”اب اگر چاہو تو تم سو سکتے ہو۔“

”برتن دھونا ہے۔“

15—2611

پانی کے اوپر جھک کر لمبے آدمی نے خوب زور کے ساتھ ریت سے برتن کے اندر صاف کرنا شروع کر دیا۔

"وہ بہت جلدی بھاگ نکلے۔"

"کوئی بھی مرنا نہیں چاہتا۔"

"دب اکبر کے تارے کافی بلند ہو گئے ہیں، کافی دیر ہو گئی ہے... آہا — ہا!..."

اور کسی نے کئی مرتبہ جماہی کی یہ آواز دریا پر دھرائی۔ اسٹیپی، دریا اور دھندلے جنگل پر خاموشی طاری تھی، ہر جگہ امن و سکون معلوم ہوتا تھا۔

"تمھارا نام کیا ہے؟"

"الکسئی۔"

"خاندانی نام؟"

"نکولائےوچ۔"

"اچھا، میکولایچ، ہم اب بجرے میں چلکر سوئیں گے، وہاں کچھ گھاس پڑی ہے۔ سونے سے پہلے نہانے کے متعلق کیا خیال ہے؟"

"معقول بات ہے۔"

وہ پانی کے کنارے پہنچے۔ دریا بہت آھستہ بہہ رہا تھا۔ اس میں گاڑھے تیل کی سی چمک تھی اور ایک بل کھاتی ہوئی لکیر اس کو بےحس و حرکت کنارے سے الگ کر رہی تھی۔ وہ کپڑے اتار ھی رہے تھے کہ اچانک ان کے ھاتھ کمر کی پیٹیوں تک جاکر رک گئے اور ان کے سر پہاڑی کی طرف مڑ گئے۔

"ارے؟"

"وہ تو نہیں؟..." یہ الفاظ مختصر لیکن پریشان لہجے میں سنائی دئے۔

پھر بھی ان کے سر اسٹیپی کی طرف گھبراھٹ کے ساتھ مڑ گئے جہاں سے اس طرف آتے ہوئے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ پھر آواز سے ان کو پتہ چل گیا کہ اسٹیپی کی زمین خشک، سخت اور گونجدار ھے اور نہ جانے کیوں وہ اس وجہ سے خاص طور سے بےچین ہو گئے۔ کسی اندیکھی سیاہ چڑیا کی طرح ڈراؤنی رات میں خطرہ منڈلا رہا تھا۔ صرف بڈھے نے اس طرف کوئی توجہ نہیں کی اور کشتی میں کچھ کرتا رہا۔

''آہ!،، لمبے آدمی نے ناراضگی سے کراہ کر اپنی پیٹی کستے ہوئے کہا۔ ''میں نے کہا تھا کہ ہمیں ان کو چھوڑنا نہ چاہئے... اب ہم پھنس گئے... سنو، وہ سرپٹ آ رہے ہیں تاکہ ہم کہیں بھاگ نہ جائیں۔ ،،

''شاید ہمیں دریا کے پار چلا جانا چاہئے،، الکسئی نے کہا، اس کا لہجہ رنج‌آمیز تھا۔

''تم پریشان نہ ہو، کوئی بھی پریشان نہ ہو، سب ٹھیک ہے،، بڈھے نے پرسکون آواز میں کہا اور جو کچھ کر رہا تھا پھر کرنے لگا۔

اب آوازیں بہت قریب آ گئیں، بالکل پہاڑی کی کگر پر، پھر وہ مدھم ہوکر بائیں طرف مڑ گئیں، اس راستے کی طرف جو نیچے آتا تھا۔ کئی منٹ تک بالکل خاموشی رہی، پھر ٹاپوں سے ریت کی چرمراہٹ کی آواز قریب آنے لگی۔ دونوں آدمی اسی طرف آنکھیں لگائے دیکھ رہے تھے۔

''آہ!،، لمبے آدمی نے ناراضگی سے دھرایا۔ ''ہمیں ان کو چھوڑنا نہیں چاہئے تھا...،،

تاریکی سے رفتہ رفتہ ایک گھوڑے کا سیاہ خاکہ دکھائی دیا۔ داڑھی والا کزاک سرپٹ ان کی طرف آیا، اپنا گھوڑا روکا اور ان سے چلا کر کہا:

''تم لوگ سنو... فوراً اپنا بجرا دوسرے کنارے پر لے جاؤ اور لڑکے کو جنگل میں چھپا دو... وہ پاجی ہمارے دستے کے کماندار کے پاس رپورٹ کرنے گیا ہے۔ وہ اوپر پہاڑی سے تم کو گولی کا نشانہ بنانا چاہتا تھا لیکن میں نے اس کو بہت کچھ کہہ سن کر باز رکھا۔ میں نے اس سے کہا کہ ہمیں تم کو زندہ گرفتار کرنا چاہئے۔ میں زیادہ ان کی مخالفت نہیں کر سکتا تھا نہیں تو وہ مجھ پر انقلابیوں کے چھپانے کا الزام لگاتے... دیکھو صبح کو ایک پوری پلٹن یہاں آجائیگی اور تم کو جان بچانا مشکل ہوگا...،،

''اچھا، دو گھنٹوں میں اسٹیمر یہاں آ جائیگا اور صبح تک ہمارا یہاں نام و نشان بھی نہ ہوگا۔ ،،

''اہا۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے... میں نے سوچا کہ میں واپس آ کر تم کو یہ بتا دوں... اچھا، خدا حافظ!،،

”خدا تم کو خوش رکھے، کزاک، تمہارا شکریہ۔“

”اور میں بھی تمہارا شکرگذار ہوں“ اس نے ذرا اپنا گھوڑا روکا۔ ”ہم بھی یہ سب پسند نہیں کرتے۔ لیکن حالات کچھ ایسے ہیں... اور وہ تمہارا بڈھا بڑا اچھا آدمی ہے!“

گھوڑا پھر سرپٹ روانہ ہو گیا۔ کچھ دیر تک جاتے ہوئے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز اسٹیپی میں گونجتی رہی اور پھر غائب ہو گئی۔ پہاڑی کی کنگر پر ستارے خوب چمک رہے تھے، کوئی چیز ان کی آڑ میں نہیں رہی تھی۔ ستارے آسمان پر چمک رہے تھے، ستارے دریا کی تاریک گہرائیوں میں اپنا عکس ڈال رہے تھے...

۱۹۰۷ء

ریت

(۱)

وہ بہت بڈھا تھا، اس چکی گھر کا اتنا جس کی چھپر کی چھت ایک طرف جھک گئی تھی اور پرانا سیاہ پھوس ھوا میں اڑ اڑکر ادھر ادھر بکھر رھا تھا۔

یہاں نہ تو سفید جھاگ کا ریلا تھا اور نہ غراتا گرجتا پانی تیزی سے بہتا تھا، بس ایک ننھا سنا چشمہ تھا جس کا پانی زمین سے اونچی، کھمبوں پر بنی ھوئی ایک نالی میں جھلملاتا ھوا بہتا تھا اور لبلبے پرانے اور سیاہ پہئے کو آھستہ آھستہ گھماتا تھا۔ اس کے آبی ڈول جب نیچے کی طرف گھومتے ھوئے آتے تو ان میں خوابیدہ، قل قل کرتا ھوا پانی اس طرح بھر جاتا جیسے کسی پیالے میں بھرتا ھے۔ وہ اس نایاب پانی کا ایک قطرہ بھی ضایع کرنا نہیں چاھتے تھے جو اس ریت کی پہاڑی کے دامن سے ذرا ذرا رس رھا تھا جس کے زرد خطوط شمشاد اور بید کے ھرے بھرے درختوں کے درمیان دور سے چمکتے تھے۔

وہ بڈھا تھا۔ اس نے اپنے ھاتھ کی ھتھیلی سے آنکھوں پر سایا کر لیا جن کے لال لال پپوٹوں میں آنسو بھرے تھے اور خاموش، خوابیدہ اور چمکتے ھوئے چشمے کو دیکھنے لگا کہ کہیں پانی رس تو نہیں رھا ھے۔ نالی کے نیچے کی سفید ریت اور وھاں کی نازک ھری گھاس کی نئی کونپلیں بالکل صاف اور خشک تھیں اور اس پر چیونٹیاں بڑے بڑے شہتیر لئے ادھر ادھر جا رھی تھیں۔

پن چکی کے پہئے پر گرتے ہوئے پانی کی ہلکی گونج خوابیدہ خاموشی اور بید مجنوں کی شاخوں اور پتیوں میں ہو رہی تھی -

اس کی سوئی سوئی سی جھنکار دن رات شفاف ہوا میں گونجتی رہتی جو خوابیدہ مسکراہٹوں سے روشن اور معتر، خوشبودار گھاسوں اور گرم و خشک ریت کی مہک سے لبریز تھی -

سایہ‌دار جگہوں میں بھنگے اپنی لہراتی ہوئی قطاریں بنا کر بھن بھناتے اور کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا جیسے خاموشی میں بھی گونج ہے اور گرم دوپہر کے رنگ، پنکھڑیوں کی سفیدی، لہلہاتے ہوئے نیلے فارگٹ می ناٹ کے پھولوں اور ہریالی غرض سب چیزوں میں جھنکار پیدا ہو گئی ہے -

اس گونج دار خاموشی کو دور کرنے کے لئے فاختائیں بھی نہیں تھیں — ان کا کوئی چمکتا ہوا، نیلگوں جھنڈ شور مچاتا ہوا نیچے نہیں اتر رہا تھا -

بہت کم لوگ یہاں آٹا پسوانے آتے تھے - ایک گاڑی اپنی بلیاں نیلے آسمان کے اس ٹکڑے کی طرف کئے کھڑی تھی جو درخت کی چوٹیوں کے درمیان سے جھانک رہا تھا اور اس کے سایے میں ایک بھونڈا کسان لیٹا خراٹے لے رہا تھا - گاڑی سے الگ ایک گھوڑا کھڑا تھا اور ادھر ادھر ہل ہل کر اپنی نیند دور کر رہا تھا - ضدی مکھیاں برابر اس کی نیم‌وا آنکھوں کے کویوں میں اپنی سونڈیں ڈال رہی تھیں -

بڈھا آدمی لمبا تھا اور کچھ خمیدہ ہو چلا تھا - اس کے سپاٹ، چتی دار سر کے چاروں طرف بالوں کی پٹیاں تھیں اور اس کی داڑھی سفید تھی جو یا تو سفید آٹے کی کارگذاری تھی یا پھر بوڑھاپے کا اثر -

چکی گھر سے چکی کے پاٹوں کی گھڑگھڑاہٹ اور چوبی پہیوں کے دانتوں کی کڑکڑاہٹ نہیں سنائی دے رہی تھی - لیکن ایک پاٹ اپنی کبرسنی کی وجہ سے آہستہ آہستہ چرخ چوں کرتا گھوم رہا تھا اور مشکل سے دکھائی دینے والی آٹے کی ایک لکیر دھیمی دھیمی گر رہی تھی - یہ لکیر گرتے گرتے اس طرح رک جاتی جیسے کچھ سوچنے لگی ہو اور نیچے کا بکس منہہ کھولے انتظار کرتا رہتا - سفید آٹا خوابیدہ انداز میں ہلکا ہلکا بیٹھنے لگتا اور پھر وہ سفید، کانپتی ہوئی بےچاری ننھی‌سنی آٹے کی لکیر جاری ہو جاتی -

عموماً ہفتے میں ایک بورا آٹا پیسا جاتا اور شاذ و نادر ہی کوئی اس طرف آتا۔ ادھر آنے والی سڑکیں خراب تھیں۔ راستے میں درختوں کے ٹھنٹھ، جڑیں اور گرے ہوئے درخت اور ٹوٹی ہوئی شاخوں کے ڈھیر جنگل کی سڑک روکے پڑے تھے۔

بڈھا گاڑی تک گیا اور اپنی کھوپڑی جو اطراف کی تمام چیزوں کی طرح خشک اور چمک دار تھی کھجا کر کہنے لگا:

"سو رہے ہو، اچھا پھر سوؤ..."

کسان خراٹے لیٹا رہا۔ گھوڑے نے اپنے پپوٹوں کو جنبش دے کر ذرا دیر کے لئے مکھیاں ہنکا دیں، نگاہ اٹھا کر اوپر دیکھا اور اپنی نرم و تر آنکھیں جھپکا کر سوئے سوئے انداز میں جگالی کرنے لگا۔ وہ پھر اونگھنے لگا۔ اس کے منھ سے گھاس کا کوئی تنکا لٹک آتا اور وہ جھومتا رہتا۔

بڈھا آدمی ادھر ادھر ٹہلتا رہا۔

پن چکی میں کوئی کام نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے جنم جنم سے یہ پانی خودبخود بہہ رہا تھا، کائی جمے ہوئے پہئے آہستہ آہستہ خاموشی اور الکسی کے ساتھ اپنے آپ گھومتے رہے تھے، پھولوں نے اپنے رنگ اور مہک، بید کے درختوں نے اپنی ہریالی اور متحرک ریت نے اپنے زرد رنگ خود ہی اختیار کئے تھے۔ کبھی کبھی بڈھا چھینی لے کر پرانی چکی کے پاٹ پر ہلکی ضربیں لگاتا اور دندانے بنا دیتا۔

بڈھا پن چکی چھوڑنا نہیں پسند کرتا تھا اور اس کے اور وسیع دریا کے درمیان ایک گھنا جنگل حائل تھا جو جنگلی ہاپ کی بیلوں سے ڈھکا تھا۔ وہاں گرے ہوئے درختوں کی بھرمار تھی۔ یہ جنگل اندھیرا تھا اور اس سے طبیعت گھبراتی تھی۔

لیکن بابا اکثر مل کے دوسری طرف چلا جاتا جہاں جگہ کھلی اور روشن تھی اور زرد ریت تھی۔ وہ ریتیلی پہاڑی کی چوٹی پر چڑھ جاتا اور اپنا گنجا سر کھول کر دھوپ میں چپکا بیٹھا رہتا۔ نصف النہار کے مختصر سائے اس کے پیروں پر پڑتے اور اس کے سامنے حد نگاہ تک ریت ہوتی۔

ہوا کا نام نہ تھا۔ فضا خاموش اور صاف شفاف تھی پھربھی ریت سے ایک بہت ہی مدھم اور غمگین آواز آ رہی تھی۔ باریک، گرتی

ہوئی ریت پہاڑی کگاروں سے گر کر اس وقت بھی آواز پیدا کرتی تھی جب ہوا بالکل نہ چلتی ہوتی۔

بڈھا سامنے دیکھتا اور افق تک اسی طرح کا دھندلا دھندلا زرد عکس نظر آتا۔ ریگستان کے پار آبادی تھی اسی طرح جیسے سمندر کے پار ہوتی ہے۔

لیکن بابا کو وہ زمانہ یاد آ گیا جب یہاں سے چار میل کے فاصلے پر ایک فارم تھا۔ وھاں کنوئیں، باغات، جنگلات اور ان کے درمیان کھلے میدان اور روپہلی جھیلیں تھیں۔ ان کھلے میدانوں میں کسان گھاس کاٹتے تھے اور جھیلوں میں مچھلیاں پکڑتے تھے۔

دھوپ میں بیٹھے بیٹھے بڈھا سن ہو جاتا۔ گرم دھند لرزتی دکھائی دیتی اور جلتا ہوا افق کسی آسیب کی طرح چمک کر غائب ہو جاتا۔

بڈھے آدمی نے جماھی لی اور اپنے گھنی مونچھوں والے منہ پر صلیب کا نشان بنایا۔

(۲)

ایک دن پانی کی خواب اور جھنکار میں ایک تیز آواز گونج اٹھی اور سوئی سوئی خاموشی کو جھنجھوڑ دیا۔

بڈھا آدمی ہمیشہ سویرے اٹھتا تھا اور اس دن تو زرد ریت پر صبح سویرے کی ھلکی گلابی روشنی پڑنے سے پہلے ھی اٹھ چکا تھا۔ وہ مل کا چکر کاٹ کر ریت کی پہاڑی پر ذرا دیر کے لئے جا بیٹھا اور پرانے بید کے درخت کے نیچے بنے ہوئے چولھے پر اس نے اپنے لئے لپسی پکائی، پھر خاموش کھڑا پچھلی یادوں میں محو ہو گیا اور دھوپ کی کرنوں سے لطف‌اندوز ہونے لگا جو بید کی پتیوں کے اندر سے چھن چھن کر آ رہی تھیں۔

اس وقت اس نے ایک آواز سنی، ایک عورت کی مدھر آواز۔ بڈھا اپنی آنکھوں پر ھاتھ کا سایہ کرکے جنگل کی طرف مڑا۔

ایک سیاہ، بل کھاتی ہوئی سڑک، جس پر زمانہ ہوئے کیچڑ سوکھ چکی تھی، جنگل کے پار چلی گئی تھی۔ جابجا بدھیئت جڑیں ابھری ہوئی دکھائی دے رہی تھیں لیکن انسان کا وھاں کوئی نام نشان نہ تھا۔

''اب نیند کے ساتے...'' ایک پرسرت، گونجدار آواز درختوں کے پیچھے سے آئی۔

پہئے چرچرائے اور گھوڑے کے خراٹے لینے کی آواز آئی۔

جھاڑیوں میں کوئی لال لال سی چیز اور اس کے ساتھ کوئی سفید چیز متحرک نظر آئی۔ موڑ پر ایک گھوڑے کا سر جوئے میں اوپر نیچے ہوتا دکھائی دیا، پھر بلیاں اور گاڑی نظر آئی جس کے چاروں پہئے پرپیچ جڑوں میں پھنس پھنس کر ھچکولے کھا رہے تھے اور اس کے پیچھے خشک مٹی کے ڈھیلوں پر بڑی حتیاط سے قدم رکھتی ہوئی ایک لڑکی ننگے پیر آ رہی تھی، اس کے ھاتھ میں چابک تھی۔

وہ مضبوط اور چیچک رو تھی۔ اس کی آنکھیں شوخی اور ھنسی سے لبریز تھیں اور اس کا سفید رومال گردن پر آرھا تھا۔

''بابا، سلام۔''

''سلامت رھو، بیٹی۔''

''ھمارا گیہوں پیس دوگے نا؟''

''ضرور۔''

لڑکی نے بورے کے سرے پکڑے لیکن بابا نے اچانک اپنی اھمیت کو محسوس کرتے ہوئے اسے پرے ھٹا دیا۔

''کیا کر رھی ھو، تمہارے کہیں درد ورد نہ ھونے لگے۔''

لڑکی نے بورا بابا کی پیٹھ پر لاد دیا اور اس نے دوھرے ھوکر بورے کو شانوں پر رکھا اور اس بات کی احتیاط کرتے ہوئے کہ کہیں بوجھ سے اس کا پیر دھرا نہ ھو جائے تیزی سے چکی گھر کی طرف روانہ ھو گیا۔ اس کے پیچھے لڑکی کے قہقہے گونج رہے تھے:

''بابا، دیکھو کہیں ٹوٹ کر تمہارے دو ٹکڑے نہ ھو جائیں!..''

یہ قہقہے سناٹے اور سکون میں ایسے عجیب اور غیرمتوقع تھے کہ انھوں نے الکسی اور نیند بالکل دور کر دی اور بڑی دیر تک سبزہ زار، لٹکتے ہوئے چھپر، بید کے درختوں کے پار اور زرد ریت میں یہ قہقہے گونجتے رہے اور دھوپ کے تھرتھراتے ہوئے دھبے بھی، جو بالو پر بیل بوٹے بنا رہے تھے، خوش ھو کر مسکرا پڑے۔

''تم کہاں سے آئی ہو، پیاری؟'' گیہوں اونڈیل کر گاڑی کے پاس واپس آتے ہوئے بابا نے پوچھا۔

لیکن وہ گھوڑے کے منہ سے دھانہ نکالنے میں مگن تھی۔

''گھوڑے کو پانی پلانے کی جگہ کہاں ہے؟ جتنا پانی یہاں تھا سب مرغیاں پی گئیں۔''

پھر اچھوتے قہقہے نے یہاں کی عام خاموشی کو توڑ دیا۔ اس نے میلا پانی ناند سے پھینک دیا۔ گھوڑے کے مہربان اور نرم چبلاتے ہوئے ہونٹوں سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔

بڈھے کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

''ننگے پیر!''

پھر لڑکی کی مدھر اور حسین آواز بید کے درختوں میں گونجی:

''اور کیا؟ جنگل میں چلتے چلتے میرے پیر کٹ گئے۔ پچیس روبل سالانہ میں بھلا کوئی جوتے کیسے خرید سکتا ہے۔ میں شیویرینو سے آئی ہوں اور ایوان پوستنی کے یہاں کام کرتی ہوں۔''

''بڑا سخت آدمی ہے۔''

''واقعی سخت آدمی ہے۔''

''بڑا کنجوس ہے۔''

''اپنے کھیت مزدوروں کو بھوکوں مار دیتا ہے۔''

''بھوکے رہنا تو تمہارے لئے اچھا ہے'' یہ کہہ کر بڑے میاں نے اس کی مضبوط اور چوڑی چکلی پیٹھ پر خوش دلی سے ایک ہاتھ رسید کیا۔

لڑکی اچک کر اپنی گاڑی میں جا رہی اور لگام لے کر گھوڑے کو گھمانے لگی۔

''جلدی کیا ہے؟ ذرا دیر اور ٹھہرو...''

''اگر میں ٹھہری تو وہ سور مصیبت کر دینگے۔ آٹا کب تیار ہو جائے گا؟''

''ارے تم نے تو مجھے اپنی صورت بھی اچھی طرح دیکھنے کا موقع نہ دیا!.. بس تہوار سے پہلے آ جانا، آٹا تیار ملے گا۔''

لیکن اب تک گاڑی کے پہیوں کی گھڑگھڑاہٹ جنگل میں گونج رہی تھی اور درختوں کے پیچھے سے اس کی سریلی آواز آ رہی تھی:

"اے بے تکے کدھر چلا۔ پھر ٹھنٹھ پر چڑھ گیا..."

"بابا، ارے بابا! سوچئے، نالے کا چکر لگا کر کون سا راستہ ہے؟ میں کیچڑ میں پھر پھنسنا نہیں چاہتی۔"

بڈھا بڑی دیر تک بھولا بھولا سا ٹہلتا رہا۔ وہ کبھی رک جاتا اور کبھی اپنا سر کھجلانے لگتا جیسے کچھ یاد کر رہا ہو۔

"آہ؟ تمھیں یہ سب باتیں کیسی لگیں؟"

بجتا ہوا پانی، دوپہر کے جھنکتے ہوئے رنگ اور روزمرہ کی جھنکار دار خوابیدہ خاموشی اس کے چاروں طرف چھائی ہوئی تھی لیکن بابا یہ کچھ نہیں سن رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تو بس ایک ہی تصویر پھر رہی تھی۔

وہ اپنی ریت کی پہاڑی پر پہنچ گیا لیکن اب اسے ریت دیکھ کر بھی کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ وہ بالکل تھکی اور ساکت معلوم ہوتی تھی اور گرمی کی گریزپا لہریں اس پر زوروں سے پڑ رہی تھیں۔

رات کو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اسے کوئی سونے نہیں دے رہا ہے۔ بابا گھر سے نکل آیا — گھپ اندھیرا تھا، صرف نیلے نیلے جگنو ادھر ادھر چمک رہے تھے۔ جنگل میں کوئی بگلا چیخا اور ساتھ ہی کسی الو نے اپنی مدھم سسکیوں میں فریاد کی جیسے کوئی بچہ بہت غمگین ہو کر روتا ہے۔

"اونہہ؟ اچھا، میں کبھی نہیں..."

تاریکی اور ساکت خاموشی میں پانی کی جھنکار گونج رہی تھی۔ بابا کے لئے اب یہ نئے معنی رکھتی تھی جو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے اور وہ کھڑا اپنا سر کھجلا رہا تھا۔

"آہ، ذرا سوچنے والی بات ہے یہ!.."

وہ اندر جا کر پھر لیٹا اور سو گیا۔ پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کو جگا دیا۔ کسی بے چین لیکن خوشکن ہستی نے اور وہ پھر باہر نکل گیا۔

ریت پر ابھی تک اسی خاموشی اور تاریکی کا راج تھا۔ لیکن اچانک یہ تمام چیزیں بڈھے کے لئے اجنبی ہو گئی تھیں اور اب بے حس و حرکت، گرم اور خشک تاریکی ان ماضی کی تصویروں سے

نہیں بھری تھی جو کبھی دھندلی نظر آتیں اور ان کی کوئی ہئیت نہ ہوتی اور کبھی اپنی تمام تفصیلوں سمیت وہ صاف اور واضع ہو جاتیں — سوئے ہوئے فارم، فضا میں گونجتے ہوئے لڑکیوں کے زوردار گیت، نوجوانوں کی بدمستی اور جھگڑے، کمرتوڑ کام اور چھٹیاں — لیکن اب خاموشی، خلا اور اداسی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ بڈھے نے چوندھیائی ہوئی نگاھوں سے اندھیرے میں گھورا اور اسے فوراً اداس خلا اور خاموشی کا احساس ہوا۔ اسے انتظار کی کسک محسوس ہوئی، اس کی یہ تمنا تھی کہ اس کی ویران زندگی کے خلا اور خاموشی کو خوشکن آوازیں اور صاف و شفاف قہقہے بھر دیں۔

''حرص، خدا بچائے!..'' اور پھر وہ بادلناخواستہ گھر کے اندر چلا گیا اور گھاس پر لیٹا کروٹیں بدلتا رہا یہاں تک کہ پتیاں اور شاخیں اور لٹکی ہوئی چھت کا دھندلا اور غیرواضع خا کہ صبح صادق کی روشنی میں صاف نظر آنے لگا۔

(۳)

لڑکی تہوار سے پہلے آ گئی۔

دن خوب صاف تھا، دھوپ پتیوں سے چھن‌چھن کر آرھی تھی کہ پہیوں کی گھڑگھڑاھٹ اور ایک لڑکی کی صاف آواز جنگل میں گونج اٹھی۔ اس آواز نے عجیب طرح جنگل کے سناٹے کو بالکل ختم کر دیا۔ بڈھے کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔

''آ گئی... ارے، تم...''

''بابا، میں بس زندہ سلامت یہاں پہنچ گئی ورنہ یہ پاجی جانور پھر پیٹ تک دلدل میں دھنس گیا تھا...'' اور جیسے ھی وہ سڑک کی موڑ طے کرکے سامنے آئی اس کا ابلق گھوڑا خوش‌مزاجی سے اپنا سر ھلاتا اور گاڑی کے اوپر اس کا سفید رومال لہراتا دکھائی دیا۔

''کیا آٹا پس گیا؟''

''ھاں، ھاں، گاڑی سے اترو تو، گھوڑے کو پانی پلاؤ اور ذرا دیر کے لئے اندر آ جاؤ۔''

گھوڑے نے پانی پیا اور آھستہ آھستہ پانی کے صاف صاف قطرے منہ سے ٹپکاتا رہا۔ قریب کے جنگل میں ایک سنہری مینا کوئی مشکل راگ اس صفائی سے گا رھی تھی جیسے بانسری کے بول ھوں۔

''اچھا، میں اسے کھول دوں۔ یہ بھی ذرا آرام کرلے اور میں بھی تھک گئی ہوں۔ بڑی گرمی ہے۔ ''

اس نے لڑکی کے دھوپ سے خوب تپے ہوئے سوکھے گالوں اور سیاہ آنکھوں پر نظر ڈالی جو سیاہ حلقوں کی وجہ سے اور بھی بڑی معلوم ہونے لگی تھیں۔

''پیاری، بیشک تم تھکی معلوم ہوتی ہو۔ ''

''ان پر لعنت ہو۔ وہ مجھے سارے ڈال رہے ہیں۔ اب میں زیادہ دن کام نہیں کر سکتی... دن رات ایک لمحہ بھی تو آرام نہیں ملتا... کاش مجھے ٹھکانے سے کھانے ہی کو ملتا... میں ہمیشہ بھوکی رہتی ہوں... اس ہفتے ہم لوگ گھاس سکھا رہے ہیں۔ میرے ہاتھ تو بیکار ہو گئے ہیں اور پھر کھیت کے پورے جتھے کے لئے مجھے کھانا بھی پکانا پڑتا ہے۔ ''

لیکن اس کی آواز سے پہلے ہی جیسی مسرت اور زندہ دلی ٹپکتی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ کمرتوڑ، تھکا دینے والے کام کا ذکر نہیں کر رہی ہے بلکہ کسی خوشکن اور پرلطف بات کے متعلق کہہ رہی ہے۔

بڈھے نے ایک سماور نکالا جو افتاد زمانہ سے سبز پڑ چکا تھا۔ یہ سماور سال میں تین چار مرتبہ اہم موقعوں پر گرم ہوتا تھا۔

وہ دونوں پرانے بید کے درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ سماور کی نلی سے ایک پرمسرت اور خوش کن گنگناہٹ پیدا ہو رہی تھی اور دھوپ کے چکتے ہلکے لہرا رہے تھے۔ لڑکی نے چائے کا نواں پیالہ پیا اور اپنے چہرے کا پسینہ پونچھتے ہوئے پیالے کو اوندھا کر اس پر کترا ہوا شکر کا ڈلا رکھ دیا لیکن بڈھا برابر اس سے چائے پینے پر اصرار کرتا رہا اور لڑکی نے ایک پیالہ چائے اور اونڈیل لی اور پھر اس کے گرم لال بھبھوکا چہرے سے پسینہ ٹپکنے لگا۔

''اور دیکھو نا، پیاری، کہیں کہیں پن چکیوں کے بند ٹوٹ جاتے ہیں یا چکی گھر بہہ جاتے ہیں لیکن یہاں میں اسی طرح محفوظ ہوں جیسے مسیح کی گود میں۔ یہاں نالی میں پانی بہار، گرمی اور جاڑے میں خاموشی سے یکساں بہتا رہتا ہے کیونکہ یہ تو چشمے کا پانی ہے، اسے گرمی سردی سے کوئی تعلق نہیں۔ سال بھر میں تھوڑا تھوڑا کرکے کوئی سو ڈیڑھ سو دھڑے اناج میں پیس لیتا ہوں۔

حالانکہ یہ بہت کم ہے پھر بھی میں اس سے کھانے، کپڑے اور جوتے وغیرہ کے لئے کما لیتا ہوں۔ ،،

''ہاں یہ اچھی بات ہے کہ بند نہیں ٹوٹتا کیونکہ یہاں تو بند ہی نہیں ہے،، اس نے کڑکڑا کر شکر کا ٹکڑا دانت سے کاٹتے ہوئے کہا۔ ''لیکن یہاں بڑی اداسی برستی ہے۔ آدمی کا نام نشان نہیں ملتا۔ ہر طرف ریت اور جنگل ہے۔ ،،

''اداسی؟ تم اسے اداس کیوں سمجھتی ہو؟،،

بڈھے کو جوش آ گیا اور اس کی سفید بھویں پوری طرح چڑھ گئیں۔

''اگر آدمی کے پاس پیسہ ہو تو وہ اداس کیسے رہ سکتا ہے... پیسہ ہو تو اداسی نہیں رہتی، میری جان۔ پیسہ ہو تو تم ہر جگہ خوش رہ سکتی ہو، پیاری۔ لوگ برابر اناج پسوانے آتے ہی رہتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی آتا ہے۔ لوگ آ کر تمام خبریں بتاتے ہیں کہ گاؤں میں کیا ہو رہا ہے اور شہر کا حال بھی بتاتے ہیں۔ بس اس طرح بتاتے ہیں کہ تمہارے سامنے تصویر کھنچ جائے۔ ،،

''میرے چچا کی پن چکی دریا کے کنارے تھی، تو بالکل دوسری بات!..،،

''اداسی! نہیں، اداسی جب ہوتی ہے جب آدمی کا پیٹ خالی ہو، جب تم بھوکی ہو... میں تم کو دیکھتا ہوں، تم میں کچھ جان ہی نہیں ہے، پیر الگ کٹے پٹے ہیں...،،

''اور وہ بھی کیسے! خون میں تر... کھیتوں، جنگل اور کیچڑ میں ہر جگہ میں ننگے پیر جاتی ہوں۔ ،،

''جب آدمی کے پاس دام ٹکے نہیں ہوتے تو یہی حالت ہو جاتی ہے ہاں، تم فارم پر کیا کما لیتی ہو؟.. تم تمام زندگی محتاج رہوگی؟.. ہے نا؟.. تم سے کون شادی کریگا؟،،

یہ پہلا اتفاق تھا کہ کسی نے اس سے اس طرح بات کی ہو۔ صاف شفاف دن کی دلآویز نرمی، سایوں کے بنائے ہوئے بیل بوٹے جو گھاس اور ریت پر ہلکے ہلکے کانپ رہے تھے، سوچ میں ڈوبی ہوئی پانی کی مدھم آواز اور بابا کے ہمدردی کے الفاظ سب اس کی روح کی گہرائیوں میں بڑی نرمی سے اتر گئے۔

اس نے آہ بھری اور اپنا چہرہ اچھی طرح پونچھ کر پورے ارادے کے ساتھ اپنا پیالہ آخری بار اوندھا دیا۔

''بابا، شکریہ۔ ،،

اچانک وہ ٹھٹھا مار کر ہنس پڑی:

''اھا۔ بہت دنوں تک زندہ رھو، شرماؤ نہیں اور جب روٹی نہ ھو فاقہ کرو، اگر قمیص میلی ھو جائے تو الٹ کر پھر پہن لو!.. اچھا بابا، خدا حافظ، میں چلی ورنہ وہ مجھے بہت برا بھلا کہیں گے۔ میں ان سے کہوں گی کہ آٹا تیار نہ تھا اس لئے مجھے انتظار کرنا پڑا۔ ،،

جب اس نے مردوں کی طرح گھوڑے کے پٹے پر پیر رکھ کر تسمے بلیوں میں کسنا چاہے تو بابا اس کے پاس گیا اور کٹگھرے پر ھاتھ رکھ کر اس سے باتیں کرنے لگا:

''اے، میری بات سنو... تم بڑی اچھی فرماں‌بردار لڑکی ھو۔ تم مجھ سے شادی کیوں نہ کر لو؟،،

سناٹا... پانی کی آواز... دو چمک‌دار اور بڑی بڑی آنکھوں نے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ بات سوچنا،، بابا نے رک رک کر کہا۔ ''ذرا سوچو تو تم کیا ھو۔ ھاں، اور میں کتنے دن زندہ رھونگا؟ میں تمھارے برابر زندہ نہیں رہ سکتا اور میرے مرنے پر یہ سب تمھارا ھوگا۔ یہ پوری پن چکی۔ میں وصیت نامہ لکھ جاؤنگا اور پھر تم بیگم بن جاؤگی۔ زمین کی مالکن...،،

وہ اپنی گول گول آنکھوں سے بابا کو گھورتی رھی اور پھر یکایک ٹھٹھا مار کر ہنس پڑی، خوب زور سے جیسے وہ آپے سے باھر ھو گئی ھو۔

جب تک جنگل میں پہیوں کی گھڑگھڑاھٹ سنائی دیتی رھی بابا کے کانوں میں کسی کے قہقہوں کی آواز گونجتی رھی۔ پھر آواز غائب ھو گئی۔ کہیں بہت دور سے، درختوں، شاخوں اور پتیوں کے پیچھے سے ایک گیت ھوا میں لہراتا ھوا اس کی طرف آ رہا تھا۔ ایک عورت گا رھی تھی کبھی اس کی لے مدھم اور غم انگیز ھو جاتی اور کبھی پرمسرت۔ اور جب یہ گیت بھی جنگل کی گہرائیوں میں گم ھو گیا تو پھر وھی پانی کی جھنکار دار کلکلاھٹ، وھی سوئی

سوئی الکسی اور خاموشی، وھی بے آواز موسیقی سے بھرپور پھولوں اور پتیوں کے رنگ، وھی کیڑوں کے ھوا میں لہراتے ھوئے غول تھے۔ پھر ایک مرتبہ عورت کی مدھم، کمزور، تنہا اور دلکش لے ھوا پر لہراتی ھوئی آئی۔

بابا پورے دن ادھر ادھر پھرتا اور اپنا سر کھجاتا رہا۔

''آہ، ذرا سوچنے کی بات ھے...''

(۴)

ھر مرتبہ جب وہ گیہوں پیسنے کے لئے لاتی یا آٹا لینے آتی یہی بات چیت ھوتی: ''اری انیلی بیوقوف، تجھے تو اچھے دنوں کا کوئی پتہ ھی نہیں... پن چکی کوئی معمولی چیز نہیں ھے، اس سے میں ھر روز کچھ کماتا ھوں، یہ مجھ کو روٹی دیتی ھے۔ یہ سب تمہارا ھے... میں ایک دو سال سے زیادہ نہ زندہ رھونگا اور تم مالکن بنوگی۔ اگر تم نے یہ موقع ھاتھ سے جانے دیا تو تم کو افسوس ھوگا۔''

کبھی لڑکی ھنس پڑتی اور کبھی اس کو غصہ آ جاتا لیکن تھوڑے دن بعد اس نے ھنسنا بند کر دیا اور اس کی بات پر کان دھرنے لگی۔ پھر وہ وقت آیا جب اس نے کہا:

''اچھا، جو تمہاری مرضی۔ میں تم سے شادی کر لوں‌گی... شرط یہ ھے کہ شادی ھونے سے پہلے تم وصیت‌نامہ لکھ دو...''

لیکن شادی ھوتے ھی اس نے کف افسوس ملنا، دانت پیسنا اور اپنی آنکھیں نفرت سے بند کرکے کہنا شروع کیا:

''ارے تم تو بالکل سڑے پھوس ھو، تم سے تو کافور کی بو آتی ھے'' اس نے بڈھے کو ڈانٹ بتائی۔ اس کی آنکھیں غصے سے چمک رھی تھیں۔

''تو کیا ھوا؟ تم نے تو دیکھ بھال کر مجھ سے شادی کی تھی۔ ھے نا؟''

اس نے اپنے کو بالکل گھر بار کے لئے وقف کر دیا، اس کو اس بات کی بڑی خوشی تھی کہ اب وہ بھی صاحب جائداد ھے اور اپنی مرضی کے مطابق جو چاھے کر سکتی ھے۔ اس نے مرغیاں پالنا شروع کر دیں اور دو سور بھی خرید لئے۔ وہ بڈھے سے خوب

لڑی یہاں تک کہ اس نے پن‌چکی کا چھپر پھر سے چھایا - بڈھے کو مجبور ہوکر محض جھگڑا چکانے کے لئے پن چکی نئے پھوس سے چھانا پڑی - اس کی نئی سنہری چھت دھوپ میں بڑی خوبصورت معلوم ہونے لگی-

اچانک پن چکی بڑھ کر بہت پھیل گئی - اس کا پہیا بے آواز چلنے لگا - اب چکی گھر کا سیاہ خاکہ تن تنہا کھڑا نظر آتا تھا - اس نے جنگل، ریت اور اپنی گذری ہوئی زندگی سب کی سیاہی ڈھک لی تھی -

جب صبح کو اس کی آنکھ کھلتی اور جنگل سے ہزاروں چڑیوں کے چہچہانے کی آوازیں اس طرح آتیں جیسے وہ ایک دوسرے سے مقابلہ کر رہی ہوں تو پہلی چیز جو اس کو نظر آتی وہ دھوپ میں چمکتی ہوئی نئی چھت ہوتی اور جب وہ سونے لیٹتی تو آخری اور دھندلا ہوتا ہوا نقش آہستہ آہستہ گھومنے‌والے پہئے کا ہوتا جو اندھیرے میں جاکر غائب ہوتا دکھائی دیتا -

بڈھے کی زندگی بدل گئی تھی -

وہ سوئی سوئی سی خاموشی اب کسانوں کے گھر کی نئی نئی اور پرمسرت زندگی سے گونج رہی تھی - مرغیاں کڑکڑاتیں، تگڑے سور کے بچے غراتے اور نوجوان مالکن ان کسانوں پر ڈانٹ ڈپٹ کرتی نظر آتی جو اناج پسوانے آتے تھے -

وہ گھربار ٹھیک کرنے میں تن‌من سے لگ گئی، وہ ایک دن بلکہ ایک منٹ بھی ضایع کرنا نہیں چاہتی تھی - پرانے، آہستہ آہستہ گھومنے والے چکی کے پہئے کی طرح فکر اور الجھنوں سے بھرے دن یکسانیت کے ساتھ آہستہ آہستہ گذرتے رہتے -

(٥)

جنگل کا گھنا‌پن اب کم ہونے لگا - اس میں ایک افسردگی سی آ گئی - پتیوں سے خالی درخت دور ہی سے نظر آتے - ہر چیز چولا بدلتی اور مغموم نظر آنے لگی - ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے گھپ اندھیری رات میں جب بارش کی جھڑی لگی تھی تمام چمکدار رنگ اور خوش کن آوازیں سلب کر لی تھیں - اس وقت سے سرد،

ناخوشگوار خاموشی کان لگائے کھڑی تھی اور کسی کا انتظار کر رہی تھی۔

دن چھوٹے ہونے لگے۔ پن چکی کی مالکن دن بھر کھڑکی پر بیٹھی جاڑوں کے لئے موزے بنتی رہتی۔ کھڑکی سے چکی گھر کا خاکہ بڑا اداس اداس سا کھائی دیتا۔

چمکتی ہوئی سلائیوں سے لاتعداد پھندے نکلتے اور ان کے ساتھ ھی اس کے خیالات کی اڑان بھی حدوں کو پارکر جاتی اور پھر غائب ہو جاتی۔ پانی کی لگاتار کلکلاھٹ کی طرح ایک مدھم، مغموم گیت پھوٹ پڑا جو کسی ایسی بات کا اظہار کر رہا تھا جس کو الفاظ میں نہیں ادا کیا جا سکتا۔

''او، او، لڑکی، اے لڑکی،، اس کے ہونٹ چپکے چپکے گنگنانے لگے۔ ''...اور میرے پیارے کے دائیں ھاتھ پر جنم داغ تھا،، دل سے آواز نکلی۔ ''جنم داغ اور اس کے بال سن جیسے سفید تھے۔ پادری نے اس کا نام وانیوشکا رکھا...،،

''...انھوں نے اس کی شادی اس کے پیارے سے نہیں کی...،، وہ گنگناتی رہی۔ ''...اور وانیوشکا نے ھاتھ بڑھا کر اپنی ماں کی گردن میں ڈال دئے...،، اس کے ویران دل سے آواز آئی۔

''...اس کے پیارے سے نہیں بلکہ ایک بڈھے کھوسٹ سے...،،

''...اماں، ابا... اور اماں ھنستی ھیں، ابا ھنستے ھیں، ابا، گھونگھریالے بالوں‌والے ابا...،،

اس کی آنکھوں میں بڑے بڑے آنسو آ گئے۔ پھر اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں، وہ دیوار کی دوسری طرف بابا کو ایک کسان سے بحث کرتے سن رہی تھی۔

''میں تم لوگوں سے برابر کہتا رہتا ہوں کہ سنیچر کو آؤ، سنیچر کو... بھلا بتاؤ اگر پانی نہ ہو تو کیا میں اسے بنا سکتا ہوں۔ بتاؤ نا؟،،

جہاں کھڑکی سے غم اور فریاد کی آواز آ رہی تھی، ھلکے ھلکے آنسو بہہ رہے تھے وھاں ایک خوش کن خواب تھا، جوان گھونگھریالے بالوں والے شوھر کا، وانیوشکا ایسے بیٹے کا جو چھوٹے موٹے ھاتھ پھیلائے ہو، ایک ننھی منی بیٹی کا جس کی گندھی ہوئی چوٹی

میں لال فیتے پڑے ہوں اور پھر گیت شروع ہو گیا، چمکتی ہوئی پتلی سلائیوں سے پھندے تیز تیز نکلنے لگے۔

جاڑوں میں جب جنگل چاندی سے بالکل ڈھک گیا اور ریت چمکنے لگی تو بھیڑئیے آکر بھونکنے اور رونے لگے۔ برف کی ہلکی تہہ کے نیچے پانی قل قل کرتا بہہ رہا تھا۔ کبھی کبھی برف کے بڑے بڑے گالے گرنے لگتے اور طوفانی ہوا میں ناچتے جو کھڑکی کے پاس گرجتی اور چمنی سے اندر گھس آتی۔ ایسے دنوں میں وہ جلدی سو رہتے اور وہ کوئی بات نہیں سوچتے یا کسی چیز کے متعلق خیالی پلاؤ نہ پکاتے۔

لیکن بہار کے واپس ہوتے ہی پھر تمنائیں جا گیں۔ گھونگھریالے بالوں والے، پردیسی، انجانے محبوب کی تمنا، وانیوشکا اور چوٹی میں لال فیتے ڈالے ننھی منی بیٹی کی تمنا۔

(۲)

بڈھوں کی نیند چوکنی ہوتی ہے اور وہ سوتے بھی ذرا کم ہیں۔

وہ جاگ کر سننے لگا۔ اس کی بیوی آہستہ آہستہ سانس لے رہی تھی اور جنگل کی پہنائیوں کی سانس بھی نرم تھی۔ وہ باربار سویا لیکن ہر مرتبہ کوئی چپکے سے کہتا: ”بڈھے، ارے بڈھے...“ پھر وہ اٹھا اور باہر چلا گیا۔ پانی گنگنا رہا تھا، درخت خاموش کھڑے تھے اور کوئی بھدی سی چیز بڑے گیند کی طرح لنڈھک رہی تھی۔

ممکن ہے کہ وہ چپکے سے چلی جائے اور اگر وہ چلی گئی تو پھر واپس نہ آئیگی۔

وہ ہمیشہ ان کسانوں کو خوف اور شبہ کی نظر سے دیکھتا جو رات بھر ٹھہرنا چاہتے۔

”بھائی، تمھیں گھر واپس جانا چاہئے... گھر پر نیند اچھی آئیگی... دیکھو نا میرے پاس تمھارے لیٹنے کے لئے سوکھی گھاس بھی نہیں ہے۔ اور بھیڑئیے آکر تمھارے گھوڑے کو گھسیٹیں گے۔ گھوڑے کو کھڑا کرنے کے لئے چھپر بھی نہیں ہے...“

چاندنی راتوں میں تو بڈھا مشکل ہی سے سوتا - ایک مرتبہ وہ جاگا اور اس نے بیوی کی سانس چلنے کی آواز نہیں سنی - وہ گھر کے باہر نکل گیا -

صاف دھلی ہوئی چاندنی شاخوں اور نیلے آسمان سے چھن چھن کر آ رہی تھی - چاندی میں نہائے ہوئے پھولوں کے پودے پرآسیب معلوم ہوتے تھے - ہریالی نے عجیب سفید رنگ اختیار کر لیا تھا اور چکی ایک کوبڑا ٹھوس سایہ معلوم ہوتی تھی - نالی میں اگیابیتال کی چمک ہو رہی تھی اور خوب گھنے سائے میں پہیہ آہستہ آہستہ، کسی مغموم دیو کی طرح چکر کھا رہا تھا -

پانی میں ایک جھنکار تھی - رنگا رنگ، نیلگوں شفاف جھنکار - بڈھا جادو کی دنیا کا جادوگر معلوم ہوتا تھا -

"بھلا وہ کہاں جا سکتی ہے؟ ہوں؟"

ریت جو بظاہر غیر متحرک معلوم ہوتی تھی زبانوں کی طرح جنگل میں گھسی چلی گئی تھی اور درختوں کے درمیان زرد چمک رہی تھی - ریت کے اس سکون میں ایک ناقابل دفاع اور مستقل حرکت تھی جو چوکنے لیکن شرمیلے اور خاموش جنگل کے دل میں پیوست ہوتی جاتی تھی -

اس نے ہر اندھیرے کونے میں، گودام میں اور شمشاد کے درختوں کے نیچے دیکھا - ہر جگہ چاندنی اور سائے کے دھبے دست و گریباں نظر آئے، ہر جگہ سناٹے اور خاموشی کا راج تھا -

وہ اور آگے بڑھا - یہاں درخت کم گھنے تھے - اس کے پیروں کے نیچے ریت کی تہہ موٹی تھی اور اس کے سامنے پراسرار، سنسان اور دھندلا ریت کا میدان پھیلا ہوا تھا -

ریت کی پہاڑی پر چاندنی میں ایک عورت کا سایہ جھکا ہوا بیٹھا نظر آیا -

بڈھا رک گیا اور کان لگا کر سننے لگا - ہلکی سی ہلکی آواز سے گونج اٹھنے والی نیلگوں روشنی میں جو پراسرار طور پر دور ہونے کے باوجود بھی قریب تھی ایک آواز گونج رہی تھی -

"گرمیوں میں آدھی رات کو لڑکیوں نے پانی میں ہار ڈالے... چار سال پہلے میں نے بھی ایک ہار گوندھا لیکن وہ ڈوب گیا - شیویرینو میں آج میلہ ہے... آج لڑکے غول در غول آئیں گے...

لڑکیاں سورج سکھی کے بیج اور اخروٹ چبائیں‌گی... قہقہے گونجیں‌گے... وہ ایک دوسرے کا ھاتھ تھام لیں‌گے... اور شام کو تماشے میں...''

نیلگوں روشنی تھرتھرانے لگی اور افق پر دھوکا دینے‌والے سراب پیدا ور غائب ھونے لگے۔

''...بندر، عجیب مسخرہ سا، بالکل آدمی کی طرح۔ اور شام کو گاؤں میں ناچ ھوگا... میلوں سے اس کی آواز سنائی دےگی...''

خاموشی۔ اس کو پتہ نہیں چلا کہ تھوڑی دیر رھی یا زیادہ دیر۔ پھر یہ خاموشی ایک عورت کی غصہ بھری چیخ نے توڑ دی۔

''تمہارے مرنے کے بعد میں ایک دن بھی یہاں نہ ٹھہرونگی۔ میں چکی کو بیچ دونگی یا کرایہ پر اٹھا دونگی اور پھر... شو!..''

اس نے مردوں کی طرح سیٹی بجائی اور غصہ سے بھری جلتی آنکھیں بڈھے کو گھورنے لگیں۔

اس کے بالوں سے ڈھکے ھونٹ حرکت میں آئے۔ وہ کمزور اور بڈھا ھو گیا تھا۔ بڈھے نے اس کے الفاظ نہیں سنے یا سننے کی کوشش نہیں کی اور بڑبڑانے لگا۔ اس کے منہ کے چاروں طرف بال اچھل سے رہے تھے اور وہ آنکھوں میں آنسو بھرے ریت کو تک رھا تھا۔

''ھا... ں... زمانے نے سب کچھ مجھ سے چھیں لیا... میری جوانی کا زمانہ کیسا پرلطف تھا... ھمارا فارم ان ریت کی پہاڑیوں کے پیچھے تھا اور فارم کے پیچھے باغ اور باغ کے پیچھے کھیت تھے... مجھے یاد ھے کہ ھم باغ کے پاس جمع ھوتے تھے وادکا پیتے تھے اور بسکٹ کھاتے تھے اور لڑکیوں کو جمع کرکے ناچتے تھے۔ میرے باپ کے پاس بڑے منہ‌زور گھوڑے تھے۔ ھم ان کو جوت کر لڑکیوں کو فارم کے چاروں طرف گھماتے تھے۔ اور ان پہاڑیوں کے پیچھے ایک جھیل تھی، جنگل میں ایک بڑی سی جھیل، صاف اور چمکدار... خزاں میں ھم برچھے سے مچھلیوں کا شکار کرنے جاتے تھے...''

بڑی دیر تک وہ اپنے گول، بال دار منہ میں کچھ بڑبڑاتا رھا۔

''ھم بڑے مزے میں رھتے تھے۔ تین سو بھیڑیں اور گائیں تھیں۔ عورتیں اپنے چندن ھاروں میں چاندی کے روبل پہنتی تھیں۔''

وہ اپنے بالدار منہ سے بڑبڑاتا ھی گیا۔

نیلگوں روشنی جھلملاتی رہی، سراب آتے جاتے رہے، بھیڑیں ادھر ادھر دوڑتی رہیں، جنگل کی جھیلیں جھلملاتی رہیں اور عورتوں کے چندن ہاروں کے روبل جھنکتے رہے۔ وہاں چھوٹے چھوٹے سفید مکانات تھے دھندلے، بھورے آسمان کے پس منظر میں ان کی چھتیں نظر میں گھوم گئیں...

نہیں، وہ تو صرف ریت کے ٹیلے تھے جو چاندنی میں سفید سفید چمک رہے تھے۔

شمشاد کے درختوں کا جھنڈ سیاہ ڈھیر سا معلوم ہو رہا تھا جس کی نوکیں اوپر اٹھی ہوئی تھیں اور اس میں کوئی حرکت نہ تھی۔

نہیں، وہاں تو صرف پتلے اور لمبے ریت کے تودوں کے سائے تھے، لمبے اور بےجان سائے۔

عورت نے اپنا سر ہاتھوں پر ٹکا دیا، کہنیاں گھٹنوں پر رکھ لیں اور گردن بڑھا کر دیکھنے لگی۔ وہ افق کے پار دیکھ رہی تھی اور سراب منڈلا رہے تھے۔ اس نے شیویرینو کا میلہ اور وہاں کے ہنسی ٹھٹھے اور ٹھٹھول دیکھے۔ وہ گرما گرم پیار... مضبوط، کھردرے اور سینے سے لگانےوالے بازو... ایک گھونگھریالے بالوں والا سر...

اس کی اجنبی اور ناآشنا آواز بڈھے کے قریب آ گئی:

''قبرستان کی طرح... کیا اچھی جگہ ہے!.. بالکل سفید!..''

(۷)

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ سب ہوئے بہت دن نہیں گذرے ہیں۔ ابھی چند ہی دن ہوئے جنگل میں پہیوں کی چرچراہٹ گونجی تھی اور ایک عورت کی آواز درختوں کے اندر لہراتی ہوئی آئی تھی، چند ہی روز کی بات ہے...

''اسے کاٹ دینا چاہئے'' کبھی کبھی بڈھا کسی سوکھے درخت کو لات مارتے ہوئے کہتا۔

وہ اس کی طرف پھٹی پھٹی خوف زدہ آنکھوں سے دیکھتی۔ نیلے آسمان کے پس منظر میں پتیوں سے خالی درختوں کی شاخیں ویرانی کی ایک خشک اور بھوری تصویر پیش کرتیں اور ٹوٹی پھوٹی ننگی جڑیں رینگتی ہوئی ریت سے جھانکتیں۔

جب اس نے بڈھے سے شادی کی تھی اس وقت وہ یہاں اکثر نرم، ریشمی اور ہری گھاس پر گھنے سائے میں بیٹھتی تھی۔ اس کے اوپر ہری ہری پتیاں اور شاخیں سرگوشیاں کرتی تھیں۔ اسے تیزی سے گزرتے ہوئے وقت کے احساس نے ڈرا دیا۔

تب سے جنگل کے بہت سے درخت کٹ چکے تھے اور جنگل دن بدن چھدرا ہوتا جاتا تھا۔ غیر محسوس طریقے پر ریت برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی ان دیکھی زبانیں اور کروٹیں بڑے بھولپن سے جھاڑیوں، جڑوں، پھولوں اور گھاس کے درمیان بڑھتی جا رہی تھیں اور قبل اس کے کہ آدمی مڑ کر دیکھ سکے جڑیں سوکھ جاتیں، پھول مرجھا جاتے اور گھاس غائب ہو جاتی۔ چڑیاں سب کی سب اڑ چکی تھیں اور ننگے درخت بڑی اداسی کے عالم میں تن تنہا کھڑے تھے۔

پھر یہ سب بھول گیا اور وہ پھر ہرے بھرے درختوں کے سائے میں پہنچ گئے۔ وہ ہری گھاس پر لیٹے تھے اور اوپر شاخوں اور ٹہنیوں پر چنچل چڑیاں چہچہا اور پھدک رہی تھیں — اور اسی طرح سال پر سال گزرتے گئے۔

کبھی کبھی تو پن چکی کی مالکن کو یہ محسوس ہوتا کہ بابا دوسرے ہی دن ایک ہفتے میں یا زیادہ سے زیادہ ایک مہینے میں ختم ہو جائیگا۔ وہ غور سے اس کی سانس کی آواز سنتی، اس کی برابر سست ہوتی ہوئی جنبشوں اور کانپتے ہوئے سر اور ہاتھوں کو دیکھتی۔

چھت کا رنگ سیاہ ہونے لگا، پھوس ادھر ادھر پھیلنے اور لٹکنے لگا۔ صرف پانی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی وہ اسی سکون کے ساتھ جھنکارتا، سوچ میں ڈوبا اور خوابیدہ آہستہ آہستہ بہتا رہا۔

کسان کے گھر کی وہ تمام آوازیں جو کسی زمانے میں بڑے خوشکن انداز میں اس منظر پر اچانک چھا گئی تھیں — وہ مرغیوں کا کڑکڑانا، بطخوں کی کڑاؤ کڑاؤں، سوروں کا غرانا اور نوجوان مالکن کی گونج دار رسیلی آواز — سب رفتہ رفتہ مدھم پڑ گئیں، سب اسی اداس، خوابیدہ اور ابدی جھنکار میں کھو گئیں۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آدمی، جانور، فکر اور پریشانیاں کچھ بھی نہیں رہ گیا ہے۔ صرف وہ سیاہ اجڑے پجڑے چھپروالا چکی گھر ٹکٹکی باندھے کھڑا تھا، پہیہ آہستہ آہستہ گھوم رہا تھا اور پانی سکون کے ساتھ کلکلا رہا تھا۔

(۸)

دھوپ غائب ہو گئی۔ اداس اور بےرنگ دن آئے اور انھوں نے یہ یاد دلایا کہ وقت بیکار ضایع ہو رہا ہے اور پھر واپس نہیں آ سکتا۔

سب کچھ غائب ہو گیا تھا، سرحدوں کے خطوط تک نظر نہیں آتے تھے۔ بس ریت کے بونڈلے آسمان تک پہنچ رہے تھے۔ یہ بونڈلے پریشانی کے عالم میں ٹیڑھے میڑھے جھکے ستونوں کی شکل میں چلتے اور ہوا، سورج اور نیلگوں افق تک کو چھپا لیتے۔

اس وقت ایسا محسوس ہوتا جیسے اب مسرت کے دن کبھی نہ آئیں گے۔ نوجوانوں کی آوازیں اور زوردار قہقہے کبھی نہیں گونجیں گے۔ اس تذبذب اور انتشار میں سخت‌دل شکستگی تھی۔

رنج و غم چپکے چپکے بڑھتا چلا آ رہا تھا۔

پن چکی، لوگ، بید کے درخت اور فارم سب کچھ بہت چھوٹے اور غیراہم معلوم ہوتے تھے۔

ایسے دنوں میں سالکن غصے سے چیختی، اس کے دل میں تمنائیں مچلتیں:

"تم کسی کام کے ہو؟.. تم کو لے کر کیا کروں؟ کبھی تم سے کچھ ہو سکتا ہے؟ میں چاہے تمہارے ساتھ سو سال سوؤں کوئی نتیجہ نہیں ہوگا... تم میرے لئے کوئی جوان لاؤ تاکہ میرے بچے ہوں... سمجھے نا بوڑھے کھوسٹ..."

وہ اپنی جھینپ اور پریشانی میں اس کو آنکھ مار کر اور مسکرا کر ٹال جاتا۔

"گھبراؤ نہیں... تم... میرا مطلب... تھوڑا اور دیکھ لو... شاید کچھ ہو ہی جائے۔"

وہ اپنی بھویں تان کر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اسے سہلاتا

لیکن اس کو صرف سڑی ہوئی، قبر میں پیر لٹکائے ہوئے بوڑھے کی بو آتی۔

''اونہہ، بڈھے سور، تم پر لعنت ہو، بڈھے سڑے سانپ، آخر تم کب مروگے... اب تک تو تمھیں مر جانا چاہئے...''

اور وہ بےبس ہوکر تڑپتی اور سسکیاں لیتی۔

بڈھے کی پریشانی قابل رحم ہوتی، وہ اپنے پیر پٹکتا اور پھر پیشانی پر بل ڈال کر لڑکھڑاتی آواز میں کہتا:

''میں نے ہمیشہ تمہارا بڑا خیال کیا اور تم کیا کر رہی ہو؟ تم کیا تھیں؟ بولو نا؟ میری زندگی کے اب کتنے دن رہ گئے ہیں؟ سب کچھ تمہارا ہے... ابھی میں وصیت نامہ پھاڑ ڈالوں تو بھلا تم کہاں کی رہوگی... بھوکوں مر جاؤگی!..''

''مرنے دو مجھے... مجھے تمہاری چکی نہ چاہئے۔ میں چلی جاؤں گی!..''

اور سسکیاں زیادہ گہری لیکن دبی دبی سی ہوتیں۔

دوسرے دن صبح کو ریت پر سورج پھر چمکتا، ریت اب بیٹھ چکی ہوتی اور سورج اپنی لمبی سنہری کرنیں اس پر ڈالتا۔ پھر بطخیں ہلکے سے کڑاؤں کڑاؤں کرتیں، سیاہ پہیہ اداسی کے ساتھ گھومتا اور چکی ہمیشہ کی طرح ٹکٹکی لگائے گھورتی رہتی۔

(۹)

جنگل میں نوجوان، صحت مند آوازیں، قہقہے اور مذاق اب گذری ہوئی یادیں تھیں۔

سڑک کی موڑ سے ایک گاڑی آتی اور پھر دوسری اور اس کے ساتھ کوئی نوجوان مرد و عورت چلتے ہوتے۔ وہ ہنستے، آپس میں دھکم دھکا کرتے اور ان کے چہرے خوشی سے دمک اٹھتے۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے وہاں کوئی سیاہ پن چکی، سوکھا جنگل، بڈھے شوہر، کوئی رنج یا بےسود انتظار کی کیفیت نہ تھی۔ ان کی ہر جنبش، ہر لفظ اور فضا میں گونجتے ہوئے متواتر قہقہوں سے جو بلاوجہ ابلے پڑتے تھے، جوانی کا، خواہ مخواہ کی خوشی کے سیلاب کا اظہار ہوتا تھا۔

مالکن ان لوگوں کو تیوری چڑھا کر ناپسندیدگی سے دیکھتی۔

"بس بہت ہو چکیں اٹکھیلیاں!"

"تجھ سے کیا مطلب، بڑھیا کہیں کی! جلتی ہے؟"

اس کا چہرہ ایسا سرخ ہو گیا جیسے کسی نے چابک جما دی ہو اور اس کی غصہ‌بھری زور زور کی چیخوں اور گالیوں سے پورا جنگل گونج اٹھا:

"نکمے بندر کہیں کے۔ یہاں مسخرہ‌پن کر رہے ہو۔ ہی ہی۔ ہا ہا۔ تم کو یہاں کام کے لئے بھیجا گیا ہے اور تم یہاں عشق لڑا رہے ہو... تمھیں اس کے لئے کوئی اور جگہ نہیں ملتی... میں تمہارا آٹا نہیں پیسنے دونگی اور جب خالی ہاتھ تم اپنے مالک کے پاس واپس جاؤ گے تو پتہ چلے گا..."

بہرحال اس کی چیخ پکار اور گالیاں اس اداسی اور خوف کو نہ کم کر سکیں جو اس کی نا کام تمناؤں سے پیدا ہوتی تھیں۔

"بڑھیا... بڑھیا... بڑھیا..."

اس دن ہر ہر چیز اس کے ہاتھوں سے گرتی رہی اور بڈھا تو اس کی لعن طعن کی وجہ سے اپنی جگہ پر بت بن کر رہ گیا۔

بڑھیا!

ہاں۔ وہ بڑھیا تھی۔

اس نے خود اپنی بھرائی ہوئی آواز سنی۔ اس نے اپنا بھاری جسم خود محسوس کیا۔ چھوٹے آئینے نے بھی اس سے یہی کہانی دہرائی۔

رفتہ رفتہ، روز بروز، جھری پر جھری، ایک سفید بال کے بعد دوسرا سفید بال... بڑھاپا آ گیا شباب نہ تھا، خوشی نہ تھی، پیار نہ تھا اور بچے کی کلکاریاں نہ تھیں...

"آہ... آہ... آہ!.."

وہ چیختی چلاتی، برتن توڑ دیتی اور پتیلیاں بڈھے پر کھینچ مارتی۔ پھر وہ خاموش ہو گئی اور بڈھے کو پلک جھپکائے بغیر ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتی۔

"کیا تو پاگل ہو گئی ہے؟"

بلا پلک جھپکائے اور ذرا سا ہلے بغیر وہ بڈھے کو گھورتی رہی۔ وہ ادھر ادھر چلتا رہا۔ نیک بڈھا جس کا سر ہلتا تھا۔ وہ

اس طرح چلتا جیسے اب مرا اور تب مرا۔ لیکن وہ ہمیشہ سے ہی ایسا تھا۔ جب سے وہ اس کو جانتی تھی ایسا ہی تھا۔

پہلے تو یہ بات بہت ہی مشکل اور ڈراؤنی معلوم ہوئی۔ اس کے ہاتھ کانپے، سفوف گر کر بکھر گیا اور کوئی نتیجہ نہیں ہوا۔

جب بڈھے نے اس کو پہلی مرتبہ پیا اور اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تو اس کا دل چاہا کہ وہ بڈھے کے پاس دوڑ کر جائے اور ایسی زبان میں جو بےالفاظ ہو اس سے چپکے سے کہے: ''تھوک دو، اس کو تھوک دو''۔ خوف سے اس کی آنکھیں نکلی پڑ رہی تھیں۔

پھر وہ اس کی عادی ہو گئی اور روزانہ اس کو سفوف دینے لگی تاکہ بڈھے کا سفر آخرت آسان ہو جائے۔

بڈھا بیمار ہو گیا، وہ مشکل سے چل پھر سکتا۔ وہ پرانے درخت کی طرح کراھتا۔ اسی طرح وقت گذرتا گیا۔

ایک دن وہ اچانک رخصت ہو گیا۔

(۱۰)

جب شام کو شفق کے عکس سے ریت گلابی ہو چلی تو مالکن نے اپنے شوہر کو رات کے کھانے کے لئے بلایا:

''اے، بڑے میاں، آ جاؤ۔''

اس کی آواز گہری اور پرسکون خاموشی میں ڈوب گئی۔ سرخ چوٹیوں والے درختوں کے جنگل میں حسب معمول اس کی گونج بھی نہیں ہوئی۔

''اے، بڑے میاں...''

پانی حسب معمول جھنکار کے ساتھ بہتا رہا۔

مالکن نے باڑوں اور گھر میں ڈھونڈھا، ایک مرغی اور اس کے چوزوں کو باہر نکالا اور دروازہ بند کیا تاکہ سور اندر نہ آ جائیں اور ریت کی پہاڑی کی طرف روانہ ہو گئی۔ بڈھا وہاں اوندھا پڑا تھا، اس کی سفید داڑھی نرم، سنہری ریت سے ڈھکی ہوئی تھی اور اس کی سوکھی سہمی، بوڑھی انگلیوں اور مٹھی میں ریت تھی۔

وہ داڑھیں مار کر چلانے لگی، اس کے رونے پیٹنے کی چیخیں بڈھے کی لاش پر گونجیں لیکن چند قدم کے بعد بھاری، بے حس و حرکت اور بےجان ریت پر خاموشی کی حکمرانی تھی۔

''ارے، تم مجھے تنہا چھوڑ گئے؟ اب میرا کون رہا؟ اب میری دیکھ بھال کون کریگا؟''

اور عورت بڈھے کی لاش پر گر پڑی۔ اس کی سفید چوٹی کے بال پریشان تھے۔ اس کا لٹا بھدا، جھری دار اور آنسوؤں سے بھرا چہرہ آگے کی طرف جھکا تھا۔ بےجان بڈھے کی داڑھی گردن کے نیچے سے آگے نکلی ہوئی تھی اور اس کا گنجا سر ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ عورت کو اس آدمی کے مرنے کا رنج تھا، وہ اس کے ساتھ اتنے دن سے رہنے کی عادی ہو چکی تھی اور اس کی جدائی سے بےقرار تھی۔

(۱۱)

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی تبدیلی ھی نہیں ہوئی ہے۔ سیاہ، بھیگا پہیہ اسی طرح آہستہ آہستہ سویا سویا سا گھوم رہا تھا جیسے بس اس کو اپنے کام سے کام ہو۔ پانی کی پتلی دھار جھنکار کے ساتھ اس پر گرتی اور چکی اپنے نچے کھچے کالے پھوس کی وجہ سے اور بھی بے جان اور اداس معلوم ہونے لگتی۔

جب ایک سال بعد بڑھیا گرجا گھر سے برسی کے رسوم کے بعد گھر لوٹی تو وہ مل کی دیوار کے پاس ریت پر بیٹھ کر خوب روئی۔ وہ اپنے گزرے ہوئے شوہر کے لئے نہیں رو رہی تھی بلکہ اس کو اچانک اپنی پچھلی زندگی کا خیال آ گیا تھا، کیسی تیزی سے بیت گئی تھی وہ اور کتنی بےکیف تھی۔ جلد ھی اس کا آخری وقت بھی آن پہنچےگا اور وہ دنیا کی خوشیوں سے لطف اندوز ہوئے بغیر ھی مر جائیگی۔ رفتہ رفتہ وہ بڈھے کی عادی ہو چکی تھی اور اب سوکھے درختوں کا یہ چھدرا جنگل اسے سونا معلوم ہوتا تھا۔

چکی اس کو اب بھی ٹکٹکی باندھے اندھادھند دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی جان لیوا نگاھیں کبھی اس پر سے نہیں ہٹاتی تھی۔ بہرحال اسے زندگی تو گزارنی ھی تھی۔ وہ صبح اٹھ کر گھر کا کام کاج کرتی، مرغیوں کو چارا پانی دیتی، چکی میں اناج ڈالتی اور کسانوں سے طے توڑ کرتی۔

اس نے چکی کرایہ پر اٹھانا چاھا لیکن کوئی بھی ایسی بھولی بسری جگہ آنے کے لئے تیار نہ ہوا اور اب خود اس کو شیویدرینو اور

اس کے میلے یا اس کے ڈیروں میں کھیل تماشوں سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ اب وہاں کی ناچنے والی لڑکیوں کو وہ جانتی بھی نہ تھی کیونکہ جب اس کا لڑکپن تھا اس وقت یہ لڑکیاں پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں۔

اس نے ایک مزدور رکھ لیا۔

وہ اس کے یہاں آ گیا۔ سوکھا سہما، پھٹے پرانے کپڑے پہنے، بڑا دبادبا سا معلوم ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ گھڑگھڑاتی ہوئی چکی کے اوپروالے حصے میں چکی گھر ہی میں سوتا اور جب خزاں کا موسم آتا تو وہ بنگلے کے باہری کمرے میں آ جاتا جو زیادہ گرم تھا۔ مالکن اس کو قابو میں رکھتی اور وہ دن رات اداس اور خاموش کام کرتا رہتا۔ کبھی اپنی آنکھیں اوپر نہ اٹھاتا۔

ایک دن اس نے اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں اور اس سے کہا:

"مالکن، میرا حساب کر دو۔"

"کیوں؟"

"میں جا رہا ہوں۔"

"تم کہاں جاؤگے؟"

"جاکر کام ڈھونڈھونگا، ممکن ہے شہر میں... ممکن ہے کما کر اپنے گاؤں لوٹ جاؤں۔" اس نے اس کی طرف سے منہ موڑ کر اس کھانچے دار سڑک کی طرف دیکھا جو جنگل میں جاکر غائب ہو جاتی تھی۔

"وانیوشا" اس نے بات شروع کی، اس کے لہجے میں ایک نئی نرمی تھی — ابھی تک وہ اس کو گنوارپن سے "وانکا" پکارتی تھی — "وانیوشا، کہاں جاؤگے؟ کیا میرا گھر اتنا برا ہے؟"

"برا تو نہیں ہے لیکن میں جا رہا ہوں۔"

"اگر تم ٹھہر جاؤ تو میں تمہاری اجرت بڑھا دونگی۔"

"میں اکتا گیا ہوں۔"

اس رات وہ اس کے پاس گئی لیکن اس نے اس کو خوب موٹی گالیاں دےکر بھگا دیا۔

"بڑھیا کھوسٹ کہیں کی... لعنت ہو، نکل یہاں سے..."

وہ اس کو اچھا کھلاتی، اچھا پہناتی اور اس کا خیال رکھتی۔ ہمیشہ اس کے لئے وادکا موجود رہتی۔ پہلے اس نے بڑھیا کو پریشان

کیا پھر ٹھکانے سے اس کے پاس رہنے لگا لیکن بڑھیا نے وعدے کے مطابق اس کو چکی فروخت کرنے کا اختیار نہیں دیا بلکہ صرف اس کے حق میں وصیت نامہ لکھ دیا۔

وہ فوراً اپنے کو مل کا مالک محسوس کرنے لگا اور پرانا سیاہ پہیا بھی زیادہ چمکدار ہو گیا۔ نئے نئے رندہ کئے ہوئے تختوں کے ٹکڑے لگا کر اس کی مرمت کر دی گئی۔ چھت بھی پھر خوبصورت معلوم ہونے لگی۔ اس پر برابر کٹی ہوئی، تازہ اور سنہری گھاس چھا دی گئی۔

(۱۲)

بید کے درختوں کے جھنڈ کے پیچھے جھاڑیوں سے بدمست آدمیوں کی چیخوں اور قہقہوں کی گونج اور زور دار گیتوں کی آواز آ رہی تھی۔

''ارے... گاؤ نا... اسے جلا دو... اسے پکڑو...''

لوہے کی کیلیں اور نالیں لگے ہوئے لمبے بوٹوں کی بھاری چاپ، عورتوں کی چیخیں اور ٹھٹھے غرض بدمستی کی یہ ساری چہل پہل اس اداس، جھلملاتی دھوپ میں جو گھاس پر لہرا رہی تھی اور مشکل سے ہلتی ہوئی درختوں کی چوٹیوں کی ہلکی ہلکی سرسراہٹ میں عجیب معلوم ہو رہی تھی۔

جب بدمستوں کا یہ ہنگامہ ذرا دیر کے لئے رک جاتا تو پانی کی جھنکار دار آواز پھر سنائی دینے لگتی۔ چکی اداسی سے ٹکٹکی لگائے گھورتی رہتی، اس کی یہ ٹکٹکی کبھی نہ ہٹتی اور پہیہ آہستہ آہستہ گھومتا رہتا۔

پھر غل غپاڑے، قہقہوں، ہنسی مذاق اور گالی گلوچ، رقت بھرے گانوں اور قدموں کی بھاری اور غیر مربوط دھپ دھپ جنگل کے خوابیدہ سکون پر اس طرح مسلط ہو جاتی جیسے بدمستی میں پھوہڑپن سے اس کی توہین کر رہی ہو۔ اس میں ساری خاموشی اور موسیقی سے بھرپور رنگ ڈوب جاتے۔

اس کی شفاف چمکدار آنکھیں سکڑ کر پتلی لکیریں رہ گئی تھیں، اس کا چہرہ پسینے سے شرابور اور شراب کی کثرت سے بگڑ گیا تھا، پتلی کھچڑی چوٹی سر کے رومال کے باہر لٹک رہی تھی۔

اس طرح سالکن ایک میزپوش کے قریب بیٹھی تھی جو بید کے درختوں کے نیچے بچھا تھا اور اس پر ٹھنڈا ناشتہ رکھا تھا۔ اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ میں وادکا کا ایک گلاس تھا اور وہ اپنی تیز آواز میں جو سور کی چیخ کی طرح تھی گا رہی تھی:

اچھا تو ہم پئیں
اور ہم ناچیں

''اور ہم ناچیں...'' اس کے پڑوسی نے سردہ آواز میں دھرایا جیسے اس کی آواز قبر سے آ رہی ہو۔ اس نے بڑی اداسی سے اپنا پسینے سے شرابور، پریشان بال اور بدمست سر ہلا کر گیت جاری رکھا:

اور موت آئیگی
مر جائیں گے ہم...

اس بدمست گیت میں اس کا ساتھ ایوان نے دیا جو ناچنے میں اپنے بے قابو پیروں پر کنٹرول حاصل کرنا چاھتا تھا لیکن پیر سالک کا حکم نہیں مان رہے تھے وہ غصے میں پیر پٹک رہا تھا۔

''اس نے اس حد تک مجھے پریشان کیا... اس حد تک پریشان کیا...'' ایک نوجوان، گلابی گالوں والی عورت اپنا سر ہلا ہلا کر بڑبڑا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں معصومیت کے ساتھ دیہاتیوں کی چالاکی تھی۔ ''جہاں تک میرا سوال ہے میں اتراتی نہیں ہوں... میں شہر کی عورتوں کی طرح نہیں ہوں۔ کریم پاؤڈر تھوپے۔ اوپر سے بڑے ٹھاٹھ باٹھ لیکن اندر دیکھو تو بس کھوکھلی...''

''...ھاں، مر جائینگے ہم...'' پڑوسی نے تان لگائی۔

''مر... جا... ئیں... گے...'' جنگل نے دھرایا۔

''مر... جا... ئیں... گے...'' ایوان نے غمگین ہوکر کہا۔

''کھاؤ۔ کھاؤ۔ لوگو۔ مزے اڑاؤ!.. تمھارے کھانے سے ہمیں بڑی خوشی ہوگی۔ ھمارے پاس سب کچھ افراط سے ھے، زندگی بھر کے لئے کافی اور چکی دن رات چلتی رہتی ھے!.. ھمارے پاس بڑی افراط ھے۔ ھے نا، وانیوشا پیارے؟''

"افراط سے بھی زیادہ... اور ہم مر جا... ئیں... گے..."
اس نے غمگین ہوکر اپنا منھہ بسورا۔ اس کو اپنی زبان پر قابو رکھنے میں بڑی مشکل ہو رہی تھی۔ "بوڑھیا پیاری، جب تم مر جاؤگی تو میرا پہلا کام یہ ہوگا کہ میں ایک بہت خوبصورت جوتا خریدونگا... ارے۔ میں کون ہوں؟.. میرے لئے یہی ٹھیک ہوگا.. میں ایک مزدور رکھ لونگا... میں ما... لک ہوں یعنی وہ..."

جب اترتے ہوئے خمار کے دھند میں جنگل، چکی اور روزمرہ کا کام پھر سامنے آیا تو مالکن نے چاروں طرف گھور کر شبہ سے دیکھا۔

"اچھا تو تم اس آوارہ عورت کے لئے پریشان ہو۔ ہے نا؟ تم خیال کرتے ہو کہ جو کچھ ہو رہا ہے میں اسے دیکھتی نہیں ہوں؟ میں سب کچھ دیکھتی ہوں۔ لعنت ہو تم پر..."

"تمھیں کیا ہوگیا ہے، کہیں پاگل تو نہیں ہو گئیں؟"

"میں دیکھتی ہوں کیا ہو رہا ہے..."

"تھو!.. ہم جنگل میں بھیڑیوں کی طرح رہتے ہیں جہاں کسی آدمی کی آواز بھی نہیں سنائی دیتی..."

"آواز نہیں سنائی دیتی؟ تو پھر تم ادھر ادھر کیوں جھانکتے پھرتے ہو؟.."

"جہنم میں جاؤ تم، لعنت ہو تم پر!.. اب بڑھاپے میں یہ سب دیکھنا شروع کیا... مجھے کاہے کو ستاتی ہو..."

ان دونوں کے درمیان کچھ ایسا جذبہ پیدا ہو گیا جو پہلے نہ تھا اور یہ جذبہ پختہ ہوتا گیا۔ درختوں کے پیچھے اور چکی گھر کے اندر کوئی مشتبہ اور دھوکا دینے والی چیز چھپی تھی۔ وہ گھر میں، جنگل کے کھلے میدان میں، ان کی آوازوں میں اور معمولی الفاظ اور جملوں میں محسوس ہوتی تھی۔

"اپنا ٹکڑا مجھے دے دو" مالکن نے کھانے پر کہا۔

"میں نے تمھارے لئے ایک ٹکڑا کاٹ دیا ہے"۔

"تو کیا ہوا؟ تم میرا ٹکڑا لے لو۔"

اگر جوان کو چکی پر کام میں یا ان کسانوں سے طے توڑ کرنے میں دیر ہو جاتی جو آٹا پسوانے آتے تھے تو جب تک وہ نہ آ جاتا بڑھیا کھانا نہ کھاتی۔

''وانیوشا، آؤ کھانا کھا لو، نہیں تو ٹھنڈا ہو جائیگا۔''
''ایک منٹ میں۔ تم کھاؤ۔''
''میری فکر نہ کرو، تم کھاؤ...''

وہ ایک دوسرے کو گالیاں دیتے اور بڑھیا کی کرخت، تیز چیخیں جس میں مزدور کی گالیاں بھی ملی جلی ہوتیں جنگل میں گونج جاتیں۔

رات کو بابا اس کے پاس آتا۔ وہ چپکے چپکے ان‌دیکھا اس کے پاس آ کر کھڑا ہو جاتا۔ اس کی سفید داڑھی اور پرسکون چہرہ نظر آتا۔ کبھی کبھی وہ منھہ کے بل پڑا نظر آتا، اس کی داڑھی سنہری ریت میں دھنسی ہوتی اور اس کی مٹھی میں ریت ہوتی۔

بابا سے اس کو ڈر نہیں لگتا تھا کیونکہ اس کے چہرے یا شکل سے ملامت کے آثار نہیں ظاہر ہوتے تھے۔ بڑھیا کا ضمیر مدت ہوئے سو چکا تھا۔ بابا نے اسے نہیں جھنجھوڑا۔

بہرحال بابا کے پرسکون، غیرمشکوک اور مطمئن چہرے سے اس نے یہ بات ٹپکتی دیکھی:

''تمہارا بھی میرا جیسا حال ہو گیا!''

وہ سوتے میں کراھی اور دانت پیسے، پھر جاگ پڑی۔ وہ ٹھنڈے پسینے میں شرابور تھی۔ وہ نفرت سے گھورنے لگی، اس نے مزدور کے جوان، مضبوط اور صحت‌مند چہرے کو گھورا جو پڑا خراٹے لے رہا تھا، اس کا منہ کھلا تھا اور مضبوط بازو پیچھے کی طرف پھیلے ہوئے تھے۔

وہ بہت آہستہ بلی کی طرح اٹھی، اس کی آنکھیں بھی بلی کی طرح سبز سبز چمک رہی تھیں اور بالکل بلی کی طرح دبے پیر کونے میں جاکر کچھ ٹٹولنے لگی لیکن اس کی نگاہیں ایک لمحے کے لئے بھی سوتے آدمی کی طرف سے نہ ہٹیں۔ وہ کانپ اٹھی۔ اسے بڑا کرب محسوس ہو رہا تھا، اس نے چمکتا ہوا کلہاڑا لے کر اس کی تیز دھار کی ایک کاری ضرب اسی کھلے منہ پر لگانی چاھی۔

وہ جاگ پڑا اور اس نے حیرت سے اس کی آنکھوں کو دیکھا جو عجیب انداز میں اس کو گھور رہی تھیں۔

''تو مجھے کیا گھور رہی ہے؟ میں سونے کا نہیں بن گیا ہوں۔ ہے نا؟''

''میں تیرا گلا دبا دونگی... میں تیری انتڑیاں نکال لونگی... میں جانتی ہوں کہ تو کیا سوچتا ہے۔ میں بہت دنوں سے یہ دیکھتی ہوں...''

ان کا پورا دن توتو میں میں، گالی گلوچ، دھمکیوں اور طعنے تشنوں میں گذرتا۔ وہ اسے خوب پیٹتا، اس میں اسے وحشیانہ لطف آتا جو عموماً مردوں کو عورتوں کے پیٹنے میں آتا ہے۔

خوب مار کھا کر اس کی صورت بگڑ جاتی اور وہ ہفتوں بستر پر پڑی رہتی لیکن جیسے ہی اٹھتی، جیسے ہی اس کے سوجے ہونٹ ہل سکتے ویسے ہی وہ اس پر پھر بڑبڑانے لگتی:

''تم نے سب طے توڑ کر لیا ہے... اپنی لونڈیا کے ساتھ... میرے خیال میں وہ یہیں کہیں چھپی ہے... کھاؤ، پہلے تم کھیر چکھو۔ غالباً تمھیں اس میں کچھ ملانے کا موقع مل گیا ہے...''

جتنا ہی وہ اس کو پیٹتا اتنا ہی وہ ہزاروں شبہوں، لعنتوں ملامتوں اور شکایتوں کے ساتھ اس کے دل کی گہرائیوں میں کسی کیڑے کی طرح گھستی گئی۔

سورج پہلے کی طرح چمک رہا تھا، زمین پر سنہرے گل تھرتھرا رہے تھے، زرد ریت بچھی پڑی تھی، پانی میں جھنکار تھی، دن کے شوخ رنگ اپنا سریلا نغمہ چھیڑ رہے تھے لیکن ان سب چیزوں کو ایک گلا گھونٹ دینےوالے دھند نے جس سے لوگوں کو گھٹن ہو رہی تھی چھپا لیا تھا، بالکل ختم کر دیا تھا۔

(۱۳)

ایوان نے اپنی بہترین پتلون، صاف قمیص اور کوٹ پہنا اور اپنی پیٹی کسنا شروع کی۔ اتنے میں مالکن آ گئی اور اسکو دیکھ کر بولی:

''ارے، نکھٹو، بدذات پھر چلا اس لونڈیا کے پاس...'' اور پھر یکدم رک گئی۔

ایوان کے چہرے پر متانت اور سکون تھا۔ پرانا ظلم و ستم اور غم و غصہ غائب تھا۔

''تم کہاں جا رہے ہو، وانیوشکا؟'' مالکن نے پوچھا، اس کا دل بیٹھ رہا تھا۔

ایوان نے اپنی پیٹی مضبوط کسی، اس کا سرا بکسوے میں لگایا،

اپنا تھیلا اور ٹوپی اٹھائی، مقدس شبیہوں کی طرف پلٹا اور اپنے اوپر صلیب کا نشان بنا کر جھکا۔

"خدا حافظ، مالکن۔ میرے متعلق کوئی برا خیال نہ کرنا۔ میں جا رہا ہوں۔ ہم ساتھ نہیں رہ سکتے، دیکھو نا ہم ایک دوسرے کو کتنا ستاتے ہیں۔"

وہ اس کے سامنے کافی جھکا، اپنا تھیلا کاندھے پر ڈالا اور باہر نکل گیا۔

اس نے دوڑ کر پیچھے سے اس کی آستین پکڑلی اور لٹک گئی۔ سسکیاں لیتی ہوئی وہ اس کے پیچھے گھسٹ رہی تھی۔

"تم مجھے تنہا کیوں چھوڑے جاتے ہو؟ ارے پیارے، میری جان... تم آخر مجھے کیوں نہیں پسند کرتے؟ میں نے کون سی نا راضگی کی بات کی؟.. وانیوشا، لوٹ چلو۔ سب کچھ تمہارا ہے۔ مجھے کسی چیز کی اپنے لئے ضرورت نہیں..."

"نہیں، بڑی بی، ہم ساتھ نہیں رہ سکتے۔"

اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور چلا گیا۔

وہ سر سے پیرتک کانپتی ہوئی آگے دوڑی، اس کا چہرہ ایسا بگڑ گیا تھا جیسے کوئی دورہ پڑ گیا ہو، اس کے منہہ سے جھاگ نکلنے لگا اور غصہ بھری آواز میں وہ چیخنے لگی:

"ارے نکمے کہیں کے، اللہ کرے تو سڑک پر بھوکا مرے، ہر عیسائی تیرے سڑے منہ پر تھوکے... خدا کرے تو باڑ کے نیچے محتاج اپاھج ہو کر مرے!.."

اپنی بدحواسی میں سب کچھ جلدی جلدی اگل دینا چاہتی تھی۔ وہ چیخ رہی تھی:

"میں وصیت نامہ پھاڑ ڈالونگی... جاؤ مرو!"

وہ چلتے چلتے رک گیا اور مل کی طرف گھوم کر غصے سے تھرکتے ہوئے بولا:

"ارے یہ تیرے اوپر پھٹ پڑے۔ ستیاناس ہو اسکا... یہ تو میری جان کو آ گئی۔"

اس نے اس اوبڑ کھابڑ سڑک کی موڑ پر پھر اسے جا پکڑا جو جنگل کو جاتی تھی اور اس کی گردن میں لٹک کر چپکے چپکے سسکیاں بھرنے لگی:

''وانیوشا، مجھے زندگی میں کبھی خوشی نہیں نصیب ہوئی۔ تم جانتے ہی ہو کہ میری جوانی کس طرح ایک بڈھے کے ساتھ بسر ہوئی اور بچے بھی نہیں ہوئے... اب بس تمھیں میرے ہو...''

اس کو عورت پر ترس آ گیا اور وہ سڑک پر رک گیا۔

''واپس لوٹ چلو، میں تمہارے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالونگی...''

اس نے اس کی گرفت سے اپنے کو چھڑا لیا اور سڑک پر تیزی سے چلنے لگا، اس چھدرے اور تباہ حال جنگل میں وہ مرد بڑے عزم کے ساتھ چل رہا تھا۔ اس نے مڑکر ایک مرتبہ بھی نہیں دیکھا۔ وہ بڑی دیر تک دکھائی دیتا رہا اور عورت بھی نظر آتی رہی جو زمین پر پڑی اپنا سر نئی گھاس کی کونپلوں کے درمیان زرد چمکتی ہوئی ریت سے ٹکرا رہی تھی۔ سیاہ چکی ان دونوں کو بےالتفاتی سے تک رہی تھی اور پہیہ آہستہ آہستہ گھوم رہا تھا۔

(۱۴)

دن اور مہینے بڑی کوفت اور تنہائی میں گزرتے گئے۔ اس کی زندگی اجیرن ہو گئی۔ جہاں بھی وہ جاتی، جو کچھ بھی وہ کرتی اسے ایوان ضرور یاد آتا۔

اس نے ہر بات کو اچھی طرح سوچا اور جو کچھ ہوا تھا اس کے لئے اپنے کو ملزم پایا۔ اگر وہ واپس آ جائے تو زندگی بدل جائے۔ وہ بڑے لطف اور سکون کے ساتھ مل جل کر زندگی گزاریں گے۔

اپنے غم میں اس نے ریت کو جنگل کی طرف برابر بڑھتے دیکھا جس کی جگہ بڑھاپے کی طرح کسی چیز سے بھی نہیں پر کی جا سکتی تھی۔

اس کے دل میں ایک امید سی تھی کہ وہ واپس آئیگا۔ وہ اس بات کے نا ممکن ہونے کے خوف سے بہت سہم جاتی تھی۔

بڑھیا یہ بھول گئی کہ کتنی مرتبہ چکی اور جنگل نے سفید برف کا لبادہ پہنا۔ ریت پالے سے جکڑی پڑی تھی اور سکوت کے عالم میں گرمی اور خشک ہواؤں کا انتظار کر رہی تھیں۔

ایک رات جب برفانی طوفان رک چکا تھا اور برف کے بڑے بڑے لوندے درختوں کی شاخوں کو اپنے بار سے جھکا رہے تھے، ابھی

سرد جاڑے کا چاند نہیں بلند ہوا تھا کہ کسی نے کھڑکی پر کھٹ کھٹایا۔

''کون ہے؟''

شاید کوئی لٹھا پالے کی شدت سے چٹخ رہا ہو یا چھت سے جمی ہوئی برف کا کوئی تودہ گر رہا ہو۔

اس نے روشنی پر ہاتھ کا سایہ کرکے پالے سے ڈھکی ہوئی کھڑکی پر اپنا چہرہ لگا دیا۔ سفید دھند میں چکی گھر کا اداس خاکہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے غور سے جھانکا اور اس کو ایک شکل نظر آئی جو کسی آدمی یا کھڑکی پر کسی درخت کے سائے کی تھی۔

اس کا دل اشتیاق سے دھڑکنے لگا اور پھر اس نے کانپتی ہوئی آواز سے پوچھا:

''کون ہے؟''

''مجھے اندر آنے دو۔''

اس نے ڈرتے ڈرتے دروازہ ذرا سا کھولا اور اندر ایک چیتھڑے لگا، ٹھٹھرا ہوا آدمی آ گیا جس کا چہرہ مصیبت زدہ اور رنگ فق تھا۔ وہ اپنے ساتھ بھاپ کا ایک بادل لایا تھا۔

''وانیوشا!''

وہ دوڑ کر اس کے پاس پہنچی۔ وہ روتی اور ہنستی جا رہی تھی لیکن وہ اداس بیٹھا زمین پر اپنے گھٹنوں کے بیچ میں تکے جا رہا تھا۔

''چکی ہمیشہ کی طرح اب بھی قائم ہے۔''

''ہاں، ہاں، وانیوشا اور یہ اب تمہارے اور میرے لئے کام کرتی ہے... اب ہم دونوں ساتھ رہیں گے...''

''کسی بھلے آدمی نے اس کو آگ نہیں لگا دی۔''

''تم کیا کہہ رہے ہو، وانیوشا... یہ تو ہمیں روٹی دیتی ہے، ہم اس کے مالک ہیں — تم اور میں...''

اس نے گرم کمرے اور بھاپ نکلتے ہوئے سماور کے پاس بیٹھ کر ایک آوارہ بیکار مزدور کی عام کہانی دھرائی۔ اس نے اپنے گاؤں تک پہنچنے، اپنے خاندان اور فارم کو پھر حاصل کرنے کے لئے گھوڑے کی طرح کام کیا تھا تاکہ کچھ رقم بچا سکے لیکن درمیانی

مدت میں جب وہ کام کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا تو پس ماندہ رقم کھانے پینے میں خرچ ہو جاتی۔

"دیکھو!" اس نے ایک ھاتھ اٹھا کر دکھایا جس کی ایک انگلی غائب تھی۔ "ایک مشین سے کٹ گئی اور میں تین ھفتے تک کام نہیں کر سکا۔"

اس کی مصیبت زدہ آنکھوں میں غصے کی جھلک تھی۔

پہلے چند دن تو مالکن اس کو اچھی طرح کھلانے پلانے، آرام سے بٹھانے میں دل و جان سے لگی رھی اور وہ ھمیشہ اس کی آنکھ کے اشارے کی منتظر رھتی۔

رات کو بابا پھر اسے دکھائی دینے لگا۔ وہ منہ کے بل فرش پر لیٹ جاتا اور اسے ایسا محسوس ھوتا جیسے اس کی داڑھی دیکھ رھی ھے جو باھر کی دھند کی طرح ھلکی سفید ھے۔ اس مہربان بڈھے کی شکل میں ملامت کا شائبہ تک نہ تھا بلکہ اس میں اتنی مہربانی اور طفلانہ اعتماد تھا کہ جب وہ جاگتی تو اس کا بدن کانپتا اور وہ دریافت طلب نظروں سے اپنے ساتھی کی طرف دیکھتی۔

"اگر میں تمہارے دل کا حال معلوم کر سکتی... کہ وھاں کیا ھے" اس نے افسوس کے ساتھ کہا اور پھر اس پر بری طرح چہرہ بگاڑ کر کانپتی ھوئی آواز میں چپکے چپکے کہنے لگی:

"تو اپنے بال بچے چاھتا تھا... میں تیرے لئے کسی کام کی نہیں ھوں، تو صرف چکی اور اس کی آمدنی چاھتا ھے اور مجھکو نبٹانا چاھتا ھے... ارے بدمعاش کہیں کا!.. ارے، جلاد!.. غارت ھو... میں تجھے بھگا دونگی، پھر کسی کے باڑ کے پاس جا کر ٹھوکریں کھانا..."

اور پھر وھی گالی گلوچ، وھی شک و شبہ، پٹتی ھوئی عورت کی دلدوز چیخیں، گم صم چیزوں کی وھی بے جان ٹکٹکی۔ اس اداس اور گہری ٹکٹکی میں زبردست جان‌لیوا طاقت تھی جس کے سامنے یہ لوگ بالکل چھوٹے اور حقیر معلوم ھوتے۔

دن، ھفتے، مہینے اور سال گذرتے گئے۔ انھوں نے زندگی کو ایک سخت ڈھرے پر لگا دیا۔

اور پھر وقت گذرنے کا احساس صرف اس طرح ھونے لگا کہ جو درخت ھری بھری پتیوں اور شاخوں سے لدے کھڑے تھے اب وہ

سوکھے سہمے اور سیاہ تھے اور ان کے مردہ بازو آسمان کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔ ریت خاموشی کے ساتھ جنگل پر برابر اپنا تسلط جماتی جا رہی تھی۔

شاذونادر جب مالکن کسی کام سے باھر جاتی تو پانی کی جھنکار خوشکن معلوم ھوتی اور فاختائیں درختوں کی سوکھی شاخوں میں، کو کو، کرتی سنائی دیتیں۔ ایوان باھر ریت کی پہاڑی پر بیٹھتا اور اپنا سر ھاتھوں میں لے کر سوچ میں ڈوب جاتا۔

وہ خواب سا دیکھتا کہ سخت گرمی پڑ رھی ھے اور وہ بڑی سڑک پر چلا جا رھا ھے، وہ ایک فارم سے دوسرے فارم جاتا ھے لیکن کسی کو بھی مزدوروں کی ضرورت نہیں ھے اور پانی کا ایک قطرہ بھی خشک ھونٹوں کو تر کرنے کے لئے کہیں نہیں دکھائی دیتا۔ وہ خواب میں بھی اپنی خاندان اور اپنے فارم کا خیال کرنا بھول گیا۔ اس کو ایسا محسوس ھو رھا تھا جیسے اس کے چاروں طرف اور کچھ نہیں ھے۔ بس سیاہ چکی کھڑی گھور رھی ھے۔ چکی پھول کر بڑی ھو جاتی۔ دروازے بڑے ھوکر پھاٹک بن جاتے، بڑا سا پہیہ درخت سے بھی بلند دکھائی دینے لگتا اور نچی کھچی پھوس کی چھت اونچی ھو کر بھورے بادلوں کو چھو لیتی۔ جدھر بھی وہ دیکھتا بس سیاہ چکی ھی نظر آتی۔

دیکھو...

اس نے اپنی آنکھیں کھول کر سر ہلایا، سورج چمک رھا تھا، پانی جھنکار کے ساتھ بہہ رھا تھا اور درختوں کے درمیان سے چکی کالی دکھائی دے رھی تھی۔

”ارے، شاید میں سو گیا۔ جا کر چکی میں اناج ڈال دوں۔“

وہ اٹھ کھڑا ھوا اور کام پر واپس چلا گیا۔

مالکن واپس آ گئی اور پانی کی جھنکار، جنگل اور فاختاؤں کی کوکو، سب چیخوں، کوسنوں اور ھنگامے میں غائب ھو گئی۔

(۱۰)

ایوان اب متفکر رھنے لگا۔ وہ بہت کم کھاتا اور مشکل سے ایک آدھ لفظ بولتا۔ اس نے مالکن کو مارنا پیٹنا بھی بند کر دیا۔ اس سے بڑھیا اور بھی پریشان ھو گئی۔ رات رات بھر اس کو نیند

نہ آتی۔ وہ روٹی اور کھانے پینے کی دوسری چیزیں قفل کنجی میں رکھتی اور اس بات کی بڑی تاک رکھتی کہ ایوان اس کے کھانے میں کچھ نہ ملا دے۔

''بولتے کیوں نہیں؟ منہ پر مہر کیوں لگا لی ہے، نکھٹو؟..''

ایک دن صبح سویرے جب چکی پر کوئی کسان نہ تھا ایوان باڑے میں گیا، وہاں کچھ ٹٹولتا رہا، کوئی چیز نکالی اور درشت اور ستا ہوا چہرہ بنائے بڑھیا کے پاس آیا۔

''چلو۔''

''کہاں، ارے تم مرو، تمھیں کالا آزار کھا جائے، ہیضہ ہڑپ لے... خدا کرے...''

ایوان نے اس کو سکا سار کر گرا دیا اور اس کی چٹیا پکڑ کر گھسیٹتا لے چلا۔

بڑھیا بے تحاشا شاخوں، جھاڑیوں، گھاس اور بالو کو پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس طرح زوروں میں چیخ رہی تھی جیسے بیل ذبح ہوتے وقت چلاتا ہے۔

جب چکی کافی پیچھے رہ گئی اور چاروں طرف کے اجنبی جنگل میں اس کی چیخیں گم ہوکر رہ گئیں اس وقت بڑھیا نے آنےوالی موت کے خوف سے بدحواس ہوکر اپنے کو چھڑا لیا اور کھڑی ہو گئی، وہ تنکے کی طرح کانپ رہی تھی۔

''ایوانوشکا، پیارے تم مجھے کہاں لئے جا رہے ہو؟'' اس نے کہا۔

''چلو، چلو...''

وہ چلتے گئے، سوکھی ہوئی جھیلیں گذر گئیں، جنگل میں ریت سے ڈھکے ہوئے کھلے میدان گزر گئے۔ اور جب وہ جنگلی بیلوں سے ڈھکے ہوئے ایک کنج میں پہنچ گئے تو ایوان نے کہا:

''گھٹنوں پر جھک کر خدا سے اپنے گناہ بخشوا۔''

اس کے جھکے ہوئے ہاتھ میں ایک بھاری، چمکتی ہوئی کلہاڑی تھی۔

وہ زمین پر لوٹ گئی اور اس نے بازوؤں سے اسکے پیر باندھ لئے۔

''پیارے، اپنی اور میری دونوں کی روحوں کو گنہگار نہ کرو... مجھے یہ دنیا دیکھنے کے لئے زندہ رہنے دو...''

لیکن اس نے اس کو بڑے سکون اور سردمہری سے جواب دیا:

''تم نے مجھے بڑے کچوکے دئیے ہیں، اب مجھ سے یہ سہے نہیں جاتے... میرے لئے ساری دنیا اندھیر ہے، سب دن ایک سے ہیں، میں مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہوں اور اس سے نکل نہیں سکتا... اور تجھ کو بہت دن ہوئے مر جانا چاہئے تھا، بڑھیا کتیا!..''

''وانیوشا، خدا تم کو کبھی کوئی خوشی نہ دیگا، میری بات یاد رکھو...''

وہ زمین پر گھسٹتی ہوئی گئی اور موت کے خوف سے اس سے چمٹ گئی۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

''اچھا بڑھیا چڑیل، تو اپنے گناہ نہیں بخشوانا چاہتی۔ بہتر ہے۔ تو اسی طرح مر...''

اس نے ایک پیر پیچھے رکھ کر اپنی کلہاڑی اٹھائی۔

وہ چیخی لیکن یہ چیخ خوف کی نہ تھی بلکہ ایک کینہ بھری وحشیانہ چیخ تھی جو اس کے گلے میں پھنس رہی تھی:

''وصیت، وصیت... میں نے پھاڑ ڈالی ہے!''

اس کا ھاتھ معہ کلہاڑی کے اٹھا رہ گیا اور بڑھیا پاگلوں کی طرح ھنستی ہوئی زمین پر لوٹ گئی، وہ دیوانوں کی طرح اپنے تیز ناخنوں سے زمین کھرچ رہی تھی اور اس کے بگڑے ہوئے ہونٹوں سے جھاگ جاری تھا۔

''میں نے اسے پھاڑ دیا... میں نے اسے پھاڑ دیا... میں نے اسے پھاڑ دیا!..''

اور جنگل میں، جو چاروں طرف سے ان کو گھیرے تھا، ان وحشت ناک الفاظ کی ایک اداس گونج اٹھ رہی تھی:

''اسے پھاڑ دیا... اسے پھاڑ دیا...''

ایک کوا جو سوکھی شاخ پر بیٹھا تھا چیخا:

''کا... کا... کا!..''

اس نے کلہاڑی پھینک دی اور اپنا سر ھاتھوں میں تھام کر لڑکھڑاتا اور ٹھوکریں کھاتا ہوا بھاگا۔ اس کے سر پر آسمان اور جنگل کی دھند میں کھوئی فضا بادامی رنگ کی معلوم ہوتی تھی۔ ریت اٹھ کر آسمان تک جا پہنچی تھی، اس کے لہراتے ہوئے ستون

متحرک تھے اور برابر اپنی شکل بدل رہے تھے اور ان کے زبردست سر گھنے بادلوں کے لہراتے ہوئے غولوں میں جا کر کھو جاتے تھے۔

حد نگاہ تک سب کچھ یکساں تھا، روشنی کی ایک جھلک بھی نہ تھی، نااسیدی انتھاہ تھی۔

(۱۶)

وقت کبھی انتظار نہیں کرتا بلکہ اس طرح گزرتا جاتا ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ مالکن پھر مرغیوں کی دیکھ بھال کرنے لگی۔ وہ کسانوں سے طے توڑ کرتی، اناج تولتی، ایوان چکی کے پاٹوں کو ٹھیک کرتا اور چکی کی ہر خرابی کی مرمت کرتا۔

"سنو، مالکن... اگر تم نے دوسرا وصیت نامہ نہ لکھا تو میں چلا، میں یہاں ٹھہر کر کیا کرونگا، بس یہ آخری بار کہہ رہا ہوں۔"

"چلو پادری کے پاس چلیں، پہلا وصیت نامہ بھی اس کے پاس تھا اور ہمارے لئے وہ دوسرا بھی تیار کر دیگا۔"

وہ پادری کے پاس گئے۔

پادری باہر برساتی میں آ گیا اور ان دونوں کو ناگواری سے دیکھنے لگا۔

"مقدس باپ، ہم آپ کے پاس آئے ہیں۔"

"آخر اس کی وجہ کیا ہے" پادری نے ان کی بات ان‌سنی کرتے ہوئے کہا۔ "آخر تم دونوں شادی کیوں نہیں کرلیتے؟ تم کافروں کی طرح کیوں رہتے ہو؟ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہاری روحیں جہنم میں جائیں؟ بڑی بی، تم کو تو شرم آنی چاہئے، میں اس وقت تک تمہاری بخشائش کے لئے دعا نہ کرونگا جس وقت تک تم روزے نہ رکھو۔"

"مقدس باپ، میں شادی کیسے کرلوں؟" مالکن نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ "یہ مجھے پیٹ پیٹ کر ادھ موا کر دیتا ہے۔ میرے بدن بھر کا پور پور درد کرتا ہے۔ جانتے ہیں آپ کہ یہ ایک ہفتہ گزرے کیا کرنے والا تھا؟ مجھ کو جنگل میں لے گیا اور مار ڈالنے والا تھا، خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں یہ بالکل سچ بات ہے۔ آپ کے پاس اس کے حق میں لکھا ہوا وصیت نامہ رکھا

ہے۔ اس کو رکھیئے لیکن اگر میں مردہ پائی جاؤں یا مر جاؤں تو اس کا مطلب ہوگا کہ اس نے مجھے مار ڈالا... میں چاہتی ہوں کہ یہ آپ کو معلوم ہو جائے، ویسے تو مرنے کے بعد مردے کے ٹکڑے ٹکڑے کئے جا سکتے ہیں۔"

ایوان لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے چہرے سے ٹھنڈا پسینہ ٹپک رہا تھا۔

"اچھا تو وصیت نامہ پھاڑا نہیں گیا تھا!"

اس کے کان بج رہے تھے، اس کو کوئی بات نہیں سنائی دے رہی تھی۔

"اچھا تو تم اس طرح کی باتیں سوچتے ہو؟ شاید جیل جانا چاہتے ہو؟ اچھا دیکھو گھاس سکھانے کا زمانہ آ رہا ہے، دو تین ہفتے کے لئے آ جانا، گرجا کی چراگاہ میں گھاس کاٹ جانا... اس طرح تمہارا گناہ بھی دھل جائیگا... اور دیکھو، آ جانا نہیں تو میں پولیس کو اطلاع کر دونگا... سمجھے نا... اور تم بڑی بی، بہتر ہوگا کہ تم گرجا کے حق میں وصیت کرو... تمہارے گناہ تو بہت سخت ہیں..."

ایوان کے گلے میں اب پھندا سخت ہو گیا۔ اس میں اتنی قوت ارادی نہ تھی کہ وہ چلا جائے، اس کے علاوہ اب وہ سخت کام کرنے کا عادی بھی نہیں رہا تھا۔ چکی پر ہر وقت ہنگامہ اور گھما گھمی رہتی، مالکن ہمیشہ چیختی رہتی: خونی، بدمعاش، جلاد اور ایوان کو اسے پیٹنے میں وحشیانہ مزا آتا۔

(۱۷)

چاہے وہ مالکن کے ساتھ رات کا کھانا کھاتا ہوتا، کسانوں سے سودا کرتا ہوتا یا رات کو سوتا ہوتا ہمیشہ ایسے محسوس ہوتا کہ کوئی اس کے پاس کھڑا ہے۔ ایوان اپنی نگاہیں اٹھاتا اور اسے چکی کا سیاہ خاکہ اپنے سامنے نظر آتا۔ مل کی سرسراہٹ اور اسکے پہیوں کی گھڑگھڑاہٹ میں یکساں اور مدھم گفتار تھی۔ جیسے کوئی اس سے متواتر باتیں کر رہا ہو۔

وہ چپ کھڑا ہو جاتا، اور ایک طرف سر نہوڑا کر سننے لگتا۔ اس کو لمبی، یکساں آوازیں سنائی دیتیں۔

''او - ہو - ہو - ہو - ہا - ہا - آ... او... ہو - ہو - او...''

یہ عجیب ناقابل‌فہم زبان تھی - پھربھی اس سے انسانی خیالات کا اظہار ہوتا تھا - موسم خزاں کے اس کہر کی طرح جو دریا پر چھایا رہتا ہے یہ خیالات بھی ناصاف، منتشر اور متلون تھے - ان کے دھندلے خاکے سے کچھ اس طرح کے غیرواضح الفاظ بنتے تھے :

''تم... میرے ہو... تم... میرے ہو... تم بھاگ نہیں سکتے... تم بھاگ نہیں سکتے... تم میرے ہو...''

سست رفتار پہیے کو، سیاہ، اداس چکی گھر کو جس کا چھپر لٹک آیا تھا، متواتر کلکلاتے ہوئے پانی کو اور اس چکی کے پاٹ کو جو ان‌تھک اور یکساں لیکن طرح طرح کی پراسرار باتیں کرتا اور گھومتا رہتا تھا — ان سب کو ایوان جان دار سمجھنے لگا تھا -

''تم رات کا کھانا کھانے کیوں نہیں آتے؟''

''بات یہ ہے کہ چکی مجھے آنے ہی نہیں دیتی -''

یا :

''آج پہیا بدمزاج ہو رہا ہے - اس نے تو آج میرا بازو ہی توڑ ڈالا تھا -''

یا :

''آج چکی کا پاٹ خوش ہے - اتنی تیزی سے ناچ رہا ہے کہ مجھے آٹا جھاڑ کر صاف کرنے کا موقع بھی نہیں ملتا -''

جب وہ آپس میں لڑائی جھگڑے اور گالی گلوچ سے تھک جاتے تو ان کی شراب نوشی اور بدمستی شروع ہوتی - فارموں سے پڑوسی آتے اور سب کسان خوب پیتے یہاں تک کہ ہر چیز گڈمڈ ہو جاتی -

جب ایوان پیتا تو لوگ اس سے ڈرنے لگتے - اس کی آنکھیں خون کبوتر ہو جاتیں اور اس کی وحشی اور چڑھی ہوئی چتونوں کے نیچے سے چمکتیں - اس کے بال پریشان ہوتے اور گریبان پھٹا ہوتا -

اکثر وہ نشے میں اپنا سر ہاتھوں میں رکھ کر روتا :

''ارے میرے غریب سر، تم ٹکے میں بک گئے، ایک چٹکی تمباکو کے لئے - میں نے اس دنیا میں کیا دیکھا؟ میں نے زندگی کی کوئی خوشی نہ دیکھی - سوائے رینگتی ہوئی ریت کے، یہ تو میری زندگی پیسے ڈال رہی ہے... لعنت ہو اس پر...''

وہ بڑی دیر تک چکی کو گھورتا رہتا جو ہمیشہ کی طرح آج بھی کھڑی تھی، جیسے اسے ہونا چاہئے، جیسے وہ بڈھے کی زندگی اور اس سے پہلے اس کے باپ کے زمانے میں تھی - وہ سیاہ، سنجیدہ اور ایک طرف جھکی کھڑی تھی اور اس کا پہیہ جس پر کائی جمی ہوئی تھی لگاتار گھوم رہا تھا - اس کو دیکھ کر ایوان کو ناقابل فراموش نفرت ہوتی تھی -

''لعنت ہو تم پر!''

اس نے ایک کلہاڑی اٹھا لی اور چکی پر دیوانہ وار پل پڑا - اس نے اپنے ہاتھ زوروں سے گھما کر ضرب لگائی اور کلہاڑی سیاہ لکڑی میں اندر اتر گئی - چپٹیاں چاروں طرف اڑنے لگیں - دروازہ چرچرا کر دو ٹکڑے ہو گیا اور قبضوں سے الگ ہو کر زمین پر آ رہا -

''باندھو، باندھو، اس کو باندھو! .. یہ سب کچھ توڑ ڈالے گا! .. اس کو باندھو! ..''

چپٹیاں چاروں طرف اڑ رہی تھیں اور چکی گھر کی دیوار میں ایک موکھا ہو گیا تھا -

''میرے قریب نہ آنا... میں تم کو مار ڈالونگا! ..''

سیاہ، پرانی لکڑی میں بھاری فولادی کلہاڑی اور گہری اترتی گئی - زور لگانے کی وجہ سے آدمی کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور وہ خوشی سے چیخیں مار رہا تھا - ایک لمحہ میں چکی گھر ڈھیر ہو جائے گا اور پورا جنگل ایک آزاد آدمی کے قہقہوں سے گونج اٹھیگا:

''ہا - ہا - ہا - ہا! ..''

''باندھو اس کو، باندھو... مارو اس کو... میرے خدا، یہ تو مجھے مارے ڈال رہا ہے...''

''ہو - ہو - ہو... ہا - ہا - ہا...''

مہمان اور کسان سب دوڑتے ہوئے آئے لیکن کسی کو ایوان کے قریب جانے کی ہمت نہ پڑی جو چمکتی ہوئی کلہاڑی لئے کھڑا تھا - انھوں نے بڑی مشکل سے ایک ڈنڈے کے ذریعہ اس کے ہاتھ سے کلہاڑی گرائی - پھر اس کو زمین پر پٹک کر، اس کے ہاتھ پیچھے کی طرف کھینچے اور گھسیٹ کر اس کو بید کے درختوں کے نیچے لے گئے - وہ غصے سے ہانپ رہا تھا -

دوسرے دن ابھی ریت پر صبح پھیلی ہی تھی کہ ایوان نے کلہاڑی اٹھائی اور پورا دن دیواروں کی مرمت کرنے اور نیا دروازہ بنانے میں ہمہ تن مصروف رہا۔

ان میں سے ایک کے مرنے کے بعد دوسرا زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہا۔ دونوں کی موت بہت ہی کم وقفے سے ہوئی۔ وہ تھکن اور مصیبتوں سے چور تھے لیکن اس بے معنی زندگی کے عادی ہو چکے تھے۔

جب ان کی لاشیں مردہ گاڑی پر جا رہی تھیں تو خستہ حال چکی گھر جس کا چھپر ایک طرف جھکا ہوا تھا اور پھوس لٹک رہا ان کے جنازوں کی طرف حسب معمول غیرجذباتی، غیرواضح اور بےمعنی انداز میں ٹکٹکی لگائے گھورتا رہا اور لب لبا، کائی سے ڈھکا پہیہ پہلی سی اداسی اور بےتوجہی کے ساتھ آہستہ آہستہ گھومتا رہا۔

ریت ہمیشہ کی طرح آگے بڑھتی رہی۔

بہت دنوں تک ریت میں آدھے اٹے ہوئے چکی گھر کے سیاہ کھنڈر کھڑے رہے۔ پھر وہ بھی زمین کے برابر ہو گئے اور ریت دریا تک پھیل گئی۔

چاندنی راتوں میں فضا میں ایک سراب نظر آتا — حور کے درختوں اور سفید مکانوں کا سراب، عورتوں کے زیور بجتے اور جھنکار دار خاموشی اور آنسوؤں کے درمیان یہ آواز سنائی دیتی: ”اور اس کے ننھے منے دائیں بازو پر ایک جنم داغ...“

سراب غائب ہو جاتا، ریت سفید، ساکت اور بےجان چمکتی رہتی اور ریت کی پہاڑیوں کے سائے پھیل جاتے۔

۱۹۰۸ء

پوائنٹ مین

(۱)

''ارے، ایوان، چلو ۔ اسٹیشن ماسٹر تم کو پکار رہے ہیں!''
پوائنٹ مین ایوان کوئی چالیس سال کا ٹھگنا سا آدمی تھا ۔ اس کا چہرہ فکروں سے بگڑ گیا تھا اور وہ سر سے پیر تک سیاہی اور تیل میں شرابور تھا ۔ اس نے اپنی جھاڑو جلدی سے رکھ دی جس سے وہ پلیٹ‌فارم صاف کر رہا تھا اور دفتر کی طرف دوڑا ۔

''کیا حکم ہے؟'' اس نے دروازے میں فوجی کی طرح سیدھے کھڑے ہو کر پوچھا ۔

اسٹیشن ماسٹر نے اس کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں کی اور لکھتا رہا ۔ ایوان بغل میں ٹوپی دبائے سیدھا کھڑا تھا ۔

حالانکہ اس کے پاس ذرا بھی وقت نہیں تھا لیکن ایوان کی یہ ہمت نہ ہوئی کہ وہ اسٹیشن ماسٹر سے دو بارہ پوچھے ۔ آج اس کی ڈیوٹی تھی اور وہ صبح آٹھ بجے سے کام کر رہا تھا پھر بھی بہت کام باقی تھا ۔ اسٹیشن پر جھاڑو دینی تھی اور ریل کی پختہ سڑک پر بھی ۔ پھر پوائنٹس اور سگنل کے تاروں کو دیکھنا تھا، لیمپوں اور چمنیوں کو صاف کرکے لیمپوں میں تیل بھرنا تھا ۔ دو دن کی چھٹی تھی، اس کے لئے لکڑیاں چیرنا تھیں اور ان کو اسٹیشن کی عمارت تک پہنچانا تھا، فرسٹ اور سکنڈ کلاس کے مسافرخانوں میں جھاڑو دینی تھی اور بہت سی دوسری چیزیں بھی اس کو کرنی تھیں جو اس کے لئے دردسر بنی ہوئی تھیں ۔ چار بج چکے تھے،

شام کا دھندلکا ہونے لگا تھا اور ابھی اس کو پوائنٹس پر لیمپ جلانا تھے۔

ایوان اپنا کھردرا ھاتھ منہ پر رکھ کر ذرا احتیاط سے کھانسا تاکہ اسٹیشن ماسٹر اس کی طرف توجہ کرے۔

''تم نے پوائنٹس پر ابھی تک لیمپ نہیں جلائے؟'' اسٹیشن ماسٹر نے اپنا سر اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں حضور، میں ابھی دوڑ کر جاتا ہوں اور جلاتا ہوں۔''

''اچھا، جاؤ لیمپ جلا کر گائے کا باڑہ صاف کرو۔ گائے گھٹنوں گھٹنوں گوبر میں لت پت ہے۔ تم وقت پر کبھی کوئی کام کر ہی نہیں سکتے۔ اسی لئے گائے کے کھر ہمیشہ خراب رہتے ہیں۔''

''نمبر ٥ کی سال گاڑی دس منٹ میں آ جائیگی'' ایوان نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''اچھا۔ گاڑی نکل جانے دو، پھر...''

''اچھا، حضور۔''

اس کے عذر کرنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ ایوان دروازہ بند کرکے اس کمرے کی طرف دوڑا جہاں لیمپ رکھے جاتے تھے۔ اس چھوٹے الماری جیسے کمرے میں مختلف سائز کے بیس لیمپ طاقچوں پر رکھے تھے جن کی صاف شفاف چمنیاں چمچما رہی تھیں۔ ایوان نے چند لیمپ انتخاب کئے۔ ان کو دھات کی موٹی چادر کے ایک بکس میں رکھا اور پوائنٹس کی طرف روانہ ہو گیا۔

ہوا نہیں چل رہی تھی۔ پالا تیز ہو گیا جس کی وجہ سے اس کے کان، چہرہ اور ھاتھ ٹھٹھر رہے تھے۔ جاڑوں کی شام کا دھندلکا اسٹیشن کی عمارت، ریل کی پکی سڑک اور دوسرے مکانوں پر چپکے چپکے پھیل رہا تھا۔ پیروں کے نیچے برف چرمرا رہی تھی۔ لوگ جہاں تہاں اس امید میں اپنا کام جلدی جلدی ختم کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ آنےوالی چھٹی میں وہ روزمرہ کے کبھی نہ ختم ہونےوالے کام اور فکروں سے چھٹکارا پا کر آرام کر لینگے۔

ایک سے دوسرے پوائنٹ تک دوڑ دوڑ کر ایوان نے لیمپ جلائے اور ان کو ٹھیک جگہ پر رکھا۔ پوری لائن پر یہاں وہاں لال ہری روشنیاں دکھائی دینے لگیں اور آسمان پر ستارے بھی یکے بعد دیگرے پالے کی نیم دھند میں جگمگانے لگے۔

دور، کہیں بہت دور ریلوے لائن کی طرف سے ایک طویل، یکساں اور مغموم آواز آرہی تھی - وہ سرد ہوا میں ذرا دیر گونجی اور پھر غائب ہو گئی - ایک لمحہ تک ایوان سنتا رہا، پھر جھونپڑی کی طرف بھاگا اور اپنی لالٹین اور ترہی لیکر بے تحاشا لائن کی طرف ادھر دوڑا جو اسٹیشن سے پرے سب سے دوروالے پوائنٹ کی طرف تھی - برفانی میدان کے سفید کمبل میں یہ پوائنٹ تنہا سرخ ستارے کی طرح چمک رہا تھا - یہ بہت دور کی دوڑ تھی پھر بھی ایوان پوائنٹ تک پہنچ گیا - اس نے ہتھا پکڑ لیا اور کھٹکا پیر سے دبا کر زور سے کھینچا - سلاخوں میں تیز آواز پیدا ہوئی اور انھوں نے پٹریوں کو ایک طرف ڈھکیل دیا - دور کوئی غیر واضح اور بھدی سی چیز دکھائی دی - یہ چیز بڑی ہوتی گئی جیسے وہ کہیں سے رینگتی ہوئی آ رہی ہو - دو شعلہ ور آنکھیں چمکیں اور پھر ایک انجن کی تیز سیٹی صاف سنائی دی - انجن کی سیٹی سے بھاپ کی آواز نکل کر چاروں طرف پھیل گئی اور سرد ہوا میں اس طرح گونجنے لگی جیسے کبھی ختم ہی نہ ہوگی - پھر ایک موڑ سے گذر کر پوری ٹرین سامنے آ گئی اور اس دیوپیکر کے وزن سے پٹریاں تھرتھرانے لگیں - ٹرین کی ناقابل برداشت آواز کانوں کو پھاڑ رہی تھی - آخرکار یہ آواز رک گئی اور پھر تین مرتبہ مختصر اور صاف سیٹی سنائی دی -

اب ایوان نے ترہی اپنے ہونٹوں سے لگائی اور ایک خاص انداز سے اپنے ہونٹ سکیڑ کر پھونکی - وہ سرخ ہو گیا اور ترہی سے مدھم آواز نکلی - دیوپیکر ٹرین کے جواب میں جو گھڑگھڑاتی ہوئی دور سے آ رہی تھی ترہی سے ایک باریک، بھنبھناتی، درد بھری دل دوز آواز نکلی جو اداسی سے آہستہ آہستہ پھیلتی گئی، شام کے دھندلکے اور برف سے ڈھکے میدان میں جہاں ریل کی پٹریاں نہ جانے کہاں تک پھیلی ہوئی تھیں یہ آواز بالکل سپاٹ معلوم ہو رہی تھی -

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ترہی کی غمگین آواز یہ کہہ رہی ہو کہ ٹرین کو عجلت کی کوئی ضرورت نہیں، آگے کا اسٹیشن بھی ان سیکڑوں اسٹیشنوں کی طرح ہے جن سے وہ گذر چکی ہے - وہی عمارتیں ہیں، وہی گھنٹیاں، پلیٹ فارم، اسٹیشن ماسٹر، ملازمین، اور

بڑی لائن سے نکل کر شاخوں میں تقسیم ہونےوالی لائنیں ہیں، یہاں بھی ہر چیز اداس اور یکساں ہے اور ہر شخص اپنے اپنے کام میں مصروف اور اپنی فکروں میں مبتلا ہے، ہر شخص اپنے خاندان کے ساتھ تہوار گذارنے کے لئے بےچین ہے، کسی کو ان لوگوں کی فکر نہیں ہے جو مال گاڑیوں کے کھلے ڈبوں پر ٹھٹھر رہے ہیں یا انجن کے فٹ بورڈ پر کھڑے ہوکر آگے کی لائن کی نگرانی کرتے رہتے ہیں - پھر ترھی نے جیسے کچھ سوچا اور تین خوشکن اور مختصر آوازیں نکالیں - ''تڑو... تڑو... ت... تڑو،، گویا وہ کہہ رہی ہو کہ وہاں بے کیفی اور افسردگی ضرور ہے لیکن اس بات کا موقع ہے کہ اسٹیشن پر لپک کر ایک گلاس وادکا پی جائے، تھوڑی سی سڑی ہیرنگ مچھلی کھاکر ذرا بدن گرم کیا جائے، ریلوے کے ملازمین کے ساتھ وقت گذارا جائے اور پھر اپنا راستہ لیا جائے، واقعی زندگی ہے بھی ایسی ہی چیز : کام، کام، ہر دن، ہر ہفتے، ہر مہینے اور ہر سال کام، یہاں تک کہ آدمی آرام کا نام ہی بھول جاتا ہے اور پھر جب آرام کا وقت آتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ جیسے ٹرین اسٹیپی کے کسی سنسان اسٹیشن پر پہنچ گئی ہے اور کسی پہلو کی لائن پر کھڑی کر دی گئی ہے -

انجن نے سگنل کا حکم مان لیا - وہ پوائنٹ سے گھڑگھڑاتی گذر رہی تھی، بھپ بھپ کرتی دھواں اگل رہی تھی اور اس کی بھاپ بھری سانس نتھنوں سے نکل کر دونوں طرف سنسان اور برف سے منجمد زمین کے اوپر سفید کمبل کی طرح پھیلتی جا رہی تھی - انجن اب دھیما ہو رہا تھا کیونکہ ڈبے ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے - ان کے بفر کھڑکھڑا اورجھنجھنا رہے تھے - ایوان ھتھے کا سہارا لئے کھڑا تھا، ٹرین کھڑکھڑاتی، چیختی، چرمراتی لوھے سے لوھا ٹکراتی پوائنٹ سے گذر گئی اور اس نے پٹری بدل دی - انجن پوائنٹ مین کے پاس سے گذرا، اس کے بعد انجن گاڑی اور ڈبے یکے بعد دیگرے گذرے - کوئی بیس تیس ڈبے گذرے ہونگے - وہ برابر ایک دوسرے سے ٹکرا کر کھڑکھڑا اور جھنجھنا رہے تھے - ٹرین پر جابجا کوئی آدمی بھاری لباس پہنے بریک کا پہیہ گھماتا دکھائی دیتا تھا - یہ خوب لدی ہوئی بڑی مال گاڑی تھی - آخرکار آخری ڈبہ آیا - شام کے سرد دھندلکے میں اس کے پچھلے لیمپ سے سرخ روشنی نکل رہی تھی -

پوائنٹ مین پھر دوڑا تاکہ وہ ٹرین سے آگے نکل کر اگلے پوائنٹ پر پہنچ جائے اور ھتھا کھینچ کر ٹرین کو دوسری پٹری پر پہنچا دے۔ حالانکہ ٹرین دھیمی ہو گئی تھی اور اب کافی آھستہ جا رھی تھی پھر بھی اس سے آگے نکلنا بہت مشکل تھا۔ ایوان کی سانس پھولی ھوئی تھی اور وہ بری طرح ھانپ رھا تھا۔ اس کے پیر جواب دے رہے تھے لیکن وہ آخری ڈبے تک پہنچ گیا۔ اب اس میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ لپک کر ھتھا پکڑے۔ اس نے کئی مرتبہ ٹھٹھری اور سن انگلیوں سے اس کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن ناکامیاب رھا اور پہئے کے نیچے گرتے گرتے بچا۔ آخرکار وہ فٹ بورڈ پکڑنے میں کامیاب ھو گیا۔ مشکل سے اوپر چڑھا اور کئی منٹ تک بالکل ساکت کھڑا رھا۔ اس کی سانس اندر نہیں سما رھی تھی۔ اب ٹرین اسٹیشن سے رینگتی ھوئی جا رھی تھی پلیٹ‌فارم آھستہ گذر رھا تھا۔

ایوان نیچے کودا اور ایک چھوٹی جھونپڑی کی طرف دوڑا جس میں وہ تار رکھے تھے جن کے ذریعہ کئی پوائنٹس کام کرتے تھے۔ وہ ٹرین کے اگلے سرے پر پہنچ کر بڑبڑایا: ''اوہ، کتنی بڑی دیونی ہے، یہ گاڑی،،۔ وہ جلدی سے کیبن کے اندر گیا جہاں پوائنٹس کو کام میں لانے کے لئے ھتھوں کا ایک پورا جنگل پھیلا ھوا تھا۔ اس نے ان میں سے ایک کھینچ لیا اور گاڑی ایک پہلو کی پٹری پر مڑکر اسٹیشن سے بہت دور ایک میدان میں رک گئی۔ اس مال‌گاڑی کو یہاں رک‌کر ڈاک‌گاڑی کے گذرنے کا انتظار کرنا تھا۔ پوائنٹ مین نے پھر ھتھا کھینچ کر خاص لائن کی پٹری ٹھیک کر دی جس پر ڈاک گاڑی آنے‌والی تھی۔

''اب میں جاکر گائے کا باڑہ صاف کر سکتا ھوں،، اس نے طے کیا اور اسٹیشن سے ھوتا ھوا پچھواڑے صحن کی طرف چلا۔

''تم کہاں جا رہے ھو؟،، اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر نے پوچھا۔

''اسٹیشن ماسٹر نے مجھے گائے کا باڑہ صاف...،،

''پلیٹ‌فارم پر جھاڑو کیوں نہیں دی گئی؟،،

''اسٹیشن ماسٹر نے کہا کہ...،،

''تم کو یہ کام وقت سے کرنا چاھئے۔ کل تہوار ھے اور اسٹیشن پر گندگی کے مارے چلنا دشوار ھے۔ اسے فوراً صاف کرو۔،،

''اچھا حضور ۔ ''
اسسٹنٹ جاتے جاتے رک گیا اور چلا کر کہا :
''اور آج رات کو میرے گھر پر دو دن کے لئے جلانے کی لکڑی پہنچا دو کیونکہ تہوار کے دن پھر تم بدمستوں میں سے کوئی ہاتھ نہ آئیگا ۔ ''
''اچھا حضور ۔ ''
اسسٹنٹ چلا گیا ۔ ایوان نے پلیٹ‌فارم پر جھاڑو دینی شروع کی ۔ اس نے جھاڑو دائیں بائیں چلاتے ہوئے سوچا : ''عجیب بات ہے، اب آدمی اپنے کو سو جگہ کیسے پہنچائے ۔ ایک تو کیا سات ہاتھ بھی کافی نہیں...''
''ارے، ایوان!''
''کیا بات ہے؟'' ایوان اسباب گھر کے دروازے کی طرف دوڑا جہاں اسباب کارک کھڑا تھا ۔
''تم کہاں مر رہے تھے؟ تم تو تہوار سے بدمست اور پاگل ہو گئے ہو ۔ فرسٹ کلاس کے مسافر خانے میں ابھی تک لیمپ نہیں جلے ۔ مسافر آ رہے ہیں اور کمرے میں اندھیرا گھپ پڑا ہے ۔ اگر تم یہ کام نہیں کر سکتے تو نکل جاؤ...''
''میں بھول گیا، واسیلی واسیلئےوچ ۔ ایوان پیتروو‌چ نے مجھے پلیٹ‌فارم پر جھاڑو دینے کو کہا اور اسٹیشن ماسٹر چاہتے ہیں کہ میں گائے کا باڑہ صاف...''
''پلیٹ‌فارم! تم کو ہر چیز وقت سے کرنی ہوگی ۔ جاؤ لیمپ جلاؤ ۔ ''
''اچھا حضور ۔ ''
ایوان نے اپنی جھاڑو رکھی اور فرسٹ کلاس کے مسافر خانے میں لیمپ جلانے دوڑ گیا ۔ وہاں مسافر جمع ہو گئے تھے ۔ جس انداز سے وہ کمرے میں ٹہل رہے تھے، جس طرح وہ قلیوں کو ٹکٹ خریدنے کے لئے پیسے دے رہے تھے، ان کی وضع قطع اور نقل و حرکت — سب باتوں سے ایوان کو یہ محسوس ہوا کہ ان کو چھٹیوں میں کام اور فکروں سے نجات اور چین کی توقع ہے ۔ ایوان نے لیمپ جلائے اور جلدی سے پلیٹ‌فارم صاف کرنے پھر واپس گیا ۔ پلیٹ‌فارم صاف کرکے وہ لکڑیوں کے باڑے کی طرف بھاگا ۔ اسے ڈر تھا کہ وہ شاید کہیں اور

بھیج دیا جائے یا شاید کوئی اور کام اس کے لئے نکل آئے۔ لکڑی کے باڑے میں چیرے ہوئے چیلے نہ تھے، اس لئے اس کو خود لکڑی چیرنا پڑی۔ وہ اپنے کام میں جٹ گیا۔ اس کو اسٹیشن کی تمام عمارتوں کے لئے لکڑی چیرنا پڑتی تھی لیکن اسی پر بس نہ تھی۔ اس کو اسٹیشن ماسٹر اور اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر کے کمروں اور باورچی خانوں کے لئے لکڑی بھی پہنچانی پڑتی تھی۔ یہ سچ ہے کہ ان لوگوں کے اپنے ملازم تھے اور یہ کام اس کا نہ تھا۔ اس کا کام صرف پوائنٹس اور ریل کے پختہ راستے کی دیکھ بھال تھا۔ لیکن اگر کوئی افسر حکم دے دیتا تو اس کو بجا لانے کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ ایوان چیلے چیرتا، ان کو ایک طرف پھینکتا اور کھنکارتا رہا۔ چیلوں کا ڈھیر بڑا ہوتا گیا۔

"اب تو کافی ہو گئے"، اس نے فیصلہ کیا اور چیلوں کو بڑے بڑے گٹھوں میں باندھنے لگا تاکہ وہ لکڑیاں پہنچانے کا کام جلد از جلد ختم کر دے۔ جب اس نے کراہ کر پہلا گٹھا اپنے کاندھے پر رکھا تو اسے محسوس ہوا کہ اس نے زیادہ لکڑی لاد لی ہے۔ لیکن وہ دروازے کا چوکھٹا اور دیواریں پکڑ کر بھاری بوجھ سے لڑکھڑاتا ہوا چل پڑا۔ اس نے گٹھا پھینکا تو نہیں لیکن اس سے جلد از جلد نجات پانا چاہتا تھا۔ اسٹیشن کے گھروں کو چار گٹھے پہنچانے کے بعد اب اس کو اسٹیشن ماسٹر اور اس کے اسسٹنٹ کے کمروں میں لکڑی پہنچانی تھی اور یہی سب سے سخت کام تھا کیونکہ وہاں لکڑی لے کر زینوں کے اوپر چڑھنا پڑتا تھا۔ اس کے گھٹنے جھکے جا رہے تھے اور پیر تھرتھرا رہے تھے۔ وہ اپنے دانت بھینچ کر پوری طاقت سے ایک ایک زینہ چڑھنے لگا۔ ہر لمحہ اس کو ڈر تھا کہ لکڑی سمیت نیچے لڑھک جائیگا۔ آخرکار وہ اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر کے باورچی خانے تک پہنچ گیا اور فرش پر لکڑی پٹک دی۔

"اتنی دیر کیوں کر دی؟ تمھاری وجہ سے میں نے باورچی خانہ نہیں صاف کیا۔ بھلا تمھارے آنے سے پہلے فرش دھونے سے کیا فائدہ، تم ہر طرف گندگی پھیلا دیتے ہو"، اس طرح باورچن نے ایوان کا سواگت کیا۔ وہ چڑچڑی اور لڑاکا عورت تھی۔ اس کی ناک لال تھی اور وہ ہمیشہ نشے میں رہتی تھی۔

ایوان کو بھی تاؤ آ گیا۔

''تم نے پہلے ہی سے چڑھالی اور مجھ پر تاؤ دکھا رہی ہو کہ میں دیر میں آیا ہوں؟ کیا میں تمہارے لئے اپنی جان دے دوں؟''

''شرابی کہیں کے! تم پر لعنت ہو، پاجی سور۔ آئندہ تو میں تمہارے ایسے گندے آدمی کو دروازے کے اندر قدم نہ رکھنے دونگی۔ میں مالک سے تمہاری شکایت کرونگی۔ ابھی جاتی ہوں...''

اور باورچن فیصلہ کن انداز میں کمرے سے چلی۔

ایوان سہم گیا۔

''ماکریدا اسپیریدونونا، ایک منٹ رکو، بڑی مہربانی ہوگی۔ میں تو تم کو سلام کرنے چلا آیا تھا۔ میں تو بہت خوش... کیا میں تمہاری گندے پانی کی بالٹی پھینک دوں؟''

اور جواب کا انتظار کئے بغیر ایوان نے لپک کر گندے پانی کی بالٹی اٹھائی اور دوڑکر باہر گیا اور اسے انڈیل آیا۔ اسپیریدونونا اب نرم پڑگئی۔

''اب مجھے تھوڑا پانی لا دو۔''

ایوان پانی لے آیا۔

''سماور کے لئے چپٹھیاں کاٹ دو، چھٹیوں میں تو وقت سلیگا نہیں۔''

''یہ عورت بڑی جھکی ہے لیکن کیا کیا جائے'' ایوان نے ایک لٹھے سے چپٹھیاں چھڑاتے ہوئے سوچا۔ ''مجھے لوگ سانس لینے کا موقع نہیں دیتے اور یہ عورت مجھ پر اوپر سے ردا کستی ہے لیکن میں بےبس ہوں، یہ شکایت کر دیگی۔''

اس سے پیچھا چھڑا کر ایوان بڑبڑاتا ہوا چلا۔ ''لوگ کام لے لےکر ہلکان کر دیتے ہیں۔'' وہ اسٹیشن ماسٹر کے باڑے میں پہنچا جہاں گائے کھڑی بڑی اداسی سے جگالی کر رہی تھی۔ اس نے ایوان کی آمد پر بڑی بے توجہی سے دیکھا۔

''چل، چڑیل کہیں کی!'' ایوان چلایا اور اپنے تاؤ میں گائے کے ایک بیلچہ رسید کیا۔ گائے اپنی چوٹیلی ٹانگ اٹھا کر بڑی فرماں برداری سے ہٹ گئی۔ ایوان نے بے حد غصہ کی حالت میں گوبر الگ پھینکنا شروع کیا۔

''نہ جانے کہاں سے یہ اتنا گوبر کرتی ہے؟ بس صرف کھانا اور جگہ کو گندہ کرنا جانتی ہے۔ اگر گوبر کے بجائے اتنا ھی دودھ دیتی تو کیا بات تھی لیکن یہ گھاس بھرتی چلی جاتی ہے اور دودھ وودھ کچھ نہیں دیتی۔ اور یہ اسٹیشن ماسٹر ... کیا بازار میں کافی دودھ نہیں ملتا؟ اگر وہ دودھ خرید لے تو زیادہ بچت ہو۔ ایسی سورنی پال کر تو نقصان ضروری ہے۔ اور ذرا اس گوبر کے ڈھیر کو تو دیکھو! خدا غارت کرے، بھتنی کہیں کی!''

پھر اس نے بھولی گائے کے ایک بیلچہ رسید کر دیا جو یہ بالکل نہیں سمجھ رہی تھی کہ آخر اس سے یہ برتاؤ کیوں کیا جا رہا ہے اور دیوار سے دبک کر کھڑی ہو گئی تھی۔

ایوان کے پسینہ ٹپک رہا تھا۔ وہ بہت تھک گیا تھا اور اب اس میں کام کرنے کی سکت نہیں رہ گئی تھی لیکن اس کو کام ختم ھی کرنا تھا۔

''یہ کام ختم کر کے میں ذرا کچھ کھاؤں پیونگا ورنہ اس شفٹ کے آخر تک میرا زندہ ھی رھنا مشکل ھو جائیگا۔''

آخرکار گوبر صاف ھو گیا، ایوان نے گائے کو دوچار مرتبہ اور پیٹا، بیلچہ کونے میں رکھا اور اسٹیشن واپس گیا۔

(۳)

اسٹیشن کے کھانے پینے کے کمرے میں مال گاڑی کے بریک والے چائے کی گرمی سے لطف‌اندوز ھو رہے تھے۔ ایوان بار تک گیا، ایک گلاس وادکا پی اور تازہ دم ھو کر زور کی سانس لی، وادکا کو ھضم کرنے کے لئے بدبودار مچھلی کا ایک ٹکڑا کھایا اور گھر پر اچھی طرح چھٹی منانے کے لئے وادکا کی پوری بوتل خریدی۔ بوتل جیب میں رکھ کر وہ کیبن گیا اور ھتھوڑا اور پیچ کش لیکر ڈاک گاڑی کی آمد سے پہلے لائن کا جائزہ لینے روانہ ھو گیا۔ وہ راستہ میں ذرا دیر ٹھٹھک کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اگر وہ بوتل اپنے ساتھ لے گیا تو ممکن ہے کہ ٹوٹ جائے اور اگر کیبن میں چھوڑتا ہے تو اس کی جگہ پر جو کام کرنے آئیگا وہ سار

لے جائیگا - ایسی چیزوں کے لئے تو اس کی ناک کتے کی طرح تیز ہے - ''بہتر ہوگا کہ میں دوڑ کر اسے گھر پر چھوڑ آؤں،، ایوان نے سوچا اور وہ ریل کی پختہ سڑک کو چھوڑ کر ایک چھوٹے گھر کی طرف چلا جو ریلوے سے پچاس گز کے فاصلے پر تھا اور جس کی چھوٹی سی روشن کھڑکی اس کا استقبال کرتی معلوم ہو رہی تھی -

ایوان نے گھر میں جھانک کر دیکھا - چھوٹا سا کمرہ جس میں بڑا سا چولھا تھا ہمیشہ گندا رہتا تھا اور برتن، ساھی توے، ڈبے اور گھر گرھستی کے دوسرے برتن ادھر ادھر پھیلے رھتے تھے لیکن آج یہ بہت صاف ستھرا تھا، کچا فرش تھوڑی ھی دیر ھوئے مٹی سے لیپا گیا تھا، دیواریں چونے سے پوتی گئی تھیں اور بھاری چولھے کی دیواروں پر، جو آدھا کمرہ گھیرے تھا، شوخ نیلے رنگ کی مورتیاں بنی تھیں - مقدس شبیہوں کے نیچے بڑے کونے میں ایک میز پڑی تھی جس پر موٹا لیکن صاف کپڑا پڑا تھا - شبیہوں کے سامنے موم بتی جل رھی تھی اور اپنی جھلملاتی روشنی نیچی چھت، نیلی مورتیوں اور بچوں کے سنہرے بالوں والے سروں پر ڈال رھی تھی - ایوان کے آٹھ بچے تھے جن میں سب سے چھوٹا اس وقت بھی پنگوڑے میں جھول رہا تھا جو چھت سے لٹکا ھوا تھا -

تھکے ھوئے بچوں کی آنکھیں مشکل سے کھل رھی تھیں لیکن غالباً وہ رات کے کھانے پر اپنے باپ کا بےصبری سے انتظار کر رہے تھے - نیلے خاکوں، سفید دیواروں اور صاف میزپوش سب نے ایوان کے دل میں یہی خیال پیدا کیا، آرام اور چین اس کے منتظر ھیں -

اس نے کھڑکی کھٹ کھٹائی، اس کی بیوی باھر آئی -

''کون ھے؟،، اس نے رات میں غور سے دیکھا جس میں صرف ستارے چمک رہے تھے -

''یہ لو، میں نے سوچا کہ یہ کہیں کیبن سے چوری نہ ھو جائے -،،

''کام پر سے آ گئے؟،،

''نہیں، ابھی تو ریل کی پٹریاں دیکھنا ھیں -،،

''کام کے بعد زیادہ دیر نہ رکنا، بچے سونا چاھتے ھیں -،،

''میں آدھہ گھنٹے میں لوٹ آؤنگا، بس ڈاک گاڑی آنے ھی والی ھے - وہ آ جائے پھر گھر آتا ھوں -،،

ایوان ریل کی پختہ سڑک کی طرف بھاگا۔ وہ اپنے ہتھوڑے پٹریاں کھٹ کھٹاتا جاتا اور کہیں کہیں کوئی ڈھیلا پیچ کس بھی دیتا۔ اس نے پوائنٹس کو دیکھا، تاروں کا جائزہ لیا۔ ہر چیز بالکل ٹھیک تھی۔ وہ اسٹیشن واپس گیا۔

(۴)

لمبی ڈاک گاڑی جس کو دو انجن کھینچ رہے تھے پٹری سے گرجتی ہوئی گذر رہی تھی۔ اس کے پہیوں کے نیچے سے برف کی بوچھار ہو رہی تھی اور دونوں انجنوں کی چمنیوں سے بھاپ نکل نکل کر ایک سفید چادر کی طرح دور تک پھیلتی جا رہی تھی۔ پوری ٹرین مسافروں سے کھچا کھچ بھری تھی۔ کنڈکٹر ڈبوں میں جا جا کر ٹکٹ جمع کر رہے تھے۔ ٹرین سے آگے کسی انجن نے زور سے سیٹی بجائی۔

مسافر سامان رکھنے والے تختوں پر سے اپنے بیگ اور تھیلے اٹھا رہے تھے اور اپنے تکئے باندھ رہے تھے کہ گاڑی کی رفتار سست ہونے لگی اور زوردار چیخ کے ساتھ گاڑی کے بریکوں نے پہیوں کو روک دیا۔

گاڑی کے اسٹیشن پہنچتے ہی اسٹیشن ماسٹر نے ایوان کو پہلی گھنٹی بجانے کا اشارہ کیا۔ ٹرین صرف دو منٹ رکتی تھی۔ اب ایوان دوڑ کر سامان والے ڈبے تک پہنچا اور جلدی جلدی ان مسافروں کا سامان نکالنے لگا جو اسٹیشن پر اتر رہے تھے۔

وہ اپنی پوری طاقت سے بیگ، ٹرنک اور گانٹھیں باہر پھینک رہا تھا اور ان پر پڑے ہوئے ضروری نمبروں کو دیکھتا جاتا تھا۔ جب پورا سامان ڈبے سے باہر آ گیا تو ایوان نے اس کو ایک ٹرالی پر لادا اور سامان کے کمرے میں لے گیا۔

”ایوان، تم کہاں مر گئے، دوسری گھنٹی بجاؤ، میں تم سے کہہ رہا ہوں۔“

اسٹیشن کی چھوٹی گھنٹی کی آواز دو مرتبہ فضا میں صاف گونجی۔

”دوڑ کر انجن ڈرائیور کو لائن کلیر دو!“

پوائنٹ مین لائن کلیر لیکر پلیٹ فارم پر بھاگا، وہ بھیڑ کو چیرتا جا رہا تھا۔ ٹرین بڑی لمبی تھی اور اس کو پورا راستہ دوڑکر طے کرنا پڑا۔ ڈرائیور نے اپنی کیبن سے باھر جھک کر ایوان سے پاس لے لیا۔

''تیسری گھنٹی!..،، اس کا دل زوروں سے دھڑک رہا تھا۔ وہ دوڑ کر گھنٹی کے پاس گیا اور اسے تین سرتبہ بجا دیا۔ بڑے کنڈکٹر نے سیٹی بجائی اور انجن نے طوعاً و کرھاً غصے میں اس کا جواب دیا، دھات کے پرزے کھڑکھڑائے، چیخے اور ٹرین چل پڑی۔ پلیٹ‌فارم پیچھے رہ گیا، ڈبوں کے پہیے بڑے سرتال سے بج رہے تھے اور ڈبے جھولتے اور لہراتے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے چلے جا رہے تھے۔

ایوان نے اطمینان کا سانس لیا۔ بیچ میں ایک دن چھوڑکر اس کی ڈیوٹی ھوتی تھی اور ہر سرتبہ رات کو دس بجے وہ سامان اتار کر تھک جاتا تھا، ھمیشہ ایوان ھی کو گھنٹی بجانی پڑتی تھی، ڈرائیور کو لائن کلیر دینا پڑتا تھا اور پھر دوڑ کر سگنل بھی دینا ھوتا تھا یعنی ہر شام اس کو دو آدمیوں کا کام کرنا پڑتا تھا اور وہ بائیس سال سے یہ کام کر رہا تھا۔

یہ بائیس سال اس کی زندگی کو گھن کی طرح کھا گئے تھے۔ اس کو محسوس ھوتا تھا کہ جو کچھ بھی اس نے ابھی تک کیا ھے اور اب بھی کر سکتا ھے — وہ بس پوائنٹس کے ھتھے کھینچنا، سگنل دینا، گھنٹی بجانا اور لیمپ جلانا ھے۔ اس کو یہ کام آسان ترین، موزوں ترین اور نفع‌بخش معلوم ھوتے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ وہ کوئی دوسرا کام کر ھی نہیں سکتا، دوسری جگہ بیکار ھوگا۔ وہ آٹھ بچوں کا باپ تھا اور پندرہ روبل ماھوار کماتا تھا۔ جب ٹرین گذرنے کے لئے وہ ایک لائن سے دوسری لائن پر دوڑ دوڑ کر پٹری بدلتا، لیمپ بجھاتا، گائے کا باڑہ صاف کرتا یا پلیٹ‌فارم پر جھاڑو دیتا تو ایک ھی خیال اس کے دل میں آتا، اس کی ایک ھی کیفیت ھوتی — وہ یہ خوف تھا کہ کہیں اس نے کوئی غلطی تو نہیں کر دی، کوئی کام رہ تو نہیں گیا، کہیں کچھ گڑبڑ تو نہیں ھو گئی۔ بائیس برسوں نے اپنا پورا اثر دکھایا تھا اور اس زمانے میں اسے کبھی یہ خیال بھی نہیں آیا تھا کہ اسے کسی دوسری جگہ کام کرنا

چاهئے ۔ وہ اسٹیشن، ریل کی سڑک اور پلیٹ‌فارم سے علحدہ رہنے کا تصور ہی نہیں کر سکتا تھا ۔ رات کو دس بجے ڈاک گاڑی کے جانے کے بعد ڈیوٹی ختم ہو جاتی تھی ۔ اس وقت جا کر اس خوف اور پریشانی کا بوجھ اس پر سے اترتا تھا کہ کہیں کچھ گڑبڑ نہ ہو جائے اور اطمینان کی گہری سانس لیتا تھا ۔

ہاں، تو اس دن بھی جب ڈاک گاڑی پلیٹ‌فارم سے گذر گئی، اس کے اوپر انتہائی کمزوری کا احساس طاری ہو گیا، اس کو یہ احساس ہمیشہ دن بھر کا کام ختم ہونے پر ہوتا تھا، ساتھ ہی یہ احساس بھی پیدا ہوا کہ جیسے کوئی بوجھ کندھوں سے اتر گیا ہو ۔ اس نے اپنے اوپر صلیب کا نشان بنانے کے لئے ہاتھ اٹھایا اور... رک گیا ۔ اچانک ایک خوفناک خیال طاری ہو گیا : مال گاڑی گذرنے کے بعد وہ بڑی لائن کے لئے پٹری بدلنا بھول گیا تھا اور اب ڈاک گاڑی لائن پر تھی ۔ اس پر بری طرح خوف چھا گیا، زبردست ذمے داری کے خیال سے بدحواس ہو گیا ۔ اس کا چہرہ دودھ کی طرح سفید تھا ۔ وہ ننگے سر پاگلوں کی طرح اس طرف دوڑا جدھر نظروں سے اوجھل ہوتی ہوئی گاڑی کی پچھلی سرخ روشنی دکھائی دے رہی تھی ۔

بہت دیر ہو گئی! ایک سکنڈ میں جاڑے کی دھندلی زرد شام میں کان کے پردے پھاڑ دینے والا ایک دھماکا ہوگا، ریلوے لائن کے اوپر ایک سیاہ غبار اٹھیگا اور سرد ہوا وحشیانہ اور بے‌معنی چیخوں سے گونج اٹھیگی ۔

ایوان ایک پہلو کی پٹری کی طرف اندھادھند بھاگا جہاں ایک انجن آ جا رہا تھا تاکہ وہ ان چیخوں کو نہ سن سکے ۔ وہ بری طرح کانپتا ہوا ان چمکتی ہوئی پٹریوں پر پہنچ گیا جو آنےوالے انجن کی سامنے کی روشنی میں جگمگا رہی تھیں ۔

ان چند لمحوں میں ساری گذری ہوئی زندگی اس کی آنکھوں میں اس طرح پھر گئی جیسے انجن کی روشنی نے اس کو روشن کر دیا ہو ۔ اس کے ذہن میں وہ دن آیا جو ابھی ختم ہوا تھا : فرایض کی انجام‌دہی... پلیٹ‌فارم... لیمپ... جلانے کی لکڑی... گائے... نیلی سورتیوں سے سجا ہوا چولھا... سنہرے بالوں‌والے بچے اور... یہ جان‌لیوا پوائنٹ ۔

اس انتہائی پریشانی کے لمحے میں اس کو اچھی طرح یاد آ گیا کہ اس نے بڑی لائن کے لئے پٹری بدل دی تھی... ارے، خدایا۔ اس نے پٹری کو ٹھیک حالت میں چھوڑا تھا۔ وہ تو سب کچھ بھول گیا تھا ــ ڈاک گاڑی صحیح راستے پر چھک چھک کرتی چلی جا رہی تھی...

ایوان بدحواس ہو کر چیخا اور پٹریوں سے کود کر بھاگنے کی بڑی کوشش کی لیکن اسی لمحے متحرک انجن اپنے لوہے، فولاد اور دھکتے ہوئے کوئلوں کے سارے بوجھ کے ساتھ اس پر دوڑ گیا... اور اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔

(۵)

ادھر ادھر پھیرے لگاتے ہوئے انجن کا ڈرائیور پائدان پر کھڑا ان روشن پٹریوں کو تک رہا تھا جو اس کی طرف آ رہی تھیں۔ اس نے پہلے ایک مرتبہ پٹری بدلی پھر دوسری مرتبہ۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سیٹی بجانےوالی رسی کئی مرتبہ کھینچی۔ پہئے بدلتی ہوئی پٹریوں پر کھٹ کھٹ کر رہے تھے، ایک سبز روشنی گذر گئی، کیبن اندھیرے سے نکلی اور پھر غائب ہو گئی۔ اچانک ڈرائیور اچک کر گاڑی روکنے والے بریک تک پہنچا اور پاگلوں کی طرح عجیب آواز میں چلایا: ''بریک!،، فائرمین نے اپنی پوری طاقت سے بریک کا ہتھا کھینچ لیا بلکہ اس میں لٹک گیا۔

''میرے خدا! ہم نے ایک آدمی مار دیا!..،،

بریک کے جوڑ چرچرائے، پہئے چیخے اور کھلے ہوئے کھٹکے سے بھاپ زور سے نکلنے لگی۔ انجن کے پیچھے سے ایک وحشیانہ چیخ سنائی دی: ''او ، خد...،، اور اچانک رک گئی۔ انجن چند گز آگے جا کر رک گیا۔

ڈرائیور اور فائرمین کود کر نیچے آئے لیکن انھیں کچھ نہیں دکھائی دیا۔ اندھیرے میں ہوا کی وجہ سے برف کی چھری ان کی آنکھوں میں بھری جا رہی تھی۔ فائرمین دوڑ کر لالٹین لایا اور اس کی روشنی میں انھوں نے پٹری کے پاس دو کٹے ہوئے پیر دیکھے، انجن کے پہیوں کے پیچھے ایک آدمی پڑا تھا۔

”کٹ گیا، خدا کی قسم!...“

فائرمین دوڑ کر اسٹیشن گیا اور لوگ وہاں آنے لگے۔ انجن پیچھے ہٹایا گیا۔ کسی نے پٹری پر پڑے ہوئے آدمی کو جھک کر دیکھا۔

”مر گیا!...“

خاموش کھڑے ہو کر انھوں نے اپنی ٹوپیاں اتاریں اور اپنے اوپر صلیب کا نشان بنایا۔

ایوان پٹریوں کے بیچ میں بےحس و حرکت پڑا تھا۔ اس کا سر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا، آنکھیں نکل پڑی تھیں۔ لالٹین کے حلقے نے جو اس کی دائیں کلائی میں لٹکا ہوا تھا اس کی کھال کو شانے تک اس طرح ادھیڑ دیا تھا کہ کھال الٹی ہوئی خون آلود آستین معلوم ہونے لگی تھی۔ شانے کے پاس سے ہاتھ بھی مڑ کر سر کے نیچے پہنچ گیا تھا اور بائیں طرف کی پسلیاں سینے میں گھس گئی تھیں۔

لوگ جائے حادثہ پر جمع ہو گئے اور آہستہ آہستہ دبے دبے لہجے میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ وہ پوچھ رہے تھے کہ حادثہ کیسے ہوا، کیا متوفی شراب کے نشے میں تھا، جب انجن اس کے قریب آ گیا اس نے غل مچایا تھا؟ لیکن کوئی اطمینان بخش جواب نہ دے سکا۔

”میں ذرا باہر دیکھنے لگا“، انجن ڈرائیور نے جس کی آواز گھبراہٹ سے بدل گئی تھی مجمع کو بتایا جو اس کے چاروں طرف جمع ہو گیا تھا۔ ”میں نے پٹری پر روشنی دیکھی اور سوچا کہ انجن فوراً روک دوں۔ میں بس مڑنے ہی والا تھا کہ میں نے اس کو انجن کی بڑی روشنی کے بالکل نیچے دیکھا... میرے خدا! میں اچھل کر آگے بڑھا کہ... اور وہ اس طرح چیخا... میری آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ میں جانتا تھا کہ انجن کے نیچے آدمی آ گیا ہے لیکن میں بےبس تھا...“

”انجن ڈرائیور کی آواز بھرا گئی۔

ہوا کے ایک پرشور جھونکے نے مردہ آدمی اور اس کے چاروں طرف جمع لوگوں کے اوپر سفید پاؤڈر چھڑک دیا۔ مجمع خاموش کھڑا تھا۔ انجن کے اندر بھری ہوئی بھاپ بڑی منحوس آواز میں

غرا رہی تھی۔ ڈرائیور اچک کر پائدان پر پہنچ گیا اور ایک ہتھا گھما دیا، انجن کے نیچے کہیں سے بھاپ بڑے زور سے نکلنے لگی اور اس نے سب کو گرم و نم بادل میں لپیٹ لیا۔

''وہ اس طرح چل رہا تھا جیسے اس کی عقل ماری گئی ہو۔ شاید وہ پوائنٹس کی طرف جا رہا تھا۔ وہیں تو انجن اس پر چل گیا۔''

''اس کا بگل تو بالکل چکناچور ہو گیا ہے۔ غالباً وہ ریل کی روشنی کے ہنڈے میں پھنس کر گھسٹتا چلا گیا ورنہ کٹ کر اس کے دو ٹکڑے ہو جاتے۔''

ایک منٹ کیلئے پھر خاموشی چھا گئی۔ پھر پرشور ہوا کا جھونکا آیا اور بہت سی برف چھڑکتا چلا گیا۔

''کیا اسٹیشن ماسٹر کو بلانے کوئی گیا ہے؟''

''کوئی ابھی گیا ہے۔''

''اس کی بیوی کے لئے یہ بڑی اندوہناک رات ہوگی۔ اس نے آٹھ بچے چھوڑے ہیں۔''

اسٹیشن کی طرف سے روشنیاں اور لوگوں کے سیاہ سائے آتے ہوئے دکھائی دئے۔ اسٹیشن ماسٹر آیا۔ مجمع نے اس کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔ اس نے کلرک سے لالٹین لے کر لاش دیکھی۔ ذرا دیر کے لئے لالٹین کی روشنی لوگوں کے غمگین ستے ہوئے چہروں، پٹریوں اور ان کے تختوں پر جھلملائی اور پھر سردے کے کرب سے بگڑے ہوئے چہرے اور اس کی نکلی ہوئی آنکھوں کی سفیدی پر جم گئی۔ اسٹیشن ماسٹر مڑا اور اس نے لوگوں کو حکم دیا کہ لاش ایک خالی ڈبے میں رکھی جائے۔

ایک چٹائی آئی، اس پر لاش رکھی گئی جو اکڑنے لگی تھی۔ اکھڑا ہوا ہاتھ نیچے گر کر بےسہارا لٹکنے لگا۔

''اور... لاش کے باقی ٹکڑوں کا کیا ہوگا...'' لاش اٹھانے والوں میں سے ایک نے کہا جیسے وہ ابھی تک کوئی بات چھپائے ہوئے تھا۔

''ادھر'' فائرمین نے اندھیرے کی طرف اشارہ کیا۔

کوئی لالٹین لے کر چند قدم پٹری پر چلا، دوسروں نے دیکھا کہ وہ جھک کر کچھ اٹھا رہا ہے۔ وہ واپس آیا اور اس نے بڑی احتیاط سے کٹے ہوئے پیر چٹائی پر رکھ دئے۔

لاش لے جا کر ایک خالی ڈبے میں رکھ دی گئی جو ایک پہلو کی پٹری پر اکیلا کھڑا تھا۔

موقع واردات پر ایک رپورٹ تیار کی گئی جس میں لکھا تھا:
''نومبر کی فلاں تاریخ فلاں اسٹیشن پر پوائنٹ‌مین ایوان گیراسیموف پیلیپاسوف، ساکن موضع اولینو، ضلع دیمیانوفسکایا، صوبہ اوریل، اپنے فرائض انجام دیتے ہوئے ذاتی لاپروائی سے انجن نمبر ۵ سے کچل کر مارا گیا۔''

(۶)

صبح کے دس بجے تھے۔ مسافر پلیٹ‌فارم پر ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ ٹرین آنےوالی تھی۔ تار کے ذریعہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اگلے اسٹیشن سے چل چکی ہے۔ مسافر خانوں سے اپنے اپنے بیگ اور پاندے لےکر مسافر پلیٹ‌فارم کے کنارے کھڑے ہو گئے تھے اور بار بار اس طرف دیکھ رہے تھے جدھر سے ٹرین آنےوالی تھی۔ پولیس والے اپنی مہمیزیں کھڑکا کر چاروں طرف چوکنا اور مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ سامان لےجانےوالی ہاتھ گاڑی ڈاسر پر زور سے کھڑکھڑا رہی تھی جس سے لوگ ایک طرف ہٹ جاتے تھے۔ ریل کے پہیوں کی دیکھ بھال کرنےوالا اپنا لمبا ہتھوڑا اور تیل کی کپی لئے ہوئے جلدی جلدی آیا۔ سردی کے باوجود وہ صرف نیلا بلا پیٹی کا کرتا پہنے تھا۔ اتنے میں اسٹیشن ماسٹر باہر نکلا۔ وہ تگڑا آدمی تھا، وردی کی لال ٹوپی سر پر اور آنکھوں پر سونے کی کمانیوں والی عینک تھی۔ اس کا سر حاکمانہ شان سے ذرا اوپر اٹھا ہوا تھا۔

اسی وقت ایک عورت بھیڑ میں گھستی چلی آ رہی تھی۔ وہ دائیں بائیں دیکھتی جا رہی تھی۔ غالباً کسی کو ڈھونڈھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ اور آنکھیں لال تھیں، چھدری اور اداس پلکوں سے، جو سوجے اور ذرا پھٹے پھٹے پپوٹوں سے نکلی ہوئی تھیں، آنسو ٹپک رہے تھے۔ وہ اپنے آنسوؤں پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی، بار بار اپنی آنکھیں پونچھتی اور رومال کے کونے سے ناک صاف کرتی۔ لیکن جیسے ہی اس نے اسٹیشن ماسٹر کو دیکھا اس کی آنکھوں سے آنسو زوروں سے جاری ہو گئے۔ وہ اس کے پاس گئی، اپنے ہاتھ میں رومال کا کونہ مضبوط پکڑ کر کانپتے ہوئے ہونٹ دبا لئے اور کچھ کہنا چاہا لیکن ضبط نہ کر سکی اور اچانک اس طرح چیخ پڑی

کہ پورے اسٹیشن پر اس کی آواز گونج گئی اور ہر شخص یکدم اس کی طرف مڑ کر دیکھنے لگا۔ اسٹیشن ماسٹر نے ناراضگی کے انداز میں آنکھ ماری اور اس کی پیشانی پر ہلکی سی شکن آ گئی۔

"کیا بات ہے؟ تم کیا چاہتی ہو، ماں جی؟"

"ف... ف... حضور... ما... مار... ڈا... لا... ا... س... کو... ما... مارڈالا..."

لوگ چاروں طرف جمع ہو گئے اور اپنی گردنیں بڑھا بڑھا کر اسٹیشن ماسٹر اور روتی ہوئی عورت کو دیکھنے لگے۔

"کیوں رو رہی ہے؟" انھوں نے ایک دوسرے سے پوچھا۔

"لوگ کہتے ہیں کہ یہاں کل کوئی آدمی کچل کر مر گیا۔"

"پاک باز" پبلک ایک طرف ہٹ گئی اور دور سے تماشہ دیکھنے لگی۔

"آخر معاملہ کیا ہے؟"

"یہ اس پوائنٹ مین کی بیوی ہے جو کل مرا ہے" ایک قلی نے کہا جس کے سینے پر ایک پیتل کا بلا لگا تھا۔

"ہاں، ماں جی، تو تم کیا چاہتی ہو؟"

"ہائے میرا ایوان... اب ہم کہاں جائیں؟... ہمیں کیا معلوم تھا... لوگوں نے آکر بتایا کہ تمہارا آدمی کچل گیا... کل وہ کام پر سے بھاگ کر آیا... اور اس نے کہا کہ میں کام ختم کر کے جلد ہی گھ... گھر آ... آؤنگا..."

عورت زیادہ ضبط نہ کر سکی۔ وہ یہ بتاتے ہی کہ اس کے شوہر نے کس طرح گھر آنے کو کہا تھا بے تحاشا سسکیاں لینے لگی۔ وہ اپنے دبلے پتلے سینے کو زوروں سے دبائے تھی۔

"میرے ساتھ آؤ" اسٹیشن ماسٹر نے حکم دیا اور آگے اسٹیشن کی طرف چل دیا تاکہ اس کو مجمع سے الگ لے جا سکے۔

وہ بری طرح سسکیاں لیتی ہوئی ایک طرف سر جھکائے اس کے پیچھے چل پڑی۔

"ہاں تو تمھیں مدد کی ضرورت ہے، ہے نا؟"

"میں اپنے یتیموں کو لے کر کدھر جاؤں، حضور... ہمارے پاس تو کچھ کھانے کو بھی نہیں ہے... کیا حضور مجھکو ریلوے کی طرف سے کوئی مدد نہیں دلا سکتے؟"

اسٹیشن ماسٹر نے اپنے جیب سے بٹوہ نکالکر عورت کو تین روبل دئے۔

''یہ میں دے رہا ہوں، سمجھتی ہو، میں ذاتی طور پر دے رہا ہوں۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی اور تمھیں دیتا۔ ریلوے کی طرف سے تمھیں کچھ نہیں ملیگا، ایسے حادثات میں ریلوے ذمےدار نہیں ہوتی۔ تمہارا شوہر اپنی لاپروائی سے مارا گیا۔ وہ لاپروا تھا، سمجھتی ہو نا؟ ایسے معاملات میں ریلوے ذمے دار نہیں ہوتی۔''

''ہم کیا کریں؟ لوگ کہتے ہیں کہ پنشن مل سکتی ہے، اگر نہ ملی تو میں اور میرے بچے بھوکوں مر جائینگے... یسوع مسیح کا واسطہ ہم کو اس طرح نہ چھوڑیئے...'' اور عورت اتنی جھک گئی کہ اس کے ہاتھ زمین سے لگ گئے۔

''لیکن میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ ایسے معاملوں میں ریلوے ذمےدار نہیں ہوتی۔ سنو'' اسٹیشن ماسٹر ایک کنڈکٹر کی طرف مخاطب ہو گیا جو ابھی آیا تھا۔ ''اس کو سمجھا دو کہ ریلوے کے منتظمین اس کو کچھ نہیں دینگے۔ ہاں۔ وہ اپنا معاملہ عدالت میں لے جا سکتی ہے لیکن اس سے بھی کوئی نتیجہ نہ ہوگا۔ فضول وقت اور پیسہ رائگاں جائیگا۔''

اسٹیشن ماسٹر چل دیا۔ عورت چپکی کھڑی تھی۔ وہ گھٹی ہوئی سسکیاں لےکر کانپ رہی تھی اور برابر اپنی آنکھیں اور بھیگا ہوا، لال چہرہ رومال سے پونچھ رہی تھی۔

''اچھا دیکھو، الکسئی‌ونا، بات یہ ہے۔ اسٹیشن ماسٹر صاحب کہتے ہیں کہ کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ ان باتوں کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ انھوں نے اپنے امکان بھر تمہاری مدد کی۔ وہ بہت دیالو ہیں۔ لیکن ریلوے ذمے دار نہیں ہے۔ اگر ریلوے کا قصور ہوتا تو عدالت سے فریاد کی جا سکتی تھی لیکن اس معاملہ میں کوئی فائدہ نہیں۔ اچھا تو جاؤ، الکسئی‌ونا، اب گاڑی آ رہی ہے۔''

وہ آہستہ آہستہ چلی۔ پلیٹ‌فارم پر کھڑے لوگوں نے اس کو ریل کی پٹری پر جاتے دیکھا اور ایک پولیس والا چلایا: ''پٹری سے ہٹو، بھاگو، گاڑی آنےوالی ہے۔'' اور وہ پشتے سے ہٹ گئی۔ تھوڑی دیر تک اس کا لال رومال اسٹیشن کے باغ کے ننگے درختوں کے درمیان دکھائی دیتا رہا اور پھر وہ درختوں کے پار غائب ہو گیا۔

۱۸۹۱ء

دو موتیں

ایک بھوری آنکھوں والی لڑکی شال سے سر ڈھکے ماسکو سوویت کے صدر دفتر آئی۔
اکتوبر کا زمانہ تھا اور آسمان پر گھنے بادل تھے۔ کیڈٹ بھیگی چھتوں پر رینگ رینگ کر چمنیوں کے درمیان سے ان لاپروا لوگوں کو گولی کا نشانہ بنا رہے تھے جو سوویت چوک پار کرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔
''میں انقلاب کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتی،، اس لڑکی نے کہا۔ ''میں کیڈٹوں کے متعلق آپ کو اطلاعات بہم پہنچاؤنگی۔ میں نرس کا کام نہیں جانتی اور آپ کے پاس نرسیں ہیں بھی کافی۔ میں لڑ بھی نہیں سکتی کیونکہ میں نے کبھی اسلحہ نہیں استعمال کئے ہیں۔ لیکن اگر آپ مجھے پاس دیدیں تو میں آپ کے لئے اطلاعات فراہم کرونگی۔،،
کامریڈ نے، جو ایک چکتی چمڑے کی جیکٹ پہنے تھا اور ایک ماؤزر ریوالور پیٹی میں لگائے تھا، اس کو غور سے دیکھا۔ کامریڈ کی آنکھیں شب بیداری اور دق کی بیماری کی وجہ سے دھنس گئی تھیں۔
''اگر تم نے ہم کو دھوکا دیا تو ہم گولی مار دینگے،، اس نے کہا۔ ''تم حالات کو سمجھتی ہو نا؟ اگر انھوں نے تم کو پکڑ لیا تو وہ تمہارے گولی مار دینگے اور اگر تم نے ہم کو دھوکا دیا تو ہم تمہارے گولی مار دینگے!،،

''میں جانتی ہوں۔ ''
''تم نے ہر بات سوچ لی ہے؟''
اس نے اپنے سر پر شال ٹھیک کی۔
''مجھے ایک پاس اور کچھ ایسے کاغذات دے دیجئے جس سے یہ پتہ چلے کہ میں کسی افسر کی لڑکی ہوں۔
اس سے دوسرے کمرے میں جانے کے لئے کہا گیا اور دروازے پر ایک سنتری تعینات کر دیا گیا۔
باھر چوک میں دونوں طرف سے گولیاں چلیں۔ کیڈٹوں کی ایک بکتربند موٹر تیزی سے آئی اور گولیاں برسا کر واپس چلی گئی۔
''خدا جانے! ہم نے اس سے سب اته پتہ تو پوچھ لیا ہے لیکن اس سے کیا ہوتا ہے'' سوکھے سہمے چہرےوالے کامریڈ نے کہا۔
''ممکن ہے کہ وہ ہمیں دھوکہ دے۔ اچھا اسے پاس دے ہی دو۔ وہ ہمارے متعلق زیادہ نہیں بتا سکیگی۔ اگر ہم نے اسے کوئی چال چلتے ہوئے پکڑ لیا تو مزا چکھائینگے۔ ''
اس کو کاغذات دے دئے گئے اور وہ الیکساندروف فوجی اسکول روانہ ہو گئی جو اربات اسٹریٹ پر تھا۔ اس نے سڑک کی موڑوں پر اپنا پاس سرخ فوج کے سنتریوں کو دکھا دیا۔
جب وہ زناسینکا اسٹریٹ پہنچی تو اس نے اپنا سرخ پاس چھپا لیا۔ اس کو کیڈٹوں نے گھیر لیا اور اسکول میں اردلی افسر کے پاس لے گئے۔
''میں نرس کی حیثیت سے کام کرنا چاھتی ہوں۔ جب ممسونوف پیچھے ہٹ رہا تھا اس وقت میرا باپ جرمنی کی جنگ میں مارا گیا تھا۔ دریائے دون پر کزاک دستوں میں میرے دو بھائی ہیں۔ میں یہاں اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ رہتی ہوں۔ ''
''بہت اچھا، خوب۔ ہمیں بہت خوشی ہے۔ عظیم روس کے لئے جو سخت جدوجہد ہم کر رہے ہیں اس میں پرخلوص محبان وطن کی مدد سے ہمیں بڑی مسرت ہوتی ہے اور تم تو ایک افسر کی بیٹی ہو۔ اس طرف آؤ۔ ''
انھوں نے اس کو لے جا کر ملاقاتی کمرے میں بٹھایا اور اس کے لئے چائے لائے۔
اردلی افسر نے اپنے ماتحت سے کہا:

''استیپانوف، مزدور کے کپڑے پہن کر پوکروفکا جاؤ - یہ رہا پتہ - جو لڑکی یہاں بیٹھی ہے اس کے متعلق تمام تفصیلات معلوم کرکے لاؤ - ''

استیپانوف نے اوورکوٹ پہنا جس کے سینے پر ایک خون آلود سوراخ تھا کیونکہ وہ ایک ایسے مزدور کے جسم سے اتارا گیا تھا جس کو گولی مار دی گئی تھی - اس نے اس مزدور کی پتلون، پھٹے جوتے اور ٹوپی پہنی اور جھٹ پٹے میں پوکروفکا روانہ ہو گیا -

ایک جھبرے، لال سروالے آدمی نے جو عجیب وغریب انداز میں اپنی آنکھیں گھماتا تھا اس کو لڑکی کے متعلق بتایا :

''ہاں، کوئی عورت نمبر ۲ میں رہتی تو ہے - ایک چھوٹی لڑکی کے ساتھ - شاید کوئی بورژوا ہے - ''

''اب وہ کہاں ہے؟''

''وہ صبح سے گھر نہیں آئی ہے - غالباً گرفتار ہوگئی - کپتان کی بیٹی ہے - کسی کام کی نہیں - آخر تمھیں اس سے کیا کام ہے؟''

''اس کی ملازمہ ہمارے گاؤں کی ہے - میں اس سے ملنا چاھتا تھا - بس — سلام - ''

رات کو جب کیڈٹ اپنی ڈیوٹی سے واپس آئے تو لڑکی پر انھوں نے خاص طور سے نظر عنایت کی - وہ اس کے لئے کیک اور مٹھائیاں لائے - ان میں سے ایک زور زور سے پیانو بجانے لگا، دوسرے نے اپنے گھٹنوں کے بل جھک کر ھنستے ہوئے اسے ایک گلدستہ پیش کیا -

''ہم جلد ھی ان بدمعاشوں کا صفایا کر دینگے - ہم ان کو اچھا خاصا سبق دے چکے ھیں - کل رات ہم اسمولینسکی بازار سے حملہ کرینگے پھر دیکھنا کیا آتشبازی چھٹتی ہے - ''

دوسرے دن صبح کے وقت کیڈٹ اس کو زخمیوں کی مرھم پٹی کرنے اسپتال لے گئے -

جب وہ ایک سفید دیوار کے پاس سے گذر رہے تھے تو اس نے کوئی چیز دیکھی - گلابی سوتی قمیص میں ایک مزدور کی لاش دیوار کے پاس پڑی تھی، اس کا سر پیچھے کی طرف ڈھلکا ہوا تھا، بوٹ جوتے کیچڑ میں لت پت تھے، ان کے تلے گھس گئے تھے - اس کی بائیں آنکھ کے اوپر ایک سیاہ سوراخ تھا -

"جاسوس!" کیڈٹ نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "ہم نے اس کو پکڑا تھا۔"

تمام دن لڑکی نے اسپتال میں بڑی ہمدردی، نرمی اور سہارت سے کام کیا۔ زخمی اس کی لمبی پلکوں والی بھوری آنکھوں کی طرف بڑی شکر گذار نگاھوں سے دیکھنے لگے۔

"سسٹر، شکریہ۔"

دوسری رات اس نے گھر جانے کی اجازت مانگی۔

"تم کہاں جاؤگی؟ کیا تمھیں نہیں معلوم کہ جانا بہت خطرناک ہے؟ کونے کونے پر پہرہ چوکی ہے۔ تم نے ہمارے علاقے سے قدم نکالا کہ وہ بدمعاش تم کو پکڑ لینگے اور کچھ پوچھے گچھے بغیر گولی مار دینگے۔"

"میں انھیں اپنے کاغذات دکھا دونگی۔ میں پرامن شہری ہوں۔ میں گھر سے باھر نہیں رہ سکتی۔ میری بہن چھوٹی ہے۔ خدا جانے اس کو کیا ھوا ھو۔ میں بہت پریشان ھوں۔"

ھاں، چھوٹی بہن۔ یہ سچ ہے۔ اچھا میں تم کو نگرانی کے لئے دو کیڈٹ دونگا۔"

"نہیں، نہیں، نہیں..." اس نے خوف‌زدہ لہجے میں ھاتھ بڑھا کر کہا "میں تنہا جاؤنگی... تنہا... میں نہیں ڈرتی۔"

اس نے لڑکی کو گھورا۔

"ا... اچھا... بہت اچھا... جاؤ۔"

"گلابی قمیص، اور آنکھ کے اوپر ایک سیاہ سوراخ... سر پیچھے ڈھلکا ھوا..." اس کے ذھن میں یہ نقشہ پھر گیا۔

لڑکی پھاٹک سے نکلنے کے بعد فوراً ھی تاریکی کے سمندر میں ڈوب گئی۔ کچھ دکھائی یا سنائی نہیں دے رہا تھا۔

اسکول سے ترچھی چل کر اس نے اربات چوک پار کیا اور اربات پھاٹک کی طرف چلی۔ تاریکی کا ایک چھوٹا سا حلقہ اس کے ساتھ چل رہا تھا جسمیں وہ اپنا سایہ دیکھ رہی تھی۔ اسکے سوا اور کچھ نہ تھا — وہ اس دنیا میں یکہ و تنہا تھی۔

کوئی خوف نہ تھا۔ صرف اندرونی تناؤ تھا۔

بچپن میں وہ کبھی کبھی اپنے باپ کے کمرے میں پہنچ جاتی جب وہ موجود نہ ھوتے، وھاں مسہری کے اوپر دیواری قالین کے

سہارے لٹکا ہوا گیتار اتار لیتی اور پیر موڑ کر بیٹھ جاتی، پھر تار چھیڑ دیتی۔ وہ کھونٹی کو گھما کر تار کو کستی جاتی، تار سے سر اور بھی باریک اور غمگین نکلنے لگتا یہاں تک کہ وہ ناقابل برداشت ہو جاتا۔ بہت ہی باریک تن۔ تن۔ تن دل میں اتر جانےوالی تشنجی کیفیت۔ پھر تار حد سے زیادہ تناؤ کی وجہ سے ٹوٹنے ہی والا تھا۔ اس کی ریڑھ میں ایک جھرجھری سی دوڑ جاتی اور اس کی پیشانی پر پسینے کی چھوٹی چھوٹی بوندیں جھلکنے لگتیں... ان تمام باتوں سے اس کو ایسی لطیف مسرت حاصل ہوتی جس کا کسی اور چیز سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

وہ اندھیرے میں چلتے ہوئے اپنا سیاہ سایہ مشکل سے دیکھ رہی تھی۔ وہ کوئی خوف محسوس نہیں کرتی، بس اس کے دل میں تن تن تن والا سر باریک سے باریک‌تر ہوتا جاتا تھا۔

اچانک اس نے اپنا ہاتھ پھیلایا — ایک عمارت کی دیوار تھی۔ اس کا پورا جسم دہشت سے کانپ گیا، وہ بےجان اور کمزور محسوس کرنے لگی اور بچپن کی طرح پسینے کی چھوٹی چھوٹی بوندیں نکلنے لگیں۔ یہاں تو سڑک کے کنارےوالے باغ کے سیخچے ہونے چاہئیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ راستہ بھول گئی تھی۔ خیر کوئی بات نہیں۔ ابھی ٹھیک سمت معلوم ہوئی جاتی ہے۔ اس کو اپنے اندر جھرجھری محسوس ہو رہی تھی جس سے اس کے دانت بجنے لگے تھے۔ کسی نے اس سے جھک کر کہا:

”یہ تو خاتمے کی ابتدا ہے... سمجھتی ہو نا؟ تمہارا خیال ہے کہ تم راستہ بھول گئی ہو لیکن یہ ابتدا...“

اس نے اپنی یاد پر انتہائی زور دیا۔ زناسینکا اسٹریٹ داھنی طرف، سایہ‌دار سڑک بائیں طرف... غالباً وہ ان دونوں کے درمیان کہیں تھی۔ اس نے ہاتھ پھیلایا، ایک کھمبے پر اس کا ہاتھ پڑا، تار کا کھمبا؟ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، اس نے جھک کر زمین ٹٹولی، اس کی انگلیوں میں ٹھنڈا، بھیگا لوہا لگا... سڑک کے باغ کی سلاخیں۔ اس کے دل کا بوجھ فوراً اتر گیا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی... ایک جھرجھری لی۔ اس کے چاروں طرف ہر چیز متحرک تھی۔ دھندلی غیر واضح کبھی غائب ہو جاتی اور کبھی پھر دکھائی دیتی۔ ہر چیز حرکت کر رہی تھی۔ عمارتیں،

دیواریں اور درخت سب - ٹرام کے کھمبے، ٹرام کی لائن - سب خونی تاریکی میں لال خون جیسے گھوم رہے تھے - پھیکی پھیکی سی سرخ تاریکی بھی متحرک تھی - نیچے بادل بھی لال خون جیسے رنگ سے چمک رہے تھے -

وہ اس طرف روانہ ہو گئی جدھر سے یہ خاموش، تیرتی ہوئی چمک آ رہی تھی - وہ نکیتسکئے پھاٹک کی طرف چلی - یہ عجیب بات تھی کہ ابھی تک کسی نے اس کو روکا ٹوکا نہ تھا - وہ جانتی تھی کہ پھاٹکوں اور دروازوں کی تاریکی اور کونوں میں سنتری چھپے بیٹھے ہیں جو اس پر برابر نگاہ جمائے ہیں - وہ اچھی طرح دکھائی دے رہی تھی، سرخ روشنی سے منور راستے پر بیچوں بیچ چلی جا رہی تھی -

وہ خاموش چلی جا رہی تھی - اس کے ایک ہاتھ میں سفید فوج کا پاس تھا اور دوسرے ہاتھ میں سرخ فوج کا پاس - جو کوئی بھی اس کو ٹوکیگا وہ ضرورت کے مطابق پاس دکھا دیگی - سڑکیں ویران اور اداس تھیں، سرخ اور خاموش چمک کے سوا کچھ بھی نہیں تھا - نکیتسکئے پھاٹک پر زبردست آگ جل رہی تھی - آگ کے تیز شعلے نیچے سرخ بادلوں تک پہنچ رہے تھے اور ان پر سرخ دھوئیں کے مرغولے لہرا رہے تھے - ایک عالیشان عمارت چکاچوند پیدا کرنےوالی روشنی سے جگمگا رہی تھی - اس چکاچوند روشنی میں ہر چیز جنون انگیز رقص میں مبتلا تھی اور بڑے ہولناک انداز میں بادلوں تک لہرا رہی تھی - صرف شہتیر، دیواریں اور سلاخیں سیاہ ڈھانچوں کی طرح خاموش کھڑی تھیں - اور ان سوراخوں میں جہاں پہلے کھڑکیاں تھیں وہیں چکاچوند روشنی تھی -

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی لمبی دم‌والی چڑیا چنگاریاں لے کر بادلوں تک اڑ رہی ہے - کڑکڑاہٹ اور سفید شعلوں کی سرسراہٹ نے اس عمارت کے اطراف کی تمام دوسری آوازوں کو اپنے میں ڈبو دیا تھا -

لڑکی گھومی - شہر میں تاریکی تھی - شہر معہ اپنی لاتعداد عمارتوں، گھنٹہ گھروں، چوکوں، تھیٹروں اور قحبہ خانوں کے تاریکی میں غائب ہو گیا تھا - سخت تاریکی کے سوا کچھ بھی نہ تھا -

پوری فضا خاموش اور بہت ھی پراسرار تھی جیسے کچھ ہونےوالا تھا لیکن کیا یہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا - بہر حال خاموشی سب چیزوں پر حاوی تھی، اس خاموشی میں ایک پرتوقع انتظار تھا - لڑکی پر دھشت طاری ھو گئی -

گرمی ناقابل برداشت تھی، اس نے سڑک ترچھی پار کی اور ایک تاریک موڑ پر پہنچ گئی - وھاں پہنچتے ھی تاریکی سے ایک کبڑی سی شکل برآمد ھوئی - اس کی سنگین پر روشنی جھلملا رھی تھی -

"کہاں جا رھی ھو تم؟ کون ھو؟"

وہ رک گئی اور دیکھنے لگی - وہ بھول گئی تھی کہ کونسا پاس کس ھاتھ میں ھے - تذبذب کا ایک لمحہ گذرا... رائفل کی نال اس کے سینے کے سامنے آ گئی -

کیا بات ھو گئی؟ دراصل اس نے اپنا داھنا ھاتھ نکالنا چاھا تھا لیکن بالکل غیرشعوری طور پر اس نے اپنا بایاں ھاتھ بڑھا کر جھٹکے کے ساتھ اسے کھول دیا -

اس کے ھاتھ میں کیڈٹوں کا دیا ھوا پاس تھا -

سنتری نے اپنی رائفل رکھ دی اور اپنی کھردری، نافرمان انگلیوں سے پاس برابر کرنے لگا - اسے ھلکی سی جھرجھری آگئی جو اس سے پہلے کبھی نہیں آئی تھی - اس کے پیچھے جلتی ھوئی عمارت سے چنگاریوں کی بوچھار ھوئی اور جھلملاتی ھوئی روشنی دکھائی دی... کیڈٹوں کا پاس سپاھی کی سخت ھتھیلی پر الٹا رکھا ھوا تھا...

"ارے، ان پڑھ کہیں کے..." لڑکی نے سوچا -

"یہ لو -"

لڑکی نے منحوس کاغذ کا ٹکڑا اپنی ھتھیلی میں توڑ موڑ ڈالا -

"تم کہاں جا رھی ھو؟" سپاھی نے زور سے پوچھا -

"ھیڈکوارٹر کو... سوویت کو..."

"گلیوں میں ھو کر جانا نہیں تو وہ تمھیں مار ڈالینگے -"

ھیڈکوارٹر میں اس کی طرف خاص توجہ کی گئی - کیونکہ جو خبر وہ لائی تھی ان کے لئے بہت قیمتی تھی - سب اس سے دوستانہ انداز میں باتیں کر رھے تھے اور سوالات پوچھ رھے تھے - چمڑے کی جیکٹ اور مدقوق چہرےوالا آدمی اس سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رھا تھا -

''واہ کیا کارنامہ کیا ہے تم نے ننھی لڑکی۔ لیکن ذرا سنبھل کر قدم رکھنا۔ ،،

شام کو جب گولی چلنا کم ہو گئی تو وہ پھر اربات اسٹریٹ کی طرف واپس چلی۔ قریب کے اضلاع سے اور زیادہ زخمی اسپتال آ رہے تھے۔ کیڈٹوں نے جو حملہ اسمولینسکی بازار سے کیا تھا وہ پسپا کر دیا گیا جس سے ان کو سخت نقصان پہنچا تھا۔

تمام رات لڑکی جس کے چہرے سے تھکن کے آثار نمایاں تھے زخمیوں کو پانی پلاتی اور ان کی سرہم پٹی کرتی رہی اور زخمی بھی اپنی نگاہوں سے اس کا شکریہ ادا کرتے رہے۔ صبح سویرے ایک کیڈٹ ننگے سر، مزدور کے لباس میں دوڑتا ہوا اسپتال آیا۔ وہ پریشان تھا، اس کا چہرہ بگڑا ہوا تھا۔

وہ دوڑ کر سیدھا لڑکی کے پاس پہنچا۔

''یہ... یہ کتیا... اس نے ہم کو دھوکہ دیا...،،

وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گئی، اس کا چہرہ دھلی چادر کی طرح سفید ہو گیا، پھر اس کے چہرے پر موت کی سفیدی کھیلنے لگی اور اس نے چلا کر کہا:

''تم... تم مزدوروں کو مار رہے ہو۔ وہ اپنی خراب حالی ختم کرنے کے لئے لڑ رہے ہیں... میں نے... میں اسلحہ استعمال کرنا نہیں جانتی لیکن میں نے تم کو مار دیا...،،

اس کو سفید دیوار کے پاس لےجایا گیا۔ وہ اسی جگہ گر گئی جہاں پہلے سوتی قمیص‌والا مزدور پڑا تھا۔ دو گولیاں اس کے دل کے پار ہو گئی تھیں۔ اور جب تک انھوں نے اس کی لاش نہیں اٹھائی، اس کی بھوری لمبی پلکوں والی آنکھیں اداس ڈراؤنے اکتوبر کے آسمان کو برابر تکتی رہیں۔

۱۹۲۶ء